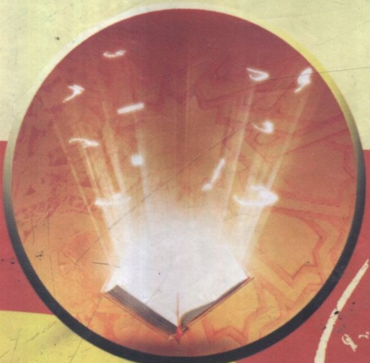
رسولِ اکرم ﷺ اور تعلیم

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی



ترجمہ: ارشاد الرحمٰن

دار التذکیر

رسولِ اکرم ﷺ اور تعلیم

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ترجمہ

ارشاد الرحمٰن

www.KitaboSunnat.com

دارالتذکیر

○ اہتمام: محمد احسن تہامی
○ مطبع: گنج شکر پرنٹرز
○ تاریخ اشاعت: 2009
○ قیمت: روپے

دارالتذکیر
رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار
لاہور۔54000 فون: 7231119
E-mail : info@dar-ut-tazkeer.com
Website : dar-ut-tazkeer.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رسول اکرم ﷺ اور تعلیم

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ـــــ ترجمہ: ارشاد الرحمن

فہرست

---OO---

گزارشاتِ مترجم

''رسول اکرم ﷺ اور تعلیم'' اسلامی دنیا کے مشہور و معروف عالم، فقیہہ، محقق، مصنف اور اُستاد علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی کتاب الرسول و العلم کا ترجمہ ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی اسلامی دنیا میں اپنے علمی مقام و مرتبے، فقہی فہم و فراست اور اُصول و منہج کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اخوان المسلمون مصر کے روشن ضمیر اور عالی دماغ اِس سپوت نے سیکڑوں موضوعات پر دادِ تحقیق دی ہے۔ اُن کی ملّی خدمات کے ساتھ ساتھ علمی کارناموں کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ اُمتِ مسلمہ پر اُن کے معلمانہ و مربیانہ احسانات کا دائرہ مسجد اور یونیورسٹی تک ہی محدود نہیں ہے۔ اُن کا جسمانی وجود دوحہ، قطر میں ہوتا ہے مگر روحانی طور پر وہ دنیائے اسلام کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے ہر خطے اور ہر قوم کے مسائل و مشکلات کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ یقیناً اہلِ علم کی شان اور مقام یہی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''رسول اکرم ﷺ اور تعلیم'' میں علامہ قرضاوی نے اپنی علمی شان، محدثانہ مقام اور محققانہ اُسلوب کے رنگ میں اس موضوع کے وسیع ''دریا'' کو صرف پانچ ابواب کے ''کوزے'' میں بند کر دیا ہے۔ مَیں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو مَیں نے محسوس کیا کہ یہ کتاب طلبائے علم کے علاوہ ہر اُس شخص کی ضرورت ہے جس کا تعلق کسی بھی طرح ''علم'' کے ساتھ ہو۔ یہ قرآن کے حافظ، معلّم، مدرّس اور عالم کی ضرورت ہے ـــــ اور مسجد کے خطیب، مدرسے کے مدرس، سکول کے اُستاد اور کالج و یونیورسٹی کے پروفیسر کی بھی۔ یہ اسلامی علوم میں کمال حاصل کرنے والوں کے لیے بھی رہنما ہے اور سائنسی و عصری تحقیقات کے خوگروں کے لیے بھی لائق توجہ ہے۔ یہ علمی تاریخ بھی ہے اور عصری تحقیق بھی۔ اس سے فکر و نظر کے دریچے یوں وا ہوتے ہیں کہ سنتِ رسول ﷺ کا ہر دور میں رہنما و مقتدا ہونا روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث، سیرت، سنت اور بلند پایہ مسلمان علمی شخصیات کی آرا کو ہی بطور دلیل وحوالہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ موضوع ''رسول اکرم ﷺ اور تعلیم'' تھا اس لیے قرآنی آیات سے استشہاد نہیں کیا گیا۔ کتاب کے مشتملات کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ جو شخص بھی اس کتاب کا مطالعہ کرے گا وہ اپنے آپ کو ایک نئی علمی فضا اور نئے تحقیقی جہان میں کھڑا محسوس کرے گا۔

کتاب کے ترجمے میں مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، شام کا مطبوعہ نسخہ [۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء طباعت اوّل] پیشِ نظر رہا۔ غالباً ۹۸، ۱۹۹۷ء میں اس ترجمے کا آغاز کیا گیا تو چند مہینوں میں کام تکمیل کے قریب پہنچ گیا۔ کچھ صفحات کا ترجمہ باقی تھا کہ کام میں ایسا تعطل آیا کہ دوبارہ ۲۰۰۵ء میں اس کو ہاتھ لگانے میں کامیابی ہوئی۔ البتہ یہ اَمر باعثِ اطمینان ہے کہ یہ دورانیہ رائگاں نہیں گیا۔ اس عرصے میں عبدالرحمٰن رافت پاشا کی عربی کتاب صُوَرٌ مِنْ حَيَاةِ التَّابِعِيْن [تذکرہ تابعینؒ]، حیاتِ صحابہ پر خالد محمد خالد کی رِجَالٌ حَوْلَ الرَّسُول [نقوشِ صحابہؓ] اور امام یحییٰ بن شرف نوویؒ کی مرتبہ چالیس احادیث کے مجموعے اَرْبَعِيْن کی شرح [جو امام نوویؒ کی طرف منسوب ہے] کے تراجم کی سعادت نصیب ہوئی۔ الحمدللہ یہ تینوں کتب طباعت واشاعت کے مراحل سے گزر کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

مذکورہ کتب مسلسل کئی سال تک ہفت روزہ ایشیا لاہور میں قسط وار شائع ہوتی رہیں۔ زیرِنظر کتاب بھی اسی طرح شائع ہوئی۔ پھر حسبِ سابق اسے کتابی صورت دینے اور شائع کرنے کا مرحلہ بھی دراز ہوگیا۔ آج یہ کتاب اشاعت کے مرحلے سے گزر کر آپ کے ہاتھوں تک پہنچ گئی ہے تو مجھے خوشی کے ساتھ اس سستی پر ندامت کا احساس بھی ہو رہا ہے جو اسے جلد پیش کرنے میں رکاوٹ بنی رہی۔

اللہ تعالیٰ میری اس تمام تر طالب علمانہ کوشش کو پڑھنے والوں کے لیے نفع بخش اور میرے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ اٰمِيْنَ يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ!

۹ رمحرم الحرام ۱۴۳۰ھ — طلب گارِ دعا

۷ رجنوری ۲۰۰۹ء — ارشاد الرحمٰن

مقدمہ

الحمد للّٰہ والصلوٰۃ والسلام علی معلم الناس الخیر
محمد رسول اللّٰہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ ومن اتبع ھداہٗ

انسانیت نے اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین ایسا نہیں دیکھا جس نے علم کو بھرپور اور مکمل اہمیت دی ہو، اس کی طرف بلایا ہو اور اس کے حصول کی ترغیب دلائی ہو، علم کو ایسی عظمت بخشی ہو اور اہل علم کو اس قدر معزز ٹھہرایا ہو، علم کے حصول اور اسے سیکھنے سکھانے پر ابھارا ہو، اس کے آداب بیان کیے ہوں، اور اس کے اثرات کو واضح کیا ہو، اس کے حصول سے پہلو تہی کے نقصانات سے آگاہ کیا ہو اور اہل علم کی بات کو جھٹلانے، اس کی دی ہوئی روشنی سے منہ موڑنے اور اصحاب علم کو درخور اعتنا نہ جاننے کی خرابیوں سے لوگوں کو مطلع کیا ہو۔

جس کسی نے بھی اسلام سے قبل کے ادیان کا مطالعہ کیا، یا ان کی مقدس کتب پڑھیں علم کی اہمیت کے حوالے سے اسلام کی عظمت پر اس کا ایمان بڑھ گیا۔ آپ عہد نامہ جدید کے "اسفار مقدسہ" پڑھ ڈالیں یہ ممکن نہیں کہ "عقل، فکر، نظر، برہان، علم، حکمت" یا ان سے مشتق دوسرے الفاظ یا اس مفہوم کو واضح کرنے والے اور الفاظ آپ کی نظر سے گزریں۔

مگر جب آپ قرآنِ حکیم کا مطالعہ کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ لفظ 'علم' ۸۰ مقامات پر معرفہ اور نکرہ استعمال ہوا ہے، جب کہ اس سے بننے والے الفاظ علم، یعلم، یعلمون، علم، یعلم علیم اور علام وغیرہ تو سیکڑوں بار آئے ہیں۔

قرآن میں لفظ عقل اسم یا مصدر کے طور پر کہیں استعمال نہیں ہوا، البتہ اس کا متبادل لفظ "الالباب" ۱۶ مقامات اور لفظ "النُّھی" بھی عقول کے معنی میں ۲ بار آیا ہے۔ رہی لفظ "عقل" کے مشتقات کے استعمال کی بات تو یہ ۴۹ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح لفظ "فکر" کے

مشتقات ۱۸، لفظ ''فقہ'' کے مشتقات ۲۱، لفظ ''حکمت'' کے مشتقات ۲۰ بار اور لفظ ''برہان'' کسی دوسرے لفظ کی طرف منسوب ہو کر یا بغیر کسی نسبت کے ۷ مقامات پر آیا ہے۔

مندرجہ بالا الفاظ ان الفاظ کے علاوہ ہیں جن کا استعمال علم اور فکر کی جگہ ہوا ہے، جیسے "انظروا" (غور کرو) "ینظروا" (گہری نظر سے دیکھتے ہیں) وغیرہ۔

قرآنِ حکیم کے علاوہ جب آپ حدیث نبویؐ کا مطالعہ کریں گے تو اگرچہ یہ کتب موضوعات اور ابواب کی تقسیم کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہیں لیکن پھر بھی دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق آپ کو علم کے موضوع پر ان کتب میں پوری پوری ''کتاب'' مل جائے گی۔

امام بخاریؒ کی "الجامع الصحیح" کو ہی لیجیے، ہم دیکھیں گے کہ ''بدء الوحی'' اور ''کتاب الایمان'' کے بعد ''کتاب العلم'' ہے، فتح الباری میں حافظ ابن حجر کے قول کے مطابق صحیح بخاری کی یہ کتاب (ابواب کا مجموعہ) ۱۰۲ احادیث پر مشتمل ہے، ان میں ۱۶ حدیثیں مکرر ہیں، جب کہ ان آثار کی تعداد ۲۲ ہے جن کی سند صحابہ یا تابعین پر موقوف ہو جاتی ہے۔

- صحیح مسلم اور دیگر سات امہات کتب (الموطا، سنن ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ) میں ''کتاب العلم'' یا ''باب العلم'' کے عنوان کے تحت علم کا مختصر یا طویل ذکر موجود ہے۔

ہمارے خیال میں یہاں مندرجہ ذیل کتب کا تذکرہ اس اعتبار سے مفید مطلب ہوگا۔ مثلاً:

- امام احمد بن حنبلؒ کی 'مسند' کی ترتیب پر مرتب ہونے والی ''الفتح الربانی'' کی ''کتاب العلم'' میں ۸۱ حدیثیں لائی گئی ہیں۔
- حافظ نور الدین الہیثمی کی ''مجمع الزوائد'' کی ''کتاب العلم'' ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر کئی احادیث ہیں۔
- حاکم نیشاپوری کی ''المستدرک'' میں علم سے متعلق احادیث ۴۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔
- حافظ منذری نے اپنی کتاب ''الترغیب والترہیب'' میں ''کتاب العلم'' کے عنوان کے تحت ۱۴۰ احادیث جمع کی ہیں۔
- علامہ ابن محمد سلیمان کی ''جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد'' کی ''کتاب العلم'' ۱۵۴ احادیث پر مشتمل ہے۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ان تمام کتب میں اس موضوع سے متعلق احادیث کے علاوہ احادیث کی ایک اچھی خاصی تعداد دیگر کتب میں بھی موجود ہے اور اس طرح یہ مکرر بھی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایک کتاب یا دوسری کتاب میں آنے والی احدیث کی یہی کل تعداد ہے جو علم سے متعلق ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دسیوں بیسیوں نہیں سیکڑوں احادیث ہیں جن کا تعلق ''علم'' سے ہے مگر وہ کتاب کے دیگر ابواب کی مناسبت سے وہاں درج کر دی گئی ہیں، اس لیے کہ ایک ہی حدیث بہت سے احکام ومسائل کے لیے بطور دلیل پیش کی جاتی ہے۔

مثلاً وہ حدیث جس سے ہم نے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد مسلمان مردوں کو تحریری اعداد وشمار سے کام لینے کا حکم دیا۔ یہ حدیث بخاری ومسلم دونوں کی صحیحین میں موجود ہے لیکن انھوں نے اسے ''کتاب العلم'' میں ذکر نہیں کیا۔

اسی طرح وہ حدیث جس میں دنیوی زندگی کے حوالے سے تجربہ کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کو جائز ٹھہرایا گیا اور لوگوں کو اپنے دنیوی معاملات کو تجربہ کی روشنی میں حل کرنے کی اجازت دی گئی ہے، یہ حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے اور دیگر کتب احادیث میں بھی لیکن کسی نے بھی اس حدیث کو ''کتاب العلم'' میں درج نہیں کیا۔

اور وہ حدیث جس میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیدیوں کو مسلمان بچوں کو کتابت سکھانے پر رہا کرنے کا اعلان کیا تو امیہ بن خلف آپ سے جھگڑ پڑے۔ یہ حدیث بھی ذکر کرنے والوں نے علم کے ابواب میں ذکر نہیں کی۔

وہ احادیث جو بدعات وخرافات کے خلاف اعلانِ جنگ کرتی ہیں، کتاب العلم میں مذکور نہیں ہیں۔ اور وہ احادیث بھی جو طب اور علاج معالجہ سے متعلق ہیں، کتاب العلم میں مذکور نہیں۔

اس طرح ہم کتب احادیث میں بہت سی احادیث پاتے ہیں جو علم سے متعلق ہیں۔ اس لیے کہ مختلف عنوانات کے تحت مختلف مقامات پر آئی ہیں۔ یہ تو ایک باخبر وصاحب بصیرت سکالر کا کام ہے کہ وہ دور ونزدیک سے ان احادیث کو اٹھائے، جمع کرے اور ایک ایسی تصنیف بنا ڈالے جو اس کی فکر کی وضاحت اور اس کے مقصد کا تعین کرتی ہو۔

زیر نظر بحث ''رسول اللہ ﷺ کا علم کے بارے میں موقف'' میں ہم نے اسی ذمہ داری کو

نبھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم ان مقبول احادیث کو جمع کریں جو مختلف مصادر میں بکھری پڑی ہیں...... خاص طور پر وہ احادیث جو حقیقتاً موضوع سے متعلق ہیں اور ان پر گفتگو علمی انداز میں ہو سکتی تھی...... ہم نے یہ کام 'سنت و سیرت کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے نزدیک علم کا مفہوم' واضح کرنے کے لیے کیا ہے۔ تاکہ یہ مفہوم عام اور جدید انداز میں لوگوں کے سامنے آسکے۔

میں نے ''مقبول احادیث'' کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ موضوع احادیث کی کوئی بنیاد نہیں اور جو بہت زیادہ ضعیف ہیں ان سے تو استدلال کرنا علماء کے نزدیک جائز نہیں۔ خواہ یہ استدلال فضائل اعمال کے ضمن میں ہی کیوں نہ ہو!

جمہور علماء نے ضعیف احادیث سے استفادہ کی اجازت صرف ان دنیوی امور میں ہی دی ہے جن پر شریعت کا حکم عائد نہ ہوتا ہو اور نہ حلال و حرام کا کوئی حکم اخذ کیا جا رہا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن عبدالبر نے جو فقیہ بھی ہیں، اپنی کتاب ''جامع بیان العلم وفضلہ'' میں بہت سی ضعیف احادیث بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ''فضائل سے متعلق احادیث تو ہر کسی سے روایت کی جا سکتی ہیں، جب کہ احکام اور حلال و حرام کے مسائل میں وہی روایات لی جائیں گی جن کی اسناد قابل اعتبار ہوں۔''

اس کے باوجود کہ ضعیف احادیث کی کوئی ضرورت نہیں تھی، پھر بھی صحیح اور حسن احادیث پر ضعیف احادیث غلبہ پا گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ''مقبول احادیث'' میں وہ سب کچھ نہیں تھا جو ضعیف احادیث سے بے نیاز کر دیتا۔

اسی لیے بہت سے لوگوں نے ضعیف احادیث سے استدلال کرتے ہوئے اس بات کا خیال نہیں رکھا، کیوں کہ محدثین نے حدیث سے استدلال کی جو شرط لگائی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ''حدیث بہت زیادہ ضعیف نہ ہو، اسے کسی منصوص کلی اُصول کے طور پر درج نہ کیا جائے اور رسول اللہ ﷺ سے اس کے ثابت ہونے کو یقینی نہ سمجھا جائے بلکہ احتیاط سے ہی کام لیا جائے۔''

اس بنیاد پر ہم چاہتے ہیں کہ جب بھی اسلام یا رسول اللہ ﷺ کا کسی بارے میں موقف واضح کریں تو ضروری ہے کہ ہم صحیح و حسن حدیث پر ہی اعتماد کریں، کیوں کہ ضعیف حدیث سے کوئی موقف واضح نہیں ہو سکتا اور نہ اس کو کسی حکم کی بنیاد ہی بنایا جا سکتا ہے۔

اس لیے اس بحث میں ہمارے اوپر دوہری ذمہ داری عائد ہوگئی، اور وہ اس طرح کہ پہلے ایسی احادیث کی تلاش کرنا جن سے استدلال کیا جاسکے، پھر ان کی تحقیق کرنا اور ان کا مقام متعین کرنا، اس کے بعد ان سے حکم اخذ کرنے یا مطلوب مفہوم لینے کا مرحلہ آتا ہے۔

سب سے پہلے تو کوئی نص پیش کرنا اور اس کی تائید میں دیگر نصوص لانا ضروری ہوتا ہے اس کے بعد اس سے دلیل اخذ کی جاسکتی ہے۔

بعض محققین نے علمی توثیق کے ضمن میں بس یہی کافی سمجھ لیا ہے کہ حدیث کی سند بیان کر دی جائے۔ یا کسی معروف کتاب کے جزء، صفحہ اور طباعت کے حوالے کے ساتھ نص نقل کر دی جائے۔ ان کے نزدیک تحقیق و تدقیق کی یہ آخری منزل ہے، جیسا کہ بہت سے لوگ کتب تفسیر، تصوف، فقہ حتیٰ کہ حدیث کی ان کتابوں سے بھی حوالے نقل کر دیتے ہیں جن کے روایت کرنے والوں نے اس بات کی صحت کا کوئی خیال نہیں رکھا کہ وہ کیا روایت کر رہے ہیں۔ کسی حدیث کو قبول کرنے کے لیے محض یہ کافی نہیں کہ اسے کسی کتاب سے اس صحیح سند کے ساتھ نقل کر دیا جائے جو اس کتاب میں بیان کی گئی ہے۔

تحقیق کا یہ طریقہ تو مؤرخین کے ہاں رائج ہے، ان کے نزدیک مبلغ تحقیق بس یہ ہے کہ وہ جو کچھ نقل کر رہے ہیں اس کی نسبت طبری و ابن کثیر وغیرہ کی طرف ہے۔ حالانکہ ان کتب میں بھی ایسی باتیں درج ہیں جو نہ ساری رد کی جاسکتی ہیں اور نہ ساری قبول کرنے کے لائق ہیں۔ ان میں ناقابل اعتنا باتیں بھی ہیں اور عمدہ کلام بھی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ علم کے موضوع پر گفتگو کرنے اور لکھنے والوں نے کثیر تعداد میں ان احادیث سے استدلال کیا ہے جو صحیح حدیث کی شرائط پر پوری نہیں اترتیں، ایسا اس لیے ہوا ہے کہ ان لوگوں نے ایسی کتب سے حوالے نقل کرنے پر اعتماد کر لیا جن میں ہر موضوع پر ایسی احادیث بھی بیان کر دی گئی ہیں جو صحتِ احادیث کی شرائط پوری نہیں کرتیں اور ان لوگوں نے پھر ایسی احادیث کا مقام و مرتبہ بھی بیان نہیں کیا۔

اس کی سب سے واضح مثال امام ابوحامد الغزالی کی ''احیاء علوم الدین'' ہے، واعظین اور مصنفین کی کثیر تعداد اس کتاب کی طرف رجوع کرتی ہے۔ امام غزالی نے ''تعلّم اور تعلیم کی

فضیلت'' کے بارے میں تقریباً ۵۵ احادیث ذکر کی ہیں ہے، ان میں سے ۱۲ صحیح یا حسن ہیں باقی سب ضعیف ہیں۔اس کے باوجود واعظین و مصنفین کے ہاں ان کا بہت چرچا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس کتاب میں کسی قابل رد ضعیف حدیث کا حوالہ نہیں دینا پڑا۔ چونکہ صحیح و حسن احادیث بھی کم نہیں ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے انھیں سے استدلال کی توفیق بخشی اور ضعیف احادیث سے مستغنی کر دیا۔ میں نے اگر کہیں کوئی ایسی حدیث ذکر کی بھی ہے جو اس شرط کے خلاف ہو تو ایسا صرف لوگوں کو علم سے مانوس کرنے کے لیے کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا مقام و مرتبہ بھی بیان کر دیا ہے۔

بہر حال یہ اچھا طریقہ نہیں ہے۔

میں نے علم کا مقام صرف سنت کی روشنی میں ہی بیان کرنے تک محدود رکھا ہے کیوں کہ اس موضوع پر قرآن کا موقف بیان کرنے کے لیے تو الگ بحث کی ضرورت ہے، ممکن ہے اللہ تعالیٰ مجھے ''التفسیر الموضوعی للقرآن'' میں اس حوالے سے بات کرنے کی توفیق دے۔امید ہے کہ قارئین کرام اس مقصد کو پالیں گے جسے میں نے ان صفحات میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بارے میں اسلام کے طریقہ اور رسول اللہ ﷺ کی رہنمائی کو صاف و شفاف صورت میں دیکھ لیں گے۔

آیئے اللہ کی توفیق اور مدد کے ساتھ اس کام کا آغاز کرتے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی

---OO---

علم اور اہل علم کا مقام

قرآنِ حکیم کی آیات کے بعد بہت سی ایسی احادیث نبویؐ بھی روایت کی گئی ہیں جن کے اندر یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اور لوگوں کے نزدیک علم کی فضیلت اور علماء کی قدر ومنزلت کیا ہے! ان احادیث نے تو علماء کو اُس بلند مقام پر فائز کر دیا ہے جہاں پہنچنے کے لیے علم کے بغیر کوئی قدم اٹھا سکتا ہے نہ پر تول سکتا ہے۔

علوم میں سب سے بہترین علم، دین کا علم ہے، یہی وہ علم ہے جس کے ذریعے انسان اپنی اور اپنے رب کی معرفت حاصل کرتا ہے، اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے اس سے رہنمائی پاتا ہے، اسی سے اس کا راستہ روشن اور واضح ہوتا ہے، اور اسی علم کے ذریعے وہ جانتا ہے کہ اس کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا۔ مزید برآں یہ علم ہی ہے جس کے ذریعے ایسی حقیقت کی پردہ کشائی ہوتی ہے جو لوگوں کے لیے حق کی طرف رہنمائی کا باعث بنتی ہے، انھیں بھلائی کے قریب کر دیتی ہے اور ان کے نفع ونقصان کو ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

- مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا، یُفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ[1]

"اللہ کسی کے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو اسے دین کا فہم وشعور عطا کر دیتا ہے۔"

- مَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَلْتَمِسُ فِیْهِ عِلْمًا. سَهَّلَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِیْقًا اِلَی الْجَنَّةِ، وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰهِ، یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰهِ وَیَتَدَارَسُوْنَهٗ بَیْنَهُمْ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلٰئِکَةُ، وَنَزَلَتْ عَلَیْهِمُ السَّکِیْنَةُ،

۱۔ بخاری، مسلم اور ابن ماجہ نے اسے حدیثِ معاویہؓ سے روایت کیا ہے۔ "الترغیب للمنذری" تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، حدیث ۱۰۰۔

وغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيمَن عِنْدَهُ(۲)

''جو آدمی حصولِ علم کے راستے پر نکلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے، اگر کوئی گروہ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو، اور وہاں یہ لوگ اللہ کی کتاب کو پڑھیں اور افہام وتفہیم کی خاطر باہمی گفتگو کریں تو فرشتے انھیں ڈھانپ لیتے ہیں، اللہ کی طرف سے ان پر سکینت نازل ہوتی ہے، اس کی رحمت ان پر چھا جاتی ہے، اور اللہ ان کا تذکرہ اپنے اُن بندوں سے کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔''

اِنَّ الْمَلٰئِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا لِطَالِبِ الْعِلْمِ رِضًا لِّمَا يَصْنَعُ وَاِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ حَتّٰى الْحِيْتَانُ فِي الْمَاءِ، وَفَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ، وَاِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ، اِنَّ الْاَنْبِيَآءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا، اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهٗ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ(۳)

''طلب علم کے لیے جدوجہد کرنے والے پر فرشتے اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ اس کے لیے اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔ عالم کی عظمت کا یہ حال ہے کہ زمین وآسمان کی ہر چیز اس کے لیے بخشش کی دعا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ

۲- مسلم اور اصحاب سنن نے اسے روایت کیا ہے، ابن حبان نے اور حاکم نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ حاکم نے کہا ہے: بخاری ومسلم کی شرائط کے مطابق یہ صحیح ہے۔ ترغیب حدیث: ۱۰۵

۳- احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ بیہقی اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے، حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، حمزہ الکنانی نے حسن کہا ہے۔ ان کے علاوہ محدثین نے اس کی سند میں اضطراب کی بنیاد پر اسے ضعیف کہا ہے مگر اس کے شواہد موجود ہیں جن سے اسے تقویت ملتی ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۱/۱۶۹ طبع حلبی، شیخ البنا نے ان کو الفتح الربانی ۱/۱۵۰ میں صاحب التنقیح سے نقل کیا ہے کہ احمد کی روایت کے رجال حسن حدیث کی روایت کے رجال ہیں۔ اسی طرح انھوں نے حاکم کی سند کو بھی حسن کہا ہے اور اس کو نسائی، ابویعلی اور طبرانی کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ بخاری نے اس کے بعض طرق کو صحیح کہا ہے۔

سمندر کی مچھلیاں بھی اس کے لیے دعا گو ہوتی ہیں اور ایک اہل علم کو ایک
عبادت گزار پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح چاند کو دوسرے تمام
ستاروں کے مقابلے میں حاصل ہے اور علماء انبیاء کے ورثاء ہیں۔ انبیاء اپنی
وراثت میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے بلکہ ان کا ورثہ علم ہوتا ہے جو آدمی اس
ورثہ سے حصہ پالے یقیناً اس نے بہت بڑی دولت پالی۔"

ان احادیث سے علم، خصوصاً "دین کے علم" کی فضیلت واضح ہو رہی ہے، جسے حدیث میں "فقہ فی الدین" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، دراصل "دین کی فقہ" کے الفاظ میں مجرد "دین کے علم" کی نسبت بہت زیادہ گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے۔ "علم" سے مراد بس کسی چیز کو بظاہر جان لینا ہے جب کہ "فقہ" کا مطلب کسی چیز کے ظاہر کو جاننے کے ساتھ اس کی کنہہ تک پہنچنا ہے اور "علم" کا تعلق صرف دماغ سے ہی ہے جب کہ "فقہ" کا تعلق دماغ اور دل دونوں کے ساتھ ہے۔

اس لیے صرف شریعت کے جزئی احکام مثلاً طہارت ونجاست، رضاعت وطلاق اور بیع و شراء کے مسائل جان لینا "فقہ" نہیں ہے جیسا کہ جدید دور کے علماء نے سمجھ لیا ہے اس سے تو فقہ کا وہ ملکہ پیدا نہیں ہوتا جو حدیث میں مراد لیا گیا ہے، اور جسے حاصل کر لینے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کرنے کے ارادہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

علم کی فضیلت بیان کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ ایسی مجالس کو فرشتے حفاظت کی غرض سے گھیر لیتے ہیں، اللہ کی طرف سے سکینت کا نزول ہوتا ہے، رحمت ربانی وہاں چھا جاتی ہے اور اللہ ان مجالس کا تذکرہ ملأ اعلیٰ میں کرتا ہے۔

فرشتوں کا علمی مجالس کو گھیر لینے کا مطلب ہر طرح کے شر سے حفاظت کرنا ہے اور طالب علم کے لیے پر بچھانے کا مطلب اس کو توقیر واعزاز بخشنا ہے۔

ان دونوں احادیث کا نفس مضمون یہ ہے کہ فرشتے علم حاصل کرنے والے کی تعظیم کرتے ہیں، اس سے محبت کرتے ہیں، اس کو شر سے محفوظ رکھتے ہیں، اور یہ کوئی چھوٹا اعزاز نہیں ہے۔

ان احادیث اور اس قسم کی اور بہت سی احادیث کی طرح قرآنِ کریم کی بہت سی آیات بھی ایسی ہیں جن سے اصحابِ رسولؐ، تابعین عظامؒ اور مابعد القرون کے لوگوں نے ایسا عمدہ

ذوق پایا کہ وہ علم کو بڑی اہمیت دیتے تھے، علماء کی قدر کرتے تھے، علم کے زیادہ سے زیادہ حصول پر لوگوں کو ابھارتے تھے اور جہالت و لاعلمی کے باعث آدمی پر دنیا و آخرت میں آنے والی بدبختی سے لوگوں کو ڈراتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''لوگو! علم ضرور حاصل کرو۔ اللہ نے محبت کی ایک ردا [چادر] اختیار کر رکھی ہے، جو کوئی علم کے ایک دروازے تک پہنچ جاتا ہے اللہ اس کے اوپر اپنی یہ ردائے محبت ڈال دیتا ہے۔''(۴)

ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جہاد کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا:

''کیا میں تجھے جہاد سے بہتر عمل نہ بتا دوں؟ وہ یہ کہ تو ایک مسجد تعمیر کر دے جہاں قرآن، سنت رسولؐ اور فقہ فی الدین کی تعلیم دی جاتی رہے۔''(۵)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''بہترین مجلس وہ ہے جس میں حکمت کے موتی لٹائے جا رہے ہوں اور رحمت کی چادر پھیلائی جا رہی ہو۔''(۶) ان کی مراد علم کی مجلس ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''علم حاصل کرو کیوں کہ

...... علم کا سیکھنا اللہ کی خشیت ہے۔

...... علم کا حصول عبادت ہے۔

...... علم کا پڑھنا پڑھانا اللہ کی تسبیح ہے۔

...... علم کی جستجو میں نکلنا اللہ کے راستے میں جہاد ہے۔

...... بے علم کو علم کی تعلیم دینا صدقہ ہے۔

۴- ''جامع بیان العلم'' لابن عبدالبر ۱/ ۷۰

۵- ''جامع بیان العلم'' لابن عبدالبر ۱/ ۷۳، ۷۴

۶- ''جامع بیان العلم'' لابن عبدالبر ۱/ ۶۰

...... اہل علم پر مال خرچ کرنا اللہ کی قربت کا ذریعہ ہے۔

...... علم آدمی کا تنہائی میں دوست اور خلوت کا ساتھی ہے۔

...... علم آدمی کے دین کا رہنما ہے۔

...... علم عشرت وعسرت میں آدمی کا مددگار ہے۔

...... علم دوستوں کے ہاں آدمی کا نمائندہ ہے۔

...... علم آدمی کے لیے قریبی دوستوں کے مزید قرب کا باعث بنتا ہے۔

...... علم مرابطِ جنت کا چمکتا مینار ہے۔

...... علم کے ذریعے اللہ قوموں کو سرفرازی عطا کرتا ہے تو ان کے اندر شرافت و قیادت اور سیاست و ہدایت سے مالامال رہنما پیدا کر دیتا ہے جو ہر گام پر ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایسے رہنما خیر و بھلائی کی نشانیاں ہوتے ہیں لوگ ان کے نقوش پا کے اوپر چلنا باعث افتخار سمجھتے ہیں، ان کے اعمال وافعال کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ فرشتے ان کی معیت کے لیے کھنچ آتے ہیں اور اپنے پَروں کا ان کے ساتھ لمس کرتے ہیں، بحر و بر کی ہر چیز ان کے لیے بخشش کی دعا کرتی ہے حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں اور مگرمچھ، خشکی کے درندے اور چوپائے اور آسمان اور اس کے ستارے..........

[حضرت معاذ بن جبلؓ نے تو اس سے آگے یہاں تک کہہ دیا ہے] یہ علم ہی ہے جس کے باعث اللہ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اس کی عبادت کی جاتی ہے، اس کی توحید بیان کی جاتی ہے، اس کی بزرگی کے گن گائے جاتے ہیں، اس کی ہیبت و جلالت سے خوف کھایا جاتا ہے، اور یہی علم ہے جس کی وجہ سے رشتہ داریاں ٹوٹنے سے بچ جاتی ہیں، اور اس علم سے ہی حلال وحرام کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ علم امام اور عمل اس کا پیروکار ہے۔ خوش نصیب لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ نعمت عنایت فرماتا ہے اور بدبخت اس سے محروم رہتے ہیں۔''(۷)

۷۔ ابن عبدالبر، ابونعیم اور خطیب نے اس روایت کو معاذ بن جبلؓ تک موقوف روایت کیا ہے۔ بعض نے مرفوع بھی روایت کیا ہے لیکن اسے صحیح نہیں کہا، ابن القیم کا کہنا ہے کہ اس روایت کے معتبر ہونے کے لیے اس کی سند کا معاذ بن جبلؓ تک پہنچنا ہی کافی ہے۔

حسن بصریؒ کہتے ہیں:

''اگر علماء نہ ہوتے تو لوگ جانوروں کی سی زندگی گزارتے، یعنی علماء لوگوں کو بہیمیت کے دائرہ سے نکال کر انسانیت میں داخل کر دیتے ہیں۔''

یحییٰ بن معاذ کا قول ہے:

''علماء امت محمدیہؐ کے لیے ان کے والدین سے بھی زیادہ رحیم وشفیق ہیں۔'' پوچھا گیا کیسے؟ کہا: ''اس طرح کہ والدین تو ان کو دنیا کی آگ سے بچاتے ہیں جب کہ علماء انھیں جہنم کی آگ سے بچاتے ہیں۔''

عبداللہ بن مبارک سے پوچھا گیا:

''الناس'' سے مراد کون ہیں؟ انھوں نے کہا: علماء! پھر پوچھا گیا: ''ملوک'' کون ہیں؟ جواب دیا: پرہیز گار!

امام غزالیؒ کہتے ہیں: علم سے بے بہرہ افراد ''الناس'' میں شامل نہیں، کیوں کہ انسانوں کو چوپایوں سے ممتاز کرنے والی خاصیت علم ہے۔ انسان اس وقت تک انسان ہے جب تک وہ شریف ہے، اور یہ صفت جسمانی قوت سے تو حاصل نہیں ہوتی، اگر ایسا ہے تو پھر اونٹ اس سے زیادہ طاقتور ہے، اور یہ طاقت محض ہڈیوں کے بل پر نہیں تب تو ہاتھی اس سے بڑا ہے لیکن اس کی یہ بڑائی شجاعت کی بنا پر نہیں تب تو درندہ ہاتھی سے زیادہ شجاعت رکھتا ہے لیکن وہ اس لیے بہادر نہیں کہ وہ کھا جاتا ہے، اس طرح تو بیل اس سے زیادہ بڑا پیٹ رکھتا ہے اور بیل کے پیٹ کا بڑا ہونا اس بات کی علامت نہیں کہ اس کے اندر اپنے مادہ سے ملنے کی طاقت بہت زیادہ ہے، اس طرح تو نر چڑیا اپنے مادہ کے ساتھ جفتی کرنے میں بڑی طاقت رکھتا ہے، مگر انسان کا معاملہ مختلف ہے یہ تو علم کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔''(۸)

امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ:

''انسان کے لیے علم کی ضرورت، کھانے پینے کی ضرورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔''

۸۔ احیاء علوم الدین: جلد۱/۷

علم ایمان کا رہنما ہے

اسلام میں علم ایمان کا مدمقابل نہیں ہے، اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے اس لیے کہ علم تو ایمان کے نتیجے میں اُخروی زندگی کے لیے کی جانے والی تیاری کا ذریعہ بنتا ہے۔ علم وایمان کے آپس میں ضد ہونے کا یہ نظریہ عہد وسطی میں یورپ کے اندر چھایا رہا۔ اس دور میں چرچ کی سرگرمیاں خرافات کی تائید کرنے، علم سے دست وگریباں ہونے، جمود وتقلید کی حمایت کرنے، حریت آزادی ونئی ایجادات پر قدغن لگانے اور نظامِ حکومت پر مسلط جاگیرداروں کا مقابلہ کرنے تک محدود ہوگئی تھیں۔ اس وقت چرچ مجبور ومظلوم قوموں کے درمیان کھڑا تھا۔

اسلام اپنی تاریخ میں آج تک علم وایمان کے اس فاصلہ سے آشنا نہیں۔ کیوں کہ اس کی تعلیمات میں اس طرح کا تصور تو جگہ ہی نہیں پاسکتا۔ عیسائیت کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ایمان ایک ایسا معاملہ ہے جس کا غور وفکر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، بلکہ ایمان تو غور وفکر کا متضاد ہے، اور یہ عقل وعلم کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتا بلکہ دل اور شعور کے احاطہ میں ہوتا ہے، اور کسی چیز پر ایمان لانے کے لیے ضروری نہیں کہ عقل بھی اسے تسلیم کرتی ہو بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ وہ چیز جس پر ایمان لایا جارہا ہے مافوق العقل ہو، یہی وجہ ہے کہ یہ مقولے عیسائیت کی بڑی بڑی علامات تھیں: ''پہلے کسی چیز پر ایمان لاؤ پھر اس کے بارے میں علم حاصل کرو'' اور ''جب کسی چیز پر اعتقاد رکھ رہے ہو تو اس وقت اپنے آپ کو اندھا تسلیم کرو۔'' ایک شخص تو امرء القیس کی زبان میں یوں کہتا ہے:

أَغْمِضْ عَيْنَيْكَ ثُمَّ اتَّبِعْنِي

''اپنی آنکھیں بند کرلو اور میرے پیچھے چلنا شروع کردو۔''

عیسائیت میں ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ نصرانی عقیدہ کی بنیاد ان معاملات ومسائل پر رکھی گئی ہے عقل عام جن کا انکار کرتی ہے۔ مثلاً تثلیث، تخلیص، فداء اور ان سے متعلقہ مسائل کا عقیدہ، حتیٰ کہ نصرانی فلاسفہ نے تو بعض معتقدات کو ''اللامعقولة'' [ماورائے عقل] کا نام دیا ہے۔ پادری اوگستین کا کہنا ہے: ''میں اس چیز پر ایمان رکھتا ہوں اس لیے کہ یہ عقل میں نہیں آسکتی۔''

اسلام تو اس تصور کے خلاف ہے کہ عقیدہ وایمان کی بنیاد محض تقلید وتبعیت ہو جیسا کہ کہنے والوں نے کہا:

حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا [المائدہ:۱۰۴]

''ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔''

اِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا [الاحزاب:٦٧]

''ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی۔''

أَنَا مَعَ النَّاسِ (۹) ''میں لوگوں کے ساتھ ہوں۔''

اسلام تو ظن وتخمین پر بنیاد کھڑی نہیں کرتا، عقاید میں تو وہ علم ویقین سے ہرگز صرف نظر نہیں کرتا، اسی لیے تو اس نے عیسائیت کے عقیدۂ صلیب پر ان کی برائی یوں بیان کی ہے:

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ [النساء:۱۵۷]

''ان کے پاس اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے محض گمان ہی کی پیروی ہے۔''

مشرکین اور ان کے خود ساختہ معبودانِ باطل لات، عزیٰ اور منات الثالثۃ الاخریٰ کے بارے میں کہا ہے:

اِنْ هِيَ اِلَّا أَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا أَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ، اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ [النجم:۲۳]

''دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم وگمان کی پیروی کررہے ہیں اور خواہشاتِ نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں۔''

قرآن تو عقائد کی عمارت کی بنیاد گہرے غور وخوض پر قائم ہونے والی دلیل پر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن باطل عقاید رکھنے والوں کے بارے میں علی الاعلان کہتا ہے:

۹- جیسا کہ حدیث میں آیا ہے ''لَا يَكُنْ اَحَدُكُمْ اِمَّعَةً: يَقُوْلُ: أَنَا مَعَ النَّاسِ اِنْ اَحْسَنُوْا أَحْسَنْتُ وَ اِنْ أَسَاءُوا أَسَأْتُ'' [ترمذی]

''تم میں سے کوئی بدھو نہ بن جائے کہ وہ یہ کہتا پھرے: ''میں تو لوگوں کے ساتھ ہوں اگر وہ اچھائی کریں گے تو میں بھی اچھائی کروں گا، اگر وہ برائی کریں گے تو میں بھی برائی کروں گا۔''

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ. [البقرہ:۱۱۱]

''ان سے کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔''

اور یہ بات تعجب انگیز بھی نہیں ہے کہ قرآن میں اس طرح کی آیات بار بار آئی ہیں جو فکر کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور انسان کو تقلید و جمود کے پھندے سے آزاد کرنے والی ہیں، مثلاً: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، [تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟]، اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ [تم غور وفکر کیوں نہیں کرتے؟] اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا [کیا انھوں نے غور نہیں کیا؟] اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا [کیا انھوں نے تفکر نہیں کیا؟] لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ [عقل سے کام لینے والی قوم کے لیے] لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ [علم رکھنے والی قوم کے لیے] لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ [تفکر و تدبر کرنے والی قوم کے لیے]

ہمارے لیے تو قرآنِ کریم کی یہ دعوت ہی کافی ہے جو سوچ و بچار اور غور وفکر کی طرف بلاتی ہے:

قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا [سبا:۴۶]

''اے نبیؐ! ان سے کہو کہ ''میں تمھیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو۔''

یہی وہ داعیہ تھا جس نے استاذ عباس العقاد کو اپنی کتاب کا عنوان ''التفکر فریضۃ اسلامیۃ'' [غور وفکر اسلامی فرض ہے] قائم کرنے پر مجبور کیا۔ اور یہ تعبیر بالکل صحیح ہے، اسلام نے لوگوں پر جس طرح عبادت کرنا فرض ٹھہرایا اسی طرح غور وفکر سے کام لینا بھی فرض قرار دیا ہے۔

اسلام میں عقیدہ و ایمان کی بنیاد علم پر قائم ہوتی ہے نہ کہ اندھی پیروی پر۔ قرآن کہتا ہے:

- فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ [محمد:۱۹]

''پس اے نبیؐ! خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔''

- اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. [المائدہ:۹۸]

''خبردار ہو جاؤ! اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت درگزر اور رحم بھی کرنے والا ہے۔''

- وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. [البقرہ:۲۳۵]

''خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔لہٰذا اس سے ڈرو اور
یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے (چھوٹی چھوٹی باتوں سے) درگزر فرماتا ہے۔''

قرآن نے علم و تفکر اور عقل و بصیرت کی طرف دعوت دیتے ہوئے یہ خوف محسوس نہیں کیا کہ اس کے نتائج دین کے حقائق اور اس کے مسلّمات کے درمیان تناقض پیدا کر دیں گے۔اس لیے کہ اسلام کا نظریہ تو یہ ہے کہ: کوئی دینی حقیقت عقلی حقیقت سے ٹکرائے، یہ ممکن ہی نہیں، حق، حق کی نقیض نہیں ہو سکتا، اور یقین، یقین کی ضد نہیں ہو سکتا، یقین کی ضد تو ظن (گمان) ہے اور حقیقت کا متضاد شک، وہم اور انکار ہے۔

لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ کوئی صحیح منقول بات صریح عقل کے خلاف ہو۔ بسا اوقات جب ہمارے سامنے کوئی ظاہری تناقض آ جاتا ہے تو لازمی بات ہے کہ یا تو منقول بات صحیح نہیں یا معقول بات صحیح نہیں۔اور اس طرح تو اکثر ہوتا ہے کہ جو چیز ''دین'' نہیں ہے اسے دین خیال کر لیا جاتا ہے۔اور جو چیز ''علم'' کے دائرے میں نہیں آتی اسے ''علم'' تصور کر لیا جاتا ہے، اس لیے اہل دین کی تمام تعبیریں دین نہیں بن سکتیں جس طرح اہل علم کے تمام نظریات علم قرار نہیں دیے جا سکتے۔

قرآن تو حقیقی علم کو ایمان کی طرف بلانے والا اور اس کی طرف انسان کی رہنمائی کرنے والا قرار دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ. [الحج:۵۴]

''اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے
اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں۔''

یہ تین باتیں تو ایک دوسرے کی بنیاد پر ہی ترتیب پاتی ہیں۔اور اسی ترتیب کی بنا پر ایمان کا درجہ علم کے بعد آتا ہے کہ پہلے کسی چیز کا علم حاصل کیا جائے پھر اس پر ایمان لایا جائے۔

اور ایمان کی پیروی میں اللہ کے خوف و خشوع کے باعث دل حرکت کرتے ہیں، اس طرح ''ایمان'' علم کا ثمر ہے اور ایمان سے اللہ رب العالمین سے خوف و خشیت کا ''ثمر'' نصیب ہوتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں علم اور ایمان کو یکے بعد دیگرے اور پہلو بہ پہلو ذکر کیا گیا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ[الروم:٥٦]

''جو لوگ علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روزِ حشر تک پڑے رہے ہو۔''

اس آیت کریمہ میں علم اور ایمان اکٹھے اور ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہیں لہٰذا یہ آپس میں کوئی متضاد چیزیں نہیں ہیں کہ ان میں سے ایک موجود ہو اور دوسری غائب ہو جائے۔

اگر ہم علم سے مراد وہ علم لیں جو موجودہ دور میں معروف ومشہور ہے اور جو مادی ہے اور حسی مشاہدہ وتجربہ پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے تب بھی ہم اس علم کی قدر وقیمت اور لوگوں کے لیے اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے اس لیے کہ بلاشک وشبہ مادی علم انسان کی ضرورت ہے لیکن یہ ضرورت وسائل پیدا کرنے کے لیے ہے نہ کہ انجام تک پہنچنے کے لیے!

یہ علم زندگی میں انسان کے لیے مددگار ہوتا ہے، انسان کے لیے اس کی راہوں کو آسان بناتا، وقت کو مختصر کرتا اور فاصلوں کو سمیٹتا ہے، یہ علم بعید کو قریب اور سخت کو نرم کرتا ہے لیکن انسان کی خوش بختی وآسودہ حالی تنہا اسی علم کے بس کی بات نہیں، جیسا کہ صرف یہی ایک بات بھی علم کے بس میں نہیں ہے کہ وہ انسان کی زندگی کو باضابطہ بنا سکے اور انسان کی اَنا Eagoاور برائی کی طرف نفس امارہ کے میلان کا سدباب کر سکے۔

اس لیے انسان کو اس ''دینی علم'' کی اشد ضرورت ہے جو ایمان کو نمو دیتا ہے، ضمیر کو بیدار کرتا ہے، اخلاقِ حسنہ کو پروان چڑھاتا ہے، انسان کو اس کے بخیل نفس سے بچا کے رکھتا ہے، اس کی جنسی خواہشات کو عقل پر غلبہ پانے اور اس کے ضمیر پر تمناؤں کو حملہ آور ہونے سے روکتا ہے اور یہی وہ علم ہے جو ''مادی علم'' کو حق سے انحراف کرنے سے روکتا ہے اور اسے انسان سے عداوت وتباہی کے لیے استعمال کرنے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی مثال بیان کی ہے، اللہ نے انھیں ایسی حکومت وسلطنت عطا فرمائی تھی کہ ان کے بعد کسی کو ایسی جلیل القدر حکومت نصیب نہیں ہوئی۔

ملکہ بلقیس کا تخت یمن کے علاقہ سبا سے لاکر شام میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے

ایوانِ سلطنت میں رکھ دیا گیا، اور یہ سارا کام آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے ہو گیا۔ جو شخص یہ تخت لے کر آیا تھا قرآنِ کریم نے اس کا حال بیان کرتے ہوئے کہا ہے "عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ" [اس کے پاس کتاب کا علم تھا۔]

اور یہاں ایمان اپنی بہار دکھاتا ہے جب سلیمان علیہ السلام نے اس اعزاز وفضل کو اپنی طرف نہیں بلکہ اللہ کی طرف منسوب کیا، اس وقت وہ کسی غرور میں مبتلا نہیں ہوئے اور کسی سرکشی کا انھیں خیال تک نہیں آیا۔ فرمایا:

قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْ أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ. [النمل:۴۰]

"وہ پکار اٹھا" یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے، ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔"

ذوالقرنین کا رویہ بھی یہی تھا جس نے مشرق ومغرب کو فتح کر ڈالا تھا، اور اس وقت کی سائنس وٹیکنالوجی اور وسائل وآلات کو استعمال کرتے ہوئے عظیم بند باندھ کر اپنی حکومت کو چار چاند لگا دیے تھے، جب وہ یہ تعمیر مکمل کر چکا تو اس نے مؤمنانہ عاجزی کے ساتھ کہا:

هٰذَا رَحْمَةٌ مِنْ رَبِّيْ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا. [الكهف:۹۸]

"یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوندِ خاک کر دے گا، اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔"

آگاہ رہنا چاہیے کہ علم حقیقی وہی ہے جو ایمان کی طرف لے جائے اور ایمانِ حقیقی وہ ہے جو علم کے میدان کو وسیع وکشادہ کرتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں ایک دوسرے سے اتفاق کرنے والے دو شریک بلکہ ایک دوسرے کے معاون ومددگار دو بھائی ہیں۔

اور یہی علم ہے جو اسلام کو مطلوب ہے خواہ اس کا موضوع اور دائرۂ بحث کچھ بھی ہو، اسلام

اس علم کو ایمان کے سائے تلے دیکھنا چاہتا ہے اور ایمان جیسی ہی اعلیٰ چیزوں کا خدمت گار بنانا چاہتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی وقت اس طرف اشارہ کر دیا تھا جب پہلی ہی آیت نازل کی تھی [اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ] اور قرأت تو علم کا سرنامہ، اس کی چابی اور اس کا چراغ ہے۔ قرآن میں جب پہلا ربانی حکم القرأت آیا تو یہ اسلام میں علم کے مقام کی واضح ترین دلیل تھی۔

لیکن قرآن نے ''قرأت'' کا مطلب ''صرف قرأت'' نہیں لیا بلکہ ایک ''خاص قید'' لگا کر اس کا مطالبہ کیا ہے وہ قید یہ ہے کہ قرأت 'اللہ کے نام' کے ساتھ ہو۔

اور جب قرأت اللہ کے نام کے ساتھ ہی ہوگی تو اس کا رخ حق و خیر اور ہدایت کی طرف ہوگا کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس سب کچھ کا مصدرِ حقیقی ہے۔

اس میں کوئی راز نہیں کہ اسلام میں علم نے دین کے مراکز ہی میں پرورش پائی ہے۔ مساجد کے صحنوں میں مدارس قائم ہوئے اور بڑی بڑی اسلامی یونیورسٹیوں کا آغاز مساجد کے سائے تلے ہی ہوا، بلکہ ان میں سے ہر کسی کا نام ہی ''جامع'' رکھ دیا گیا جامع الازہر، جامع القرویین، جامع الزیتونیہ وغیرہ۔

یہ جامعات دینی اور دنیاوی دونوں علوم کی تدریس بیک وقت کراتی تھیں۔ قاضی ابن رشد الحفید مؤلف "بداية المجتهد و نهاية المقتصد" [فقہ کی کتاب] و مؤلف "الكليات" [طب کی کتاب] اور خوارزمی جس نے ایک ہی کتاب تالیف کی جس کی بنیاد علمِ الجبرا پر رکھی، تا کہ فقہ کے ابواب میں وراثت کے مسائل کی مشکلات حل ہو سکیں۔ ان جیسے بہت سے فضلاء ایسے تھے جو تجرباتی علم کے ساتھ دینی علم کے بھی ماہر تھے۔

علم عمل کا رہنما ہے

اسلام میں علم جس طرح ایمان کا رہنما ہے اسی طرح عمل کا بھی رہنما ہے۔ امام بخاریؒ اپنی الجامع الصحیح میں ایک باب قائم کرتے ہیں، "بابُ العلم قبل القول و العمل" [قول و عمل سے پہلے علم کی ضرورت]

ابن منیر کہتے ہیں: ''یہ باب قائم کرنے کا مطلب امام بخاریؒ کے نزدیک یہ ہے کہ علم قول و عمل کی صحت کے لیے شرط ہے یہ دونوں علم کے ساتھ ہی قابل اعتبار ہوتے ہیں۔ علم ان دونوں

سے مقدم ہے اور اس نیت کو درست کرنے والا ہے جو عمل کی درستی کا باعث بنتی ہے۔ مصنف [امام بخاری] نے اسی جانب توجہ دلائی ہے، تاکہ لوگوں کے ذہن میں پہلے یہ بات نہ آئے کہ ''عمل کے بغیر علم کا کوئی فائدہ نہیں'' اِنَّ الْعِلْمَ لَا یَنْفَعُ اِلَّا بِالْعَمَلِ کہ کہیں یہ چیز علم کی ناقدری اور اس کے حصول میں سستی کا باعث نہ بن جائے۔''(۱۰)

امام بخاریؒ نے جو آیات و احادیث ذکر کی ہیں ان میں یہ آیت بھی ہے:

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ [محمد:۱۹]

''پس اے نبیؐ! خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی۔''

اللہ تعالیٰ نے علم کا ذکر پہلے اور عمل کا دوسرے نمبر پر کیا ہے، اور علم کی اصل اور اس کی رفعت و حقیقت اللہ کی معرفت و توحید ہے۔ آیت میں اگرچہ خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے لیکن حکم ساری امت کے لیے ہے۔

اللہ بزرگ و برتر کا فرمانا ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ [فاطر:۲۸]

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ اللہ سے جس طرح ڈرنے اور خوف کھانے کا حق ہے اس طرح تو وہی لوگ ڈرتے ہیں جو کائنات اور شریعت کے اَسرار و رموز میں غور و فکر کے بعد اللہ کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں اور اس کی عظیم قدرت کا ادراک کر لیتے ہیں، ایسے لوگ تو علماء ہی ہیں، یہی وہ خشیت ہے جو عمل صالح پر ابھارتی اور برائیوں سے بچاتی ہے۔

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ(۱۱)

''اللہ جسے متاعِ خیر سے نوازنا چاہتا ہے اسے دین کا گہرا شعور عطا فرما دیتا ہے۔''

۱۰۔ صحیح البخاری مع شرح فتح الباری: جلد۱/۱۶۹ طبع الحلبی

۱۱۔ صحیح البخاری مع شرح فتح الباری: جلد۱/۱۶۹-۱۷۰

اور ایسا اس لیے ہے کہ جب وہ دین کو بہترین طریقے سے سمجھے گا تو اس پر عمل کرے گا اور جب عمل کرے گا تو بہترین عمل کرے گا۔

فقیہ کا ادنیٰ درجہ یہ ہے جیسا کہ امام غزالی نے کہا ہے کہ: ''وہ یہ جان لے کہ آخرت دنیا سے بہتر ہے، پھر یہ معرفت جب صداقت بن جائے اور اس پر غالب آ جائے تو وہ نفاق و ریاکاری سے محفوظ ہو جائے گا۔''(۱۲)

اسی موقف کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جو حضرت زید بن اسلم سے مروی ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ دَفَعَ رَجُلًا إِلٰى رَجُلٍ يُعَلِّمُهُ فَعَلَّمَهُ حَتّٰى بَلَغَ "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ......" فَقَالَ الرَّجُلُ حَسْبِي فَقَالَ الرَّجُلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَرَأَيْتَ الرَّجُلَ الَّذِيْ أَمَرْتَنِيْ أَنْ أُعَلِّمَهُ لَمَّا بَلَغَ "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ" فَقَالَ حَسْبِيَ؟

فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ "دَعْهُ فَقَدْ فَقِهَ"(۱۳)

''نبی ﷺ نے ایک آدمی کو ایک آدمی کے پاس بھیجا تا کہ وہ اسے (آنے والے کو) سکھائے پڑھائے۔ وہ معلّم اسے تعلیم دیتا رہا۔ جب قرآنِ مجید کی آیت ''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ'' پر پہنچا تو اس تعلیم حاصل کرنے والے شخص نے کہا بس میرے لیے کافی ہے، معلّم نے بارگاہِ رسالت میں گزارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جس کو تعلیم دینے پر آپ نے مجھے مامور فرمایا تھا۔ جب وہ آیت ''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ'' پر پہنچا تو اس نے کہا میرے لیے کافی ہے۔......

آپؐ نے جواب میں فرمایا ''اسے چھوڑ دو وہ اب سمجھ چکا ہے۔''

اس واقعہ کا سیاق اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ اس آدمی نے اپنے دل کو ایمان کے نور سے منور کر لیا تھا اور اللہ کی خشیت سے بھر لیا تھا۔

۱۲- احیاء علوم الدین: جلد۱/۵

۱۳- عبدالرزاق، عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے اسے روایت کیا ہے۔ اسی طرح الدر المنثور جلد۶/ ۳۸۱ و ۳۸۲ میں آئی ہے۔

اسی مفہوم کی روایت مطلب بن عبداللہ بن حنطب سے مروی ہے:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَرَأَ فِيْ مَجْلِسٍ وَمَعَهُمْ أَعْرَابِيٌّ جَالِسٌ "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" فَقَالَ الأَعْرَابِيُّ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ؟ قَالَ نَعَمْ فَقَالَ الأَعْرَابِيُّ وَاسَوأَتَاهُ. ثُمَّ قَامَ وَهُوَ يَقُوْلُهَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: لَقَدْ دَخَلَ قَلْبَ الأَعْرَابِيِّ الْإِيْمَانُ(۱۴)

''رسول اللہ ﷺ نے ایک مجلس میں قرآنِ کریم کی آیات "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ'' پڑھیں اِس وقت آپ کے ساتھ ایک اعرابی بیٹھا ہوا تھا۔ آیات سن کر اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ایک ذرہ بھر بھی دیکھ لے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! اس پر اعرابی نے کہا افسوس۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور یہی کلمہ دہرا رہا تھا۔ نبی ﷺ! نے فرمایا: ''اعرابی کے دل میں ایمان داخل ہو گیا ہے۔''

نبی ﷺ کا یہ کلمہ کہ ''ایمان اعرابی کے دل میں داخل ہو گیا ہے'' گزشتہ حدیث میں ''وہ اب سمجھ چکا ہے'' کے معنی میں ہے۔

ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ علم عمل کے لیے لازمی شرط ہے، تاکہ عمل صحیح ہو اور اللہ کے حکم کے مطابق درست طریقے پر انجام پائے، خواہ یہ عمل اللہ کی عبادت ہو یا لوگوں سے معاملات ہوں۔

سفیان بن عیینہ عمر بن عبدالعزیز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے ''جو علم کے بغیر عمل کرے گا وہ عمل صحیح کم اور خراب زیادہ ہوگا''۔(۱۵)

حضرت معاذ بن جبل ؓ کی حدیث میں جو ''علم کی فضیلت'' کے باب میں آ چکی ہے وہ کہتے ہیں: ''علم عمل کا امام ہے اور عمل اس کا تابع ہے۔''

۱۴- اسے سعید بن منصور نے تخریج کیا ہے جیسا کہ درمنثور جلد ۱/۳۸۱ میں ہے۔

۱۵- جامع بیان العلم لابن عبدالبر: جلد ۱/۳۳

اس شخص کی عبادت اعتدال سے عاری ہوتی ہے جو اس کی شرائط وارکان سے لاعلم ہو جن پر عبادت قائم ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے اس آدمی سے جس نے نماز درست طریقے اور اطمینان وسکون سے ادا نہ کی تھی فرمایا: اِرْجِعْ فَصَلِّ، فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ''[16]

باوجود اس کے کہ اس شخص نے آپؐ کے سامنے نماز ادا کی تھی، آپؐ نے فرمایا: ''لَمْ تُصَلِّ'' تیری نماز نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ اس کی نماز ناقص و ناتمام تھی۔

انسان کی عام زندگی کے معاملات و مسائل خواہ وہ انفرادی ہوں یا خاندانی و اجتماعی! ضروری ہے کہ انسان کو ان میں سے غلط وصحیح اور حلال وحرام کا علم ہو، تاکہ وہ لاعلمی کی وجہ سے کہیں حرام کا مرتکب نہ ہو جائے اور احکامِ شریعت سے لاعلمی کے باعث وہ خلافِ قانون کوئی کام نہ کر بیٹھے کہ پھر اس کے پاس کوئی عذر نہ ہو، جو چیزیں اور کام واضح طور پر حلال ہیں انھیں اختیار کرنے اور ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں اور جن چیزوں اور کاموں کی حرمت واضح ہو چکی ہے ان کے ارتکاب پر کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا اور جو چیزیں مشتبہات میں سے ہیں ''لَا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ'' کہ اکثر لوگ ان سے لاعلم ہیں۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ اس چیز کو چھوڑ دیا جائے جو شک کا باعث ہو کیوں کہ:

.فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُھَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَءَ لِدِیْنِہٖ وَعِرْضِہٖ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُھَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ، کَالرَّاعِيْ یَرْعٰی حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِکُ أَنْ یُوَاقِعَہٗ''[17]

''جو شخص شبہات سے بچ کر رہا اس نے اپنا دین بھی بچا لیا اور آبرو بھی، اور جو شبہات کا مرتکب ہو گیا گویا وہ حرام کا مرتکب ہو گیا اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو چراگاہ کے پاس اپنے ریوڑ کو چراتا ہے نہ معلوم کب اس کا ریوڑ اس چراہ گاہ میں داخل ہو جائے۔''

سلف صالحین تو اس تاجر کو جو منڈی میں تجارت کے لیے جاتا ہے نصیحت کرتے ہیں کہ وہ

۱۶- بخاری ومسلم کے علاوہ دیگر محدثین نے اسے کتاب الصلوۃ میں ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے: دیکھیے نیل الاوطار: جلد۲/۲۹۴-۲۹۵

۱۷- متفق علیہ: حدیث نعمان بن بشیر

خرید وفروخت اور لین دین کے معاملات کی سمجھ بوجھ حاصل کر لے یا ایسے فقیہ عالم سے رابطہ میں رہے جو اس کی رہنمائی کرتا رہے۔

ایسا شخص جو اپنے آپ کو سیادت و قیادت کا اہل سمجھتا ہو، ضروری ہے کہ وہ اس منصب کے شایانِ شان علم سے آراستہ ہو۔ جو اس کے راستہ کی رہنمائی کا کام کرتا رہے اور بزرگوں کا قول ماثور ہے:

"تَفَقَّهُوْا قَبْلَ أَنْ تَسَوَّدُوْا"

"لوگوں کی قیادت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے علم وتفقہ حاصل کرلو۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے خود کو مصر کی بادشاہی کے لیے پیش کیا، تاکہ وہ خود کو اس منصب بلند پر فائز کرلیں جس پر فائز ہونا ان جیسے بلند لوگوں کے لائق شان ہے۔ اس وقت انھوں نے اپنی ذاتی اہلیت کے علاوہ امانت کی حفاظت اور علم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ. [یوسف:۵۵]

"ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔"

فقہاء نے شرط لگائی ہے کہ اعلیٰ قیادت مثلاً امامت عظمیٰ اور عدلیہ کے عہدوں پر ان لوگوں کو فائز کیا جائے جو اتنا علم رکھتے ہوں جو ان کو درجۂ اجتہاد تک پہنچا دے، تاکہ جب ان سے فتویٰ پوچھا جائے تو وہ علم کی روشنی میں فتویٰ دیں اور کوئی آرڈر جاری کریں تو وہ حق پر مبنی ہو۔ جب فیصلہ کریں تو عدل وانصاف کے تمام تقاضے پورے کریں۔ کوئی جرح کریں تو اپنی خداداد بصیرت کی بنیاد پر کریں۔

فقہاء امامت وعدالت کے معاملہ میں کسی ایسے شخص کو قبول نہیں کرتے جو کسی ایک ہی امام کا مقلد ہو سوائے اس کے کہ بامر مجبوری ایسے شخص سے کام لیا جاسکتا ہے، اس بنیاد پر کہ ضروریات ممنوعات کو مباح کردیتی ہیں اور بسا اوقات بلندی پر فائز چیز کو پستی میں پڑی چیز کی طرف آنا پڑتا ہے۔

بہر حال امت پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنے امور کا ادراک رکھے، ان کی اصلاح و درستی سے پہلو تہی نہ کرے یہاں تک کہ اپنے امور کا نگران علم وعمل کے اعتبار سے قیادت کے اہل ترین

اور بہترین لوگوں کو بنائے۔ فقہاء میں سے کسی نے بھی یہ اجازت نہیں دی کہ مسلمانوں کے سیاسی وعدالتی امور کی نگرانی کسی ایسے شخص کو دے دی جائے جو شریعت الٰہیہ سے لاعلم ہو، اس لیے کہ یہی شریعت تو مسلمانوں میں احکام نافذ کرنے کے لیے بنیاد ہے اور اس سے ناواقف شخص جب جہالت اور خواہش نفس کی بنا پر فیصلہ کرے گا تو دونوں صورتوں میں جہنم کا ایندھن بنے گا۔

حضرت بریدہ مرفوع روایت کرتے ہیں:

اَلْقَضَاءُ ثَلَاثَةٌ، وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ وَ اِثْنَانِ فِي النَّارِ، فَاَمَّا الَّذِيْ فِي الْجَنَّةِ، فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضٰى بِهٖ، وَرَجُلٌ عَرَفَ الحَقَّ وَجَارَ فِي الحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ قَضٰى لِلنَّاسِ عَلٰى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ (۱۸)

''فیصلہ کرنے والے تین قسم کے ہیں۔ ان میں سے ایک جنتی اور دو جہنمی ہیں۔ جنتی آدمی وہ ہے جسے حق معلوم ہو گیا تو اس نے حق کے مطابق ہی فیصلہ دیا، اور وہ شخص جسے حق تو معلوم ہو گیا لیکن اس نے فیصلہ ناحق دیا یہ جہنمی ہے تیسرا وہ شخص جہنمی ہے جس نے لاعلمی و جہالت کی بنیاد پر ہی لوگوں کے درمیان فیصلہ کر ڈالا''

اور علم تو وہ ہے جو راجح اور مرجوح (مقدم و مؤخر) فاضل و مفضول (افضل و ادنی) کا فرق کرتا ہے، اسی طرح صحیح و فاسد، مقبول و مردود (پسندیدہ و ناپسندیدہ) اور مسنون و مبتدع (سنت و بدعت) کا فرق واضح کرتا ہے، اور ہر عمل کی وہی قیمت لگاتا ہے جو شریعت کی نظر میں اس کی ہوتی ہے۔

ہم نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جو علم کے نور سے محروم تھے اور انھوں نے اعمال کی حدوں کو اس طرح ملا دیا کہ وہ پھر جدا جدا نہ ہو سکیں، یا وہ ایسے فیصلے صادر کرتے ہیں جو شریعت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس طرح وہ کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں یا پھر حد سے ہی تجاوز کر جاتے ہیں۔ یہاں آ کر دین غلو سے کام لینے والوں اور سخت رویہ اختیار کرنے والوں کے درمیان ضائع ہو جاتا ہے۔

۱۸- منتقی میں ہے: اسے ابن ماجہ اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ نیل الاوطار جلد ۹/ ۱۶۷ میں بھی ہے کہ اسے ترمذی، نسائی اور حاکم نے تخریج کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ روایت اس سند کے علاوہ دیگر سندوں سے بھی مروی ہے جنھیں میں نے الجزء المفرد میں جمع کیا ہے۔

اور اس طرح کے کئی لوگ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر خلوص ہے لیکن وہ مرجوح عمل میں مصروف ہیں اور راجح کو چھوڑے ہوئے ہیں ادنیٰ کام میں منہمک اور افضل سے بے نیاز ہیں اور بسا اوقات ایک ہی کام ایک وقت میں افضل ہوتا ہے تو دوسرے موقع پر ادنیٰ، ایک وقت میں راجح ہوتا ہے تو دوسرے موقع پر مرجوح لیکن یہ لوگ علم وتفقہ کی قلت کی وجہ سے ان دو اوقات اور دو حالتوں میں فرق نہیں کر سکتے۔

میں نے ایسے مسلمانوں کو بھی دیکھا ہے جو بزعم خویش پرہیزگار ومتقی ہیں کہ وہ ایسے شہروں میں مساجد کی تعمیر کے لیے پانچ پانچ، دس دس لاکھ چندہ دے دیتے ہیں جہاں یہ شہر مساجد سے بھرے پڑے ہیں جب کہ انھی صاحبان سے اگر آپ اسلام کی دعوت وتبلیغ، کفر والحاد کے مقابلہ یا اللہ کا حکم نافذ کرنے کے لیے کسی اسلامی کام میں معاونت وتائید یا ایسے ہی بڑے بڑے منصوبے جہاں افرادی قوت تو ہے لیکن مال وثروت مفقود ہے ان کاموں کے لیے ان لوگوں سے اتنی رقم یا اس کا نصف یا نصف کا بھی نصف مانگیں تو مجال ہے وہ اس پر کان دھریں یا امید بھرا جواب دیں، یہ لوگ پتھروں کی تعمیر پر تو ایمان رکھتے ہیں لیکن انسانوں کی تعمیر ان کے نزدیک ذرہ بھر اہمیت نہیں رکھتی۔

حج کے موسم میں ہر سال خوشحال لوگوں کی بہت بڑی تعداد نفلی حج کرنے کی خواہش لیے وہاں جمع ہوتی ہے، بہت سے ایسے بھی ہیں جو رمضانُ المبارک میں اضافی عمرہ کر رہے ہوتے ہیں اور اس کام میں وہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں، اور اپنے خرچ پر فقراء کو بھی ساتھ لاتے ہیں، حالانکہ اللہ نے ان فقیر لوگوں کو حج کرانے کی ذمہ داری ان پر نہیں ڈالی، جب کہ سالانہ خرچ ہونے والی صرف یہی رقم ان سے عیسائی مشنری سرگرمیوں کے توڑ یا اشتراکی قوتوں سے جہاد میں خرچ کرنے کا مطالبہ کریں تو وہ فوراً سر ہلاتے ہوئے نفی میں جواب دیں گے۔ اور اس وقت وہ انکار کی روش ہی اختیار نہیں کیے ہوں گے بلکہ قابل مذمت تکبرانہ حرکت کا بھی مظاہرہ کریں گے۔

قرآنِ حکیم میں وضاحت کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ جہاد اور اس سے متعلقہ افعال واعمال حج اور اس کے متعلقات سے افضل ہیں، اس کے باوجود اہل خیر مذکورہ بالا روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ. يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ. [التوبہ:۱۹-۲۱]

''کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اُس شخص کے کام کے برابر ٹھہرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں تو اُنھی لوگوں کا درجہ ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا، وہی کامیاب ہیں۔ اُن کا رب انھیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لیے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

ان لوگوں کے حج اور عمرے تو نفلی ہیں جب کہ کفر و الحاد، استعماریت و اشتراکیت اور اس نظریہ کو تقویت دینے والی داخلی و خارجی قوتوں سے جہاد، کرنے کا اصل کام اور دورِ حاضر کا انتہائی اہم فرض ہے۔

مَیں نے یونیورسٹیوں اور کالجوں میں میڈیکل، انجینئرنگ، ایگریکلچر، لٹریچر اور سائنس و ریسرچ کے ایسے طلبہ کو دیکھا ہے جن کے خلوص میں کوئی شک نہیں اور وہ اپنے تعلیمی شعبوں میں محض کامیابی ہی حاصل نہیں کرتے بلکہ نمایاں پوزیشنیں لیتے ہیں، وہ دعوت و تبلیغ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر کے بخوشی اپنی ان تعلیم گاہوں کو خیرباد کہہ دیتے ہیں حالانکہ تحقیق و تدقیق میں ان کا یہ کام فرضِ کفایہ ہے اور اگر اس فرض میں کوتاہی رہ گئی تو اس کا گناہ ساری امت مسلمہ کے سر ہو گا۔ نیت درست ہو اور حدودُ اللہ کا خیال رکھا جائے تو یہی تحقیق و جستجو ان لوگوں کے لیے عبادت و جہاد بن جائے گی۔

اگر ہر کوئی اپنا پیشہ ترک کر دے تو مسلمانوں کی ضروریات کون پوری کرے گا؟ نبی کریم ﷺ

مبعوث ہوئے تو آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مختلف پیشوں سے وابستہ تھے۔ آپؐ نے ان میں سے کسی سے بھی پیشہ چھوڑ کر دعوت کے لیے مخصوص ہو جانے کا مطالبہ نہیں کیا۔ ان میں سے ہر کوئی ہجرت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی کام اور پیشے سے منسلک رہا، جب پکارنے والے نے جہاد کے لیے پکارا تو وہ اپنے مال و جان کے ساتھ ہلکے، اور بوجھل، ہر حال میں اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

امام غزالیؒ نے تو اپنے زمانہ میں جب اکثر طلبہ کو فقہ اور اس جیسے دیگر علوم کی تعلیم حاصل کرتے پایا تو اسے ناپسند کیا، اس لیے کہ اس وقت مسلمانوں کے شہر میں یہودی یا عیسائی ڈاکٹر کے سوا کوئی اور ڈاکٹر نہیں تھا اور سب مسلمان مرد اور عورتیں علاج کے لیے اسی پر انحصار کرتے تھے اور مجبوراً اپنے نفسانی اور پوشیدہ راز اس کے سامنے بیان کرتے تھے۔

میں نے تو کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جنھوں نے جزوی اور اختلافی مسائل پر معرکے برپا کر رکھے ہیں لیکن اسلام کو ختم کر ڈالنے کے خواہش مندوں، اس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف لوگوں، اس کے خلاف منصوبہ سازوں اور کینہ پرور دشمنوں کا عظیم معرکہ ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

حتیٰ کہ میں نے امریکہ و کینیڈا اور یورپ میں ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جن کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ گھڑی کہاں باندھی جائے؟ دائیں ہاتھ پر یا بائیں ہاتھ پر؟

قمیص اور پتلون کی جگہ سفید لباس پہننا سنت ہے یا واجب؟

عورت کا مسجد میں جانا حلال ہے یا حرام؟

میز پر کھانا، کرسی پر بیٹھ کر کھانا، چھری کانٹے کا استعمال کرنا کفار سے تشبیہ کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں؟

ایسے ہی بے شمار مسائل وقت کا ضیاع اور اجتماعیتوں کا شیرازہ بکھیرنے کا سامان ہیں۔ فرقہ بندی کو ہوا دینے اور صلاحیتوں کو ضائع کرنے کا باعث ہیں کیوں کہ یہ بے مقصد کوششیں اور ایسا جہاد ہے جو کسی دشمن سے نہیں ہو رہا بلکہ آپس میں ہی ایک دوسرے کی گردن ماری جاتی ہے۔

میں نے ایسے نوجوان بھی دیکھے ہیں جو باپ کے ساتھ سخت اور ماں کے ساتھ درشت رویہ

رکھتے ہیں اور بہنوں کے ساتھ تشدد آمیز سلوک کرتے ہیں۔ان کا موقف ہے کہ وہ دین سے برگشتہ اور اللہ کے نافرمان ہیں۔ یہ نوجوان اس بات کی ذرا پروانہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے تو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی ہے،خواہ وہ دونوں مشرک ہوں اور اولاد کو مشرک بنانے کے لیے اور اسے اسلام سے پھیر دینے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے ہوں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا.[لقمان:۱۵]

”اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان اور دنیا میں اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔“

والدین کی اس کٹر جدوجہد کے باوجود جسے قرآن نے ”مجاهده على الشرک“ سے تعبیر کیا ہے،حکم یہ دیا ہے کہ ان دونوں کے ساتھ اچھا سلوک اور رویہ رکھو، کیوں کہ والدین کا حق سب سے برتر ہے سوائے اللہ عزوجل کے!اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے:

أَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ. [لقمان:۱۴]

”(ہم نے اُس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔“

رہی بات شرک کے معاملے میں والدین کی اطاعت کی تو قرآن نے اس سے انکار کا کہا ہے کیوں کہ خالق کی نافرمانی مول لے کر مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔رہ گیا معاملہ ان کے ساتھ اچھے برتاؤ اور بہترین سلوک کا تو اس سے مفر نہیں، اس سے پہلو تہی اختیار کی جائے تو کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔

ہم نے ایسے مخلص لوگ بھی دیکھے ہیں جو ایسے کاموں کو شریعت بنانے میں مگن ہیں جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ وہ ایسی چیزوں کو حرام کر رہے ہیں جنھیں اللہ اور اس رسولؐ نے حرام نہیں ٹھہرایا۔وہ ایسے کام کرنے کا کہتے ہیں جن کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے نہیں دیا،اور غیر شرعی طریقوں سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں بلکہ اپنی خواہشات اور خود ساختہ جدید طریقوں کے مطابق عبادت کر رہے ہیں۔

اس بارے میں انھوں نے جو کچھ سوچ رکھا ہے اس میں ان کا محرک و سفارشی ان کی نیک نیتی، پاک طینتی اور تقربِ الٰہی کے لیے سچا جذبہ ہے، لیکن ان کا یہ خیال غلط ہے کہ ان کا یہ عملِ صالح اللہ کے ہاں مقبول و ماجور ہے۔

عمل کا اچھا ہونے کے لیے نیت کا اچھا ہونا اور جذبۂ اخلاص سے مالا مال ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ یہاں تو ضروری ہے کہ جو کام کیا جا رہا ہے اس کا حکم اللہ یا اس کے رسولؐ کی طرف سے ملا ہو اور اس پر شریعت کی مہر لگی ہو۔

اللہ زاہدِ شب زندہ دار عالم فضیل بن عیاض پر رحم فرمائے جنھوں نے بڑی جامع اور واضح عبارت سے اس مفہوم کو بیان کیا ہے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ آیت الٰہی: اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا میں بہترین عمل سے کیا مراد ہے تو انھوں نے فرمایا: بہترین عمل وہ ہے جو سب سے زیادہ خالص اور سب سے زیادہ صائب ہو۔

لوگوں نے پوچھا: ابوعلی! سب سے زیادہ خالص اور سب سے زیادہ صائب سے کیا مراد ہے؟

انھوں نے جواب دیا: عمل جب خالص ہوگا لیکن صواب (درست) نہ ہوگا تو وہ اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہوگا۔ اور اگر صواب (درست) ہوگا لیکن خالص نہ ہوگا تب بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔ عمل کی قبولیت کے لیے شرط ہے کہ خالص بھی ہو اور صواب بھی ہو۔

خالص کا مطلب یہ کہ محض اللہ کے لیے ہو

صواب کا مطلب یہ کہ سنت رسول کے مطابق ہو[۱۹]

عبادت پر علم کی فضیلت

ہمیں معلوم ہے کہ اسلام پہلا دین ہے جس نے معروف اسلامی شعائر نماز، روزہ اور حج وغیرہ کی نفلی ادائیگی کے مقابل علم، اس کے حصول اور اس میں گہرائی در گہرائی تک جانے کو افضل قرار دیا ہے، حالانکہ بڑی وضاحت کے ساتھ قرآن نے یہ اعلان کیا ہے کہ انسان و جن دونوں مخلوقات کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ [الذّٰریات:۵۶]

۱۹- دیکھیے: مصنف کی کتاب ''العبادۃ فی الاسلام''، فصل ''لایُعبدُ اللّٰہُ اِلَّا بِمَا شَرَعَ: ص ۱۶۵-۱۷۴

''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

مگر عبادت علم کے بغیر ہو تو اس عمارت کی مانند ہے جس کی بنیاد ہی نہ ہو۔ یہ علم ہی ہے جو عبادت کے ارکان و شرائط اور اس کے ظاہری آداب و باطنی اسرار کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ بات بھی علم ہی بتاتا ہے کہ کون سی چیزیں نماز کو صحیح و مکمل کرتی ہیں اور کون سی باطل و ناقص بناتی ہیں۔

یہ علم ہی ہے جس کا جاننے والا اشیاء کے مراتب اور اعمال کے درجات کی معرفت رکھتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ نفل و فرض، اہم وغیر اہم اور اصل و فرع کا فرق جان لیتا ہے۔ پھر وہ نفل کو فرض پر مقدم نہیں کرتا۔ غیر اہم کو اہم پر ترجیح نہیں دیتا۔ اور فرع کی خاطر اصل کو ضائع نہیں کرتا۔ علمائے سلف نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی ہے: ''اللہ تعالیٰ اس وقت تک نفل کو قبول نہیں کرتا جب تک آدمی فرض ادا نہیں کرتا۔''

ان بزرگوں کا ہی قول ہے: ''جو فرض کی ادائیگی میں مشغول رہا اور اس کے نفل چھوٹ گئے تو اسے معذور سمجھا جائے گا لیکن جو نفل کی ادائیگی میں مشغول رہ کر فرض کی ادائیگی سے محروم رہا اسے مغرور سمجھا جائے گا۔''[۲۰]

یہ بھی علم کی فوقیت کی علامت ہے کہ بڑی بڑی عبادات کا فائدہ اس کے کرنے والے تک ہی محدود ہوتا ہے۔ نمازی و روزہ دار، حاجی و عمرہ گزار اور ذاکر و تسبیح دار کی نیکیاں کم ہوتی ہیں جب کہ عمل زیادہ ہوتا ہے، ہاں اس کے اپنے درجات ضرور بلند ہوتے ہیں لیکن معاشرے کو براہِ راست اس کی عبادات سے کچھ نہیں پہنچتا جو لوگوں کے لیے نفع کو یقینی بنائے اور نقصان سے

۲۰۔ ہم نے بعض لوگ دیکھے ہیں جو سوموار اور جمعرات کا نفلی روزہ رکھتے ہیں اور پھر اپنے روزانہ کے ان فرائض منصبی سے کنی کتراتے ہیں جن پر وہ معاوضہ وصول کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی دلیل اور عذر یہ بات ہوتی ہے کہ وہ روزے سے تھکاوٹ کا شکار ہیں۔ یا پھر ایسے لوگ اپنے خاندان یا سوسائٹی کے فرائض کی ادائیگی میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔
ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو ہر سال حج یا عمرہ تو کرتے ہیں لیکن اپنے قرضہ جات کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں۔ یا پھر اپنے ملازمین اور مزدوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ یا سودی کاروبار کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح کی بیشتر خامیاں یا عملی کوتاہیاں دین سے اس کی ناواقفیت کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔

بچانے کی گارنٹی دے۔ دوسری طرف علم کے فوائد صرف اس سے متعلق آدمی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے علاوہ لوگوں میں سے ہر وہ شخص جو اس کے علم کی کوئی بات سنے گا یا پڑھے گا اسے اس سے نفع حاصل ہوگا، خواہ علم رکھنے والے شخص اور اس سننے پڑھنے والے شخص کے درمیان پہاڑ و میدان اور سمندر وصحرا ہی کیوں نہ حائل ہوں۔

علم تو فاصلوں، رکاوٹوں اور حدود وقیود سے نا آشنا ہے۔ خصوصاً آج کے دور میں تو سماعی علم چند ثانیوں میں بلکہ ایک ہی لحہ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہو رہا ہے اور سننے اور دیکھنے والے دنیا کے دور دراز علاقوں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہی حال کتابی علم کا ہے۔ یہ بھی جدید طباعتی ذریعوں سے دنوں میں بلکہ گھنٹوں میں آفاق عالم کے کونے کونے میں پھیل رہا ہے۔

یہ کوئی تعجب وحیرت کی بات نہیں۔ حضرت ابوامامہؓ روایت کرتے ہیں:

ذُکِرَ لِلنَّبِیِّ رَجُلَانِ، اَحَدُھُمَا عَالِمٌ وَالآخَرُ عَابِدٌ فَقَالَ علیہ الصلوٰۃ والسلام: فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِیْ عَلٰی اَدْنَاکُمْ[۲۱]

”نبیؐ کے سامنے دو آدمیوں کا ذکر ہوا، ان میں سے ایک عالم تھا دوسرا عابد، تو رسولؐ نے فرمایا کہ عالم کی فضیلت و برتری عابد پر ایسے ہے جیسے تم میں سے ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔“

حضرت حذیفہؓ بن یمان آپؐ سے روایت کرتے ہیں:

فَضْلُ الْعِلْمِ خَیْرٌ مِنْ فَضْلِ الْعِبَادَۃِ[۲۲]

”علم میں فضیلت و برتری حاصل کرنا عبادت میں فضیلت و برتری حاصل کرنے سے بہتر ہے۔“

حضرت ابودرداءؓ کی یہ حدیث پیچھے گزر چکی ہے کہ:

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِ الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ عَلٰی سَائِرِ الْکَوَاکِبِ

۲۱۔ ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور کہا ہے حدیث حسن صحیح ہے جیسا کہ ترغیب میں حدیث ۱۳۰ ہے۔

۲۲۔ اسے طبرانی اور بزار نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے/ ترغیب ۱۰۲ مجمع الزوائد ج ۱/ ۱۲۰ میں کہا ہے کہ اس کی سند میں عبداللہ بن عبدالقدوس ہے لیکن امام بخاری اور ابن حبان نے اسے ثقہ کہا ہے اور ابن معین نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

''ایک عالم کی عابد پر فضیلت اس طرح ہے جس طرح چودھویں رات کے چاند کی برتری دوسرے ستاروں پر ہوتی ہے۔''

یہ علم کی فضیلت کی ہی علامت ہے کہ وہ انسان کی زندگی ختم ہو جانے کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتا اور نہ اہل علم کے مرجانے سے علم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی آدمی نماز پڑھے، روزہ رکھے، زکوٰۃ دے، حج وعمرہ کرے، اللہ کی تسبیح وتہلیل اور کبریائی بیان کرے تو یقیناً اس عبادت کا اسے عظیم اجر ملے گا۔ لیکن اس اجر کی مدت، عمل کرنے والے کے عمل جاری رکھنے یا اس سے فارغ ہونے تک ہی ہے، بعد میں کوئی اجر وثواب نہیں ملتا۔ لیکن علم ایسی چیز ہے کہ جب تک لوگ اس سے مستفید ہوتے رہیں گے اس کا اثر و اجر اس وقت تک باقی اور جاری رہے گا۔ خواہ برس گزر جائیں یا صدیاں بیت جائیں۔

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ اِنْقَطَعَ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ[۲۳]

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن تین چیزیں ایسی ہیں جن سے اسے اجر وثواب پہنچتا رہتا ہے: صدقۂ جاریہ، علم جو لوگوں کے لیے نفع بخش ہو اور صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔''

آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے:

اِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ: عِلْمًا عَلِمَهُ وَنَشَرَهُ وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ أَوْ مُصْحَفًا وَرِثَهُ أَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ أَوْ بَيْتًا لِّابْنِ السَّبِيْلِ بَنَاهُ أَوْ نَهْرًا أَجْرَاهُ أَوْ صَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِيْ صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ، تَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ[۲۴]

۲۳- اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

۲۴- ابن ماجہ نے اسے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ نے انھی الفاظ کے ساتھ اپنی صحیح میں اسے روایت کیا ہے، اس میں نَهْرًا أَجْرَاهُ کی جگہ نَهْرًا اَكْرَاهُ کے الفاظ ہیں۔ الترغیب ۱۲۳

''مؤمن کی موت کے بعد اس کے اعمال اور حسنات میں مندرجہ ذیل چیزیں اس کے لیے اجر کا باعث بنتی ہیں: علم جو اس نے سیکھا اور دوسروں تک پھیلایا۔ صالح بیٹا جو اس کے پیچھے رہ گیا۔ قرآن مجید جو اس کی وراثت ہو۔ مسجد جو اس نے بنائی ہو۔ مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے بنایا ہوا گھر۔ کوئی نہر جو اس نے کھدائی ہو۔ صدقہ جو اس نے اپنی زندگی میں بحالت صحت اللہ کی راہ میں دیا ہو۔ یہ تمام چیزیں اس کے مرجانے کے بعد بھی اس کے لیے اجر وثواب کا باعث بنتی ہیں۔''

اس اعتبار سے ایک عالم اپنی محدود عمر کے بعد ایک طویل عمر زندہ رہتا ہے۔ خصوصاً تصنیف وتالیف کے باعث تو یہ عمر اور طویل ہو جاتی ہے، کیوں کہ کتاب زیادہ دیر باقی رہتی ہے اور اس کے اثرات بھی اسی قدر دیر پا ہوتے ہیں۔

کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ہم علمائے سابقین سے مستفید ہوتے ہیں تو ان کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں، حالانکہ ہمارے اور ان کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہو چکا ہے۔

یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں: ایک دن مامون الرشید نے کہا: بہترین درجے کے لوگ کون ہیں؟

میں نے کہا: امیر المومنین جس مرتبہ پر آپ ہیں۔

اس نے کہا: تو کیا مجھ سے بہتر کے بارے میں بھی جانتے ہو؟

میں نے کہا: نہیں!

اس نے کہا: لیکن میں جانتا ہوں۔ مجھ سے بہتر وہ شخص ہے جو کہتا ہے: حَدَّثَنَا فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ

میں نے کہا: اے امیر المومنین! کیا ایسا شخص آپ سے بہتر ہے جب کہ آپ تو رسول اللہ ﷺ کے چچازاد اور مؤمنوں کے ولی عہد ہیں؟

اس نے کہا: تُو ہلاک ہو جائے، وہ مجھ سے بہتر ہے، اس لیے کہ اس کا نام رسول اللہ ﷺ کے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ وہ کبھی مر نہیں سکتا جب کہ ہم مر جائیں گے اور فنا ہو جائیں گے لیکن جب تک زمانہ باقی ہے علماء بھی باقی رہیں گے۔ (۲۵)

۲۵- ابن قیمؒ نے اس واقعہ کو ''مفتاح دار السعادۃ'' ج ۱/ ۱۶۵ میں ذکر کیا ہے۔

حضرت علیؓ نے کمیل بن زیاد سے جو کلمات کہے ہیں وہ تو عجب شانِ بلاغت رکھتے ہیں:

''علم مال سے بہتر ہے۔ علم تیری حفاظت کرتا ہے جب کہ مال و دولت کی تجھے حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے جب کہ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم!''

علم، عالم کو اس کی زندگی میں طمانیتِ قلب عطا کرتا ہے اور موت کے بعد لوگوں میں اس کا بہترین تذکرہ چھوڑتا ہے، جب کہ مالی صنعت مال کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے، مال کے خزانچی تو زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہوتے ہیں لیکن علماء اس وقت تک زندہ ہیں جب تک زمانہ باقی ہے۔ دنیا میں ان کا وجود مفقود ہے مگر لوگوں کے دلوں میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ (۲۶)

علم میں مشغول رہنا سب سے بہتر نفلی عبادت ہے

اوپر مذکورہ احادیث اور اس معنی کی دیگر احادیث اور علم کی فضیلت میں وارد معروف ومشہور احادیث کی بنا پر ان تمام نفلی عبادتوں میں سب سے بہتر شمار کیا ہے جن کو قرب الٰہی کے حصول کے لیے ادا کیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں: ''درس [پڑھنا، علم حاصل کرنا] نماز ہے۔''

حضرت ابوالدرداؓ کہتے ہیں: ''ایک ساعت علمی گفتگو میں مصروف رہنا پوری رات کے قیام سے افضل ہے۔''

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: ''ایک گھڑی بیٹھ کر دین کی فقہ حاصل کرنا میرے لیے ساری رات جاگنے سے زیادہ عزیز ہے۔''

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: ''علم کا ایک باب جو آدمی اپنے نفس کی اصلاح اپنے بعد والوں کے علاج کی خاطر یاد کرے، ایک سال کی عبادت سے افضل ہے۔''

امام سفیان ثوریؒ کہتے ہیں: 'فرائض کے بعد علم سے افضل کوئی عبادت نہیں۔''

۲۶- ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ ابو نعیم نے اس کو حلیہ میں بیان کیا ہے۔ ابوبکر خطیب کہتے ہیں کہ الفاظ کے اعتبار سے یہ احسن اور اشرف احادیث میں سے ہے۔ مفتاح دار السعادۃ: ج ۱/۱۲۳

انھی کا کہنا ہے: ''میں آج کے دور میں کسی چیز کو حصولِ علم سے افضل نہیں سمجھتا۔ ان سے کہا گیا کہ لوگ تو اس کی نیت وارادہ ہی نہیں کرتے۔ انھوں نے جواب دیا: اس کا حصول ارادہ و نیت ہی تو ہے۔''

ابن وہبؒ کہتے ہیں: میں مالک کے پاس بیٹھا ان سے سوال کر رہا تھا، پھر اپنی کتابیں اکٹھی کر لیں تاکہ جاؤں۔ مالک نے کہا: کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا: نماز کے لیے جلدی جانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا جس کام میں آپ مشغول ہیں یہ بھی نماز سے کم نہیں ہے اگر آدمی کی نیت صحیح ہو۔''

امام زہریؒ کہتے ہیں: ''فقیہ کی مانند کوئی اللہ کی عبادت نہیں کر سکتا۔''

مطرف بن عبداللہ بن شخیرؒ کہتے ہیں: ''مجھے علم سے کچھ حصہ مل جائے تو میرے لیے یہ عبادت سے حصہ ملنے سے بہتر ہے۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں: ''علم کا حصول نفل نماز سے افضل ہے۔

امام شافعیؒ کی طرح ہی امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام سفیانؒ سے بیان کیا گیا ہے کہ علم تمام نفلی عبادتوں پر فضیلت رکھتا ہے۔ (۲۷)

یہ ان لوگوں کی آراء ہیں جو فقہ کے امام ہیں اور ان کے مذاہب کی پیروی کی جاتی ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علم اور عبادت کی ایک دوسرے پر برتری کا مفہوم فرض علم اور فرض عبادت کے درمیان نہیں، نہ نفلی علم اور فرض عبادت کے درمیان ہے۔ یہ فضیلت و برتری دو لازمی فرائض کے درمیان ہرگز نہیں۔

لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی آدمی فرض عبادت مثلاً نماز کی بروقت ادائیگی و محافظت سے پہلو تہی کرے خواہ وہ حصولِ علم میں ہی مشغول ہو۔ اسی طرح کوئی صاحب علم اپنے لیے یا دوسروں کے لیے یہ جواز پیدا نہیں کر سکتا کہ وہ فرائض کی ادائیگی سے لاپروائی برت سکتا ہے۔

محقق ابن قیمؒ کی نقل کردہ حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث کی رو سے ہم ایسا نہیں کر سکتے۔

۲۷۔ دیکھیے ابن عبدالبر کی ''جامع بیان العلم'': ج ۱/ ۲۵ باب تفضیل العلم علی العبادۃ۔

ان کا کہنا ہے: فَضْلُ العِلْمِ خَيْرٌ مِنْ نَفْلِ العَمَلِ ''کہ علم کی فضیلت نفلی عمل کے مقابلے میں زیادہ ہے۔''

ابن قیمؒ کہتے ہیں: یہ حدیث اس مسئلہ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا جب علم و عمل دونوں فرض ہوں تو لامحالہ دونوں کی ادائیگی ضروری ہے۔ جیسے نماز و روزہ۔ جب دونوں زائد ہوں، یعنی نفل کے زمرے میں آتے ہوں تو پھر علم اور نفلی علم کی فضیلت عبادت اور نفلی عبادت سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ علم اپنے جاننے والے کو ہی نہیں عام لوگوں کو بھی فائدہ دیتا ہے جب کہ عبادت اس کے کرنے والے تک ہی محدود ہوتی ہے۔ اور علم کے فوائد تو دیر تک باقی رہتے ہیں۔

جہاد پر علم کی فضیلت

عبادت پر علم کی فضیلت کے ضمن میں ہی جہاد پر بھی علم کی فضیلت ثابت ہو جاتی ہے۔ جہاد...... جسے اسلام کی بلند چوٹی قرار دیا گیا ہے اور قرآنِ حکیم اور احادیثِ رسولؐ میں اس کی بہت زیادہ فضیلت بیان کی گئی ہے۔

جلیل القدر صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو علم کا سمندر اور ہدایت کا چراغ تھے، فرماتے ہیں:

''اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، جو لوگ راہِ حق میں قتل ہو کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے وہ اللہ کے ہاں علمائے کرام کا اعزاز و اکرام دیکھ کر خواہش کریں گے کہ کاش اللہ انھیں علماء کی حیثیت سے اٹھاتا۔''(۲۸)

عظیم مربی و داعی اور فقیہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: ''علماء کے قلم میں استعمال ہونے والی سیاہی اور شہداء کا راہِ حق میں بہنے والے خون کا وزن کیا جائے گا تو علماء کی سیاہی والا پلڑا اوزنی ہوگا۔''

یہ علم ہی ہے جس کے طفیل جہاد کی فضیلت ہمیں معلوم ہوئی ہے اور اس کی شرائط و حدود بھی عالم نے ہی بیان کیے ہیں۔

شرعی جہاد اور غیر شرعی قتال کا فرق بھی علم نے ہی واضح کیا ہے۔ یہ چیز بھی علم ہی بتاتا ہے

۲۸- مفتاح دار السعادۃ ج۱/۱۲۱

کہ کس وقت جہاد فرض اور کس وقت نفل ہوتا ہے۔

جہاد میں کون سی چیز فرض کفایہ اور کون سی فرضِ عین ہے، یہ حد بندی بھی علم ہی کرتا ہے۔

کتنے ہی مسلمان ایسے تھے جو بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر آپ کی معیت میں جہاد کے لیے اذن طلب کرتے ہیں تو رسولِ کریم ﷺ انھیں جہاد کی اجازت نہیں دیتے، اس لیے کہ آپؐ جانتے تھے کہ انھوں نے ایک ''واجب'' کو ترک کر رکھا ہے جو جہاد سے زیادہ اہم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَاسْتَأْذَنَهُ فِيْ الْجِهَادِ، فَقَالَ أَحَيٌّ وَالِدَاکَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَفِيْهِمَا فَجَاهِدْ[۲۹]

''ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور جہاد کی اجازت مانگی، آپؐ نے پوچھا: کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: تیرا جہاد انھی میں ہے۔ (یعنی ان کی خدمت کر)۔'' ایک دوسری جگہ روایت میں ہے:

أَنَّ الرَّجُلَ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، جِئْتُ أُرِيْدُ الْجِهَادَ مَعَکَ وَلَقَدْ اَتَيْتُ وَ اِنَّ وَالِدَيَّ يَبْكِيَانِ، قَالَ: فَارْجِعْ اِلَيْهِمَا فَأَضْحِكْهُمَا كَمَا أَبْكَيْتَهُمَا[۳۰]

''ایک آدمی آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں لیکن جب میں گھر سے نکلا تو میرے والدین رو رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: واپس چلے جاؤ جس طرح والدین کو رلایا ہے اسی طرح انھیں ہنساؤ۔''

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

اَنَّ رَجُلًا هَاجَرَ اِلَى النَّبِيِّ مِنَ الْيَمَنِ، فَقَالَ: هَلْ لَکَ أَحَدٌ بِالْيَمَنِ؟

۲۹۔ ''منتقیٰ'' میں ہے کہ اسے بخاری، نسائی، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔

۳۰۔ منتقیٰ میں ہے، اسے احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، ''نیل الاوطار'' میں ہے اسے نسائی و ابن ماجہ نے بھی تخریج کیا ہے اور مسلم نے سعید بن منصور سے ایک دوسرے طریق سے تقریباً یہی واقعہ روایت کیا ہے۔

فَقَالَ: اَبَوَایَ، فَقَالَ أَذِنَا لَکَ؟ فَقَالَ: لَا، قَالَ اِرْجِعْ اِلَیْھِمَا فَاسْتَأْذِنْھُمَا. فَاِنْ اَذِنَا لَکَ فَجَاھِدْ، وَاِلَّا فَبِرَّھُمَا. (۳۱)

''ایک آدمی یمن سے ہجرت کر کے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں (جہاد کے لیے) حاضر ہوا تو آپؐ نے اس سے پوچھا کیا یمن میں تیرا کوئی عزیز ہے؟ اس نے کہا ہاں! میرے والدین ہیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا انھوں نے تجھے (جہاد کی) اجازت دی ہے۔ اس نے کہا نہیں! آپؐ نے فرمایا: پھر آپ واپس جاؤ اور ان سے اجازت لو، اگر وہ اجازت دے دیں تو جہاد کرو ورنہ ان کی خدمت کرو۔''

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک آدمی غزوہ میں شریک ہونے کے لیے آپؐ سے مشورہ کرنے کے لیے آیا تو آپؐ نے اس سے دریافت کیا:

هَلْ لَکَ مِنْ أُمٍّ؟ قَالَ نَعَمْ، فَقَالَ: اَلْزِمْھَا فَاِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلَیْھَا (۳۲)

''کیا آپ کی والدہ زندہ ہے؟ آدمی نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا: اس کی خدمت میں لگے رہو جنت اس کے قدموں میں ہے۔''

ان احادیث سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ جہاد کے لیے والدین سے اجازت لینا واجب ہے۔ اس بنا پر جمہور علماء نے اس وقت جہاد کو قطعاً حرام قرار دیا ہے جب والدین میں سے کوئی ایک بھی اس سے منع کر دے، اس لیے کہ ان کی اطاعت و خدمت فرضِ عین ہے اور جہاد فرضِ کفایہ ہے لیکن جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تو پھر اجازت کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کا ترک کرنا اللہ کی نافرمانی ہے اور اللہ کی نافرمانی اختیار کر کے مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔

اجازت لینے کی یہ شرط اس وقت عائد ہوتی ہے جب والدین مسلمان ہوں، کیوں کہ کافر والدین تو کبھی بھی اپنے دین کی تذلیل کے لیے نصرت اسلام کی خاطر جہاد کی اجازت نہیں دیں گے۔

یہ تمام حدود اور باریک فرق علم سے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ جو آدمی علم سے بے نیاز ہو کر

۳۱- ابوداود نے اسے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے، جیسا کہ ''نیل الاوطار'' میں ہے۔

۳۲- اسے نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے، اور اسے صحیح الاسناد کہا ہے: الترغیب/۳۵۹۱

جہاد میں مشغول ہو جائے تو اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ وہ جلد کوئی خطا کر بیٹھے یا راہِ راست سے منحرف ہو جائے اور اسے معلوم بھی نہ ہو۔

تاریخ میں کتنے لوگ ہیں جنھوں نے اپنے کندھوں پر تلواریں اٹھا رکھی تھیں اور ان لوگوں سے مصروفِ قتال تھے جن کا خون اور مال اللہ نے محفوظ کر دیا تھا۔ ان لڑنے والوں کا خیال یہ تھا کہ وہ جہاد کر رہے ہیں، اسی جوش میں انھوں نے کئی مسلمانوں کو قتل کر ڈالا اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ مسلمان نہیں مشرک ہیں۔ اس انتہا کو پہنچنے والے یہ لوگ ''خوارج'' تھے جن کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ نے کہا ہے اور ابن تیمیہؒ نے بھی ان کی تائید کی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی مذمت میں دس سندوں سے صحیح حدیث روایت کی گئی ہے۔

ان لوگوں نے اس قدر شدت اس لیے اختیار کی کہ انھوں نے سیکھنے سے پہلے عبادت شروع کر دی۔ عقل و شعور سے کام لیے بغیر جہاد میں پڑ گئے اور علم حاصل کرنے سے پہلے عمل کے پیچھے لگ گئے۔ اس طرح ان کی کوشش اکارت گئی اور وہ یہی خیال کرتے رہے کہ وہ نیکی میں مصروف ہیں۔

فَضَلَّ سَعْيُهُمْ وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا [الکھف:۱۰۴]

'جن کی ساری سعی و جہد براہِ راست بھٹکی رہی اور سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔''

آج کے دور میں کتنے نوجوان ایسے ہیں جنھوں نے سینوں کی جرأت و بہادری اور سروں میں علم کی کمی اور اپنی رائے کی خوشنمائی کے باعث امت کو رافضی اور جمہور علماء کو کافر بنا ڈالا۔ اسلامی ملکوں کو دارالاسلام کے بجائے دارالکفر کہہ ڈالا۔ ان لوگوں نے ایسی چیزوں کو حلال کر دیا جو اللہ نے حرام قرار دی ہیں اور ایسے کاموں کو ساقط کر دیا جو اللہ نے واجب ٹھہرائے ہیں۔

یہ لوگ اس المناک صورتِ حال تک اس لیے پہنچے کہ انھوں نے متشابہ نصوص کی پیروی شروع کر دی۔ من مانی تاویلیں اور نئے فتنے تلاش کرنا شروع کر دیے۔

کاش! یہ لوگ کچھ سیکھ لیتے، کچھ سمجھ بوجھ پیدا کر لیتے، تو علم انھیں ان کی حدود سے تجاوز نہ کرنے دیتا اور انھیں جہاد کی حقیقت سے آشنا کرتا کہ جہاد کب ہونا چاہیے؟ کیسے ہونا چاہیے؟ کس سے ہونا چاہیے؟

حضرت حسن بصریؒ اسی بات کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"علم کے بغیر عمل کرنے والا بے راہ مسافر کی مانند ہے۔ علم کے بغیر عمل کرنے والا اکثر ان چیزوں کو غلط کرتا ہے جو صحیح ہوتی ہیں۔ علم اس طرح حاصل کرو کہ عبادت متاثر نہ ہو۔ علم کو ترک کر کے ایک قوم نے عبادت کو اس قدر اختیار کر لیا کہ تلواریں نکال کر امت محمدؐ پر ہی چلانا شروع کر دیں، کاش! وہ علم حاصل کر لیتے تو علم انھیں ایسا کرنے کی اجازت نہ دیتا۔"(۳۳)

اسلام نے جس جہاد کا حکم دیا ہے وہ محض جہاد بالسیف ہی نہیں ہے بلکہ دل و زبان اور حجت و بیان کے ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم ہے، یعنی جہاد بالعلم۔ اس جہاد کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں موجود ہے:

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا. [الفرقان:۵۲]

"پس اے نبیؐ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔"

قرآن نے اس جہاد کو صرف "جہاد" ہی نہیں کہا بلکہ جِهَادًا كَبِيْرًا (بہت بڑا جہاد) کہا ہے۔ اور یہ حکم اس وقت کا ہے جب آپؐ ابھی مکہ میں تھے اور قتال کی ابھی اجازت نہیں ملی تھی۔

اس جہاد سے مراد منافقین سے جہاد ہے، جیسا کہ سورۃ توبہ کی آیت ۷۳ اور سورۂ تحریم کی آیت ۹ میں فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ.

"اے نبیؐ! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔"

کفار سے جہاد کرنا ہاتھ کے ساتھ مخصوص ہے اور منافقین سے جہاد زبان کے ساتھ مخصوص ہے، لہٰذا ہمیں اس حدیث پر تعجب نہیں ہونا چاہیے جس میں کہا گیا ہے کہ حصول علم کے لیے نکلنے والا جب تک واپس نہیں آ جاتا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے۔

مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ(۳۴)

۳۳- مفتاح دار السعادۃ:۸۲

۳۴- اسے ترمذی نے کتاب العلم حدیث ۲۶۴۹ میں حضرت انس سے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ (جاری)

''جو علم کی طلب میں گھر سے باہر نکل گیا وہ جب تک واپس نہیں آتا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے۔''

امام ابن قیمؒ کہتے ہیں:

''حصولِ علم کو سبیل اللہ میں شمار کیا گیا ہے۔ جس طرح جہاد اسلام کا سہارا ہے اسی طرح علم بھی اسلام کا سہارا ہے۔ اس لیے جہاد کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ **جهاد باليد والسنان:** شمشیر و سنان کے ساتھ جہاد! اس قسم میں بہت سے لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔

۲۔ **جهاد بالحجة والبيان:** دلائل و براہین اور وعظ و تبلیغ کے ساتھ جہاد! یہ پروانِ رسول میں خاص لوگوں کا جہاد ہے یعنی ائمہ دین کا جہاد! چونکہ جہاد کی اس قسم میں فوائد بھی زیادہ ہیں۔ نرمی بھی بہت زیادہ ہے اور دشمنوں کی تعداد بھی کثیر ہے۔ لہٰذا اس کی فضیلت دوسری قسم سے بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان میں فرمایا ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ میں جہاد بالسیف کا حکم نہیں ملا تھا:

وَلَوْ شِئْنَا بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا. فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا. (۵۱-۵۲) ''اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اٹھا کھڑا کرتے۔ پس اے نبیؐ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر (ان) کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔''

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) حدیث حسن اسے ترمذی نے کتاب العلم حدیث ۲۶۴۹ میں حضرت انس سے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے اسے اور لوگوں نے بھی روایت کیا ہے لیکن کسی نے بھی مرفوع بیان نہیں کیا۔ اسے ضیاء نے بھی المختارہ میں روایت کیا ہے۔ مناوی نے الفیض جلد ۶ ص ۱۲۴ میں کہا ہے کہ اس کی سند میں خالد بن یزید لولوی ہے۔

عقیلی نے کہا ہے کہ اس کی حدیثیں زیادہ تر نہیں لی جاتیں۔ پھر اس خبر کا ذکر کیا ہے اور اس کا شاہد بھی ذکر کیا ہے، جس کا مفہوم ابوہریرہؓ سے روایت کردہ ابن ماجہ کی حدیث ۲۲۷ سے ملتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: ''مَنْ جَاءَ مَسْجِدِيْ هٰذَا لَمْ يَأْتِهِ إِلَّا الْخَيْرَ يَتَعَلَّمُهُ أَوْيُعَلِّمُ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' مجمع الزوائد میں کہا گیا ہے کہ مسلم کی شرط کے مطابق اس کی اسناد صحیح ہیں، اسے حاکم نے بھی بخاری و مسلم کی شرائط پر صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے بھی ان کی تائید کی ہے جلد ۱/ ۹۱

اس وقت یہ جہاد قرآن کے ذریعے کیا جا رہا تھا۔ اسی جہاد کو جہادِ اکبر کہا گیا ہے اور اسی کو ''منافقین سے جہاد'' کا نام دیا گیا ہے۔ چونکہ منافقین مسلمانوں کے مقابلے میں نہیں لڑ رہے تھے بلکہ بظاہر تو ان کے ساتھ تھے اور بسا اوقات تو وہ مسلمانوں کے شانہ بشانہ ان کے دشمن سے بھی لڑتے تھے۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ.

''اے نبیؐ! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔''

یہ بات تو سبھی کو معلوم ہے کہ منافقین سے جہاد دلائل اور قرآن کے ذریعے کیا جا رہا تھا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ جہاد، یہ حصولِ علم اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کا کام ہی ''سبیل اللہ'' ہے۔ اسی لیے حضرت معاذؓ فرماتے ہیں ''علم حاصل کرنا تم پر فرض ہے کیوں کہ اس کا سیکھنا اللہ کی خشیت، اس کا پڑھنا پڑھانا اللہ کی عبادت، اس پر باہمی گفتگو کرنا اللہ کی تسبیح اور اس پر تحقیق کرنا جہاد ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اسی لیے قرآنِ مجید میں کتاب، میزان اور حدید (لوہے) کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔ فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ. (الحدید:۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں، اور لوہا اُتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اُس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حدید کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ دونوں دین کے سہارے ہیں: جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

فَمَا هُوَ اِلَّا الْوَحْيُ اَوْحَدُّ مُرْهَفٍ
تَمِيْلُ ظُبَاهُ اَخْدَعَيْ كُلِّ مَائِلِ

فَهٰذَا شِفَاءُ الدَّاءِ مِنْ كُلِّ عَاقِلٍ
وَ هَذَا دَوَاءُ الدَّاءِ مِنْ كُلِّ جَاهِلٍ

''صرف وحی ہی ایسی تلوار ہے جس کی دھار اپنی طرف مائل ہونے والے کے گالوں کی طرف مائل ہوتی ہے۔''

یہ عقلمند سے لگنے والی بیماری کے لیے شفاء ہے اور جاہل سے لگنے والے مرض کے لیے دوا ہے۔''

اس ساری بحث کا مقصود یہ ہے کہ جہاد بالسیف اور جہاد بالحجہ دونوں کو ہی ''سبیل اللہ'' قرار دیا گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اللہ تعالیٰ کے قول: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء:۵۹) کی تفسیر میں اولی الامر سے علماء اور میدانِ جہاد کے امیر مراد لی ہے۔ یہ دونوں اللہ کی راہ کے مجاہد ہیں۔ علماء زبانوں سے جہاد میں مصروف ہیں اور مجاہد ہاتھوں سے مشغولِ جہاد ہیں۔

معلوم ہوا کہ علم حاصل کرنا اور سیکھنا ''سبیل اللہ'' کی ذیل میں آنے والے کاموں میں سب سے بڑا ہے۔

حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں:

''علم حاصل کرنے والا صبح وشام اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے مترادف ہے۔''

بعض صحابہؓ سے بیان کیا گیا ہے:

''اگر حصولِ علم میں مشغول شخص کو اسی حالت میں موت آجائے تو وہ شہداء میں شمار ہوگا۔''

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جس نے علم حاصل کیا گویا اس نے اللہ کی بیعت کرلی۔''

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں:

''جو شخص حصولِ علم کی راہ میں آنے جانے کو جہاد نہ سمجھے اس کی عقل اور رائے میں نقص ہے۔''(۳۵)

۳۵- مفتاح دارالسعادۃ جلد ۱/ ۷۱، ۷۷

علم کو ضائع کرنا دنیا برباد کرنے کا اعلان ہے

صحیح احادیث میں اس نہایت اہم حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ علم کے بغیر زندگی کو باقی رہنے کا حق نہیں۔ علم کا ضائع ہو جانا یا اسے ضائع کر دینا دنیا برباد ہو جانے کا اشارہ ہے، پھر سمجھنا چاہیے کہ قیامت دروازے پر کھڑی ہے۔

امام بخاریؒ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ. وَيُثْبَتُ الْجَهْلُ (وَفِيْ رِوَايَةٍ: يَقِلُّ الْعِلْمُ وَيَكْثُرُ الْجَهْلُ) وَيُشْرَبُ الْخَمْرُ وَيُظْهَرُ الزِّنَا.(۳۶)

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ قیامت کی نشانیاں ہیں کہ علم اٹھا لیا جائے گا اور جہالت کا دور دورہ ہوگا۔ (ایک روایت میں ہے، علم کم ہو جائے گا اور جہالت زیادہ ہو جائے گی) شراب عام پی جائے گی اور زنا بھی عام ہو جائے گا۔"

صحیح بخاری کی شرح میں علامہ کرمانی کہتے ہیں:

"مذکورہ برائیوں کا عام ہونا دنیا کی تباہی کا اعلان ہے چونکہ مخلوق کو آزاد و بے مہار نہیں چھوڑا جا سکتا لیکن اس کے لیے کوئی نبی آنے والا نہیں ہے جو راہِ راست کا تعین کرے لہٰذا یہ فریضہ علماء کو انجام دینا ہے۔"(۳۷)

یہاں "العلم" سے مراد دین کا علم ہے جو نبوت کا ورثہ ہے۔ یہی علم ہے جو لوگوں کو اللہ کی راہ دکھاتا ہے۔ دین کی قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرنے دیتا۔ انھیں حلال و حرام اور اوامر و نواہی کا شعور دیتا ہے۔

یہ بعید نہیں کہ لوگ اس علم کو ضائع کر دیں گے۔ خواہ وہ دنیاوی علم میں اس قدر آگے جا چکے ہوں کہ انھوں نے خلا کو فتح کر لیا ہو اور سیاروں کی بلندی تک جا پہنچے ہوں۔ جب لوگ

۳۶- صحیح البخاری، کتاب العلم باب رفع العلم وظہور الجہل

۳۷- فتح الباری جلد ۱/۱۸۹

یہ کام کریں گے تو وہ خدا سے بے بہرہ ہوں گے۔ اس کی واضح مثال آج کا عام مغربی معاشرہ ہے، الا ماشاء اللہ!

یہ انھی لوگوں کی طرح ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یوں بیان کیا ہے:

وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ. يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ. (الروم:۶-۷)

''مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں۔''

ذرا غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے ''لَا يَعْلَمُوْنَ'' کہہ کر ان کے علم کی کس طرح نفی فرمائی ہے۔ پھر فرمایا ''يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا'' یہ اقرار گزشتہ نفی سے متصادم نہیں، کیوں کہ علم کی یہ قسم اور اس سطح کا علم اگرچہ اپنے انجام سے بے خبر ہو کر مظاہر دنیا کو جان لینا تو ہے لیکن یہ ''جان لینا'' جہالت کے مترادف ہے تو پھر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ایسا علم رکھنے والوں کو ''لَا يَعْلَمُوْنَ'' کے الفاظ سے یاد کیا جائے۔

البتہ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ''علم کس طرح اٹھالیا جائے گا اور کیسے ختم ہو جائے گا؟'' اس کا مطلب یہ ہے کہ: ''ایسے اصحاب علم و فضل ناپید ہونا شروع ہو جائیں گے جن کے بحرِ علم سے لوگ اپنی پیاس بجھایا کرتے ہیں۔ مشکل معاملات میں رہنمائی کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کسی مسئلہ میں اختلاف رونما ہو جائے تو ان سے درست فیصلے کی امید رکھتے ہیں۔ جب کوئی فتویٰ پوچھا جائے تو علم کی روشنی میں فتویٰ دیتے ہیں۔ کوئی فیصلہ کرنا پڑے تو حق کا دامن نہیں چھوڑتے عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے فیصلہ کرتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں تو پوری بصیرت کے ساتھ بلاتے ہیں۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا مِنَ الْعِبَادِ (اى: مَحْوًا مِنَ الصُّدُوْرِ) وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى اِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمٌ. اِتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسَاءَ جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا، فَأَفْتَوْا

بِغَيْرِ عِلْمٍ. فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا. (۳۸)

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ علم قبض کرے گا تو بندوں سے چھین نہیں لے گا (یعنی ان کے سینوں سے علم ختم نہیں کر دے گا) بلکہ علماء سے دنیا کو اٹھاتا جائے گا تو علم بھی اٹھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک عالم بھی باقی نہیں رہ جائے گا۔ پھر لوگ جاہلوں کو رہنما بنالیں گے۔ جب ان جاہلوں سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے گا تو یہ بغیر علم کے فتویٰ دے ڈالیں گے، اس طرح یہ خود بھی گمراہی کا راستہ اختیار کیے ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کرنے میں کسر نہ چھوڑیں گے۔''

نبی کریم ﷺ نے اسی بات کی تجدید حجۃ الوداع میں بھی فرمائی۔ امام احمدؒ و طبرانی نے ابوامامہؓ سے روایت کیا ہے:

لَمَّا كَانَ فِیْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ قَالَ النَّبِیُّ: ''خُذُوْا الْعِلْمَ قَبْلَ أَنْ يُقْبَضَ أَوْ يُرْفَعَ'' فَقَالَ أَعْرَابِیٌّ: كَيْفَ يُرْفَعُ؟ فَقَالَ: ''أَلَا اِنَّهُ ذِهَابُ الْعِلْمِ ذِهَابُ حَمَلَتِهِ'' ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (۳۹)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: علم اٹھا لیے جانے یا قبض کر لیے جانے سے پہلے پہلے حاصل کر لو۔'' یہ سن کر ایک اعرابی بولا: علم کیسے اٹھا لیا جائے گا؟ آپؐ نے تین بار فرمایا: آگاہ ہو جاؤ، علم اٹھا لیے جانے کا مطلب اہل علم کا اٹھ جانا ہے۔ (یعنی فوت ہو جانا ہے)۔''

یہی وجہ ہے کہ ثقہ علماء کی موت مؤمنین کے نزدیک ایک غم انگیز مصیبت ہوتی ہے۔ وہ اس صدمہ پر اللہ تعالیٰ سے صبر کی توفیق، اور (علماء) کا بہترین بدل مانگتے ہیں۔ حضرت عمرؓ سے تو یہاں تک مروی ہے: ایک ہزار صائم النہار اور قائم اللیل عبادت گزاروں کی موت ایک ایسے عالم کی موت سے کم تر نقصان ہے جو حلال و حرام کی معرفت رکھتا ہو۔'' (۴۰)

۳۸- صحیح بخاری باب کیف یُقبَضُ العِلمُ میں ہے اور صحیح مسلم کتاب العلم میں حدیث ۲۶۷۳ ہے۔

۳۹- حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس روایت کو فتح الباری ج ۱/ ۲۰۵ پر ذکر کیا ہے۔

۴۰- امام غزالیؒ نے اسے احیاء علوم الدین میں ذکر کیا ہے۔

جب عالم الانصار، کاتب الوحی اور قاریٔ القرآن حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: جس آدمی کو یہ دیکھنے کی خواہش ہو کہ علم کس طرح اٹھالیا جائے گا تو وہ دیکھ لے کہ علم اس طرح اٹھایا جائے گا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عالم کی موت اسلام کی عمارت میں ایسے رخنہ اور دراڑ کے مترادف ہے کہ کوئی چیز مسلسل دن رات لگا کر بھی اسے بھر نہیں سکتی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: علماء یکے بعد دیگرے موت سے ہمکنار ہوتے رہیں گے اور حق کے آثار مٹتے رہیں گے حتیٰ کہ جاہلوں کی کثرت ہو جائے گی۔ جب اہل علم فوت ہو جائیں گے تو اہل جہالت کو کھل کھیلنے کا موقع میسر آ جائے گا۔ اور وہ ناحق کو بھی دین بنا ڈالیں گے اور لوگوں کو راط مستقیم سے برگشتہ کر دیں گے۔

حضرت ابوالدرداءؓ فرمایا کرتے تھے: میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے اہل علم لوگ تو فوت ہوتے جارہے ہیں اور جو پیچھے ہیں وہ کچھ سیکھ ہی نہیں رہے۔ سیکھو! قبل اس کے کہ علم اٹھالیا جائے اور علم کا اٹھالیا جانا علماء کا موت سے ہمکنار ہو جانا ہے۔ [41]

علم کے حصول اور اس کی تعلیم اور تدوین سے متعلق ان لوگوں کی حرص کا یہ عالم اس لیے تھا کہ کہیں ایسا وقت نہ آ جائے کہ ان کے ہاں علم کا حق ادا کرنے والے لوگ ناپید ہو جائیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے دورِ خلافت میں علامہ ابوبکر ابن حزم کو خط لکھتے ہیں جو اس وقت مدینہ کے گورنر تھے کہ:

”حدیث رسولؐ تلاش کرو اور ضبط تحریر میں لے آؤ۔ مجھے مدرسین و متحملین علم کے اٹھ جانے کا خوف ہے۔ اس سلسلے میں سوائے حدیث رسولؐ کے کچھ قبول نہ کیا جائے۔ علم کو پھیلایا جائے۔ اس کے لیے مجالس منعقد کی جائیں، حتیٰ کہ نہ جاننے والا بھی جان لے۔ بے شک علم جب تک ایک راز رہے گا اس میں کمی بھی ہوگی اور ختم بھی ہوتا رہے گا۔“ [42]

۴۱۔ مذکورہ تمام آثار کو ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم ”باب ماروی فی قبض العلم و ذہاب العلماء“ میں روایت کیا ہے۔

۴۲۔ امام بخاریؒ نے اسے صیغۂ جزم کے ساتھ معلقاً ذکر کیا۔

حافظ ابن حجرؒ فتح الباریؒ میں کہتے ہیں: ابونعیم نے تاریخ اصفہان میں یہ قصہ ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ''عمر بن عبدالعزیز نے پوری سلطنت میں یہ حکم جاری کیا: حدیث رسولؐ تلاش کرو اور اسے جمع کرو۔''(۴۳)

علم آخرت سے قبل دنیا میں فائدہ دیتا ہے

علم کے فضائل و محاسن میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل علم کو علم سے حاصل ہونے والا نفع صرف اس دنیا میں ہی نہیں ہوگا بلکہ دونوں جہانوں میں اہل علم منافع میں ہوں گے۔ علم اپنے حاملین کے لیے دو حسنات (حسنة الدنيا و حسنة الآخرة) جمع کرتا ہے۔ اپنے جاننے والوں کے درجات اللہ اور لوگوں کے ہاں بلند کرتا ہے۔ علم کا درخت بڑی جلدی پھل دیتا ہے اور اس کا پھل بھی گچھے دار ہوتا ہے۔

امام حسن بصریؒ نے اللہ تعالیٰ کے قول: رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً سے مراد علم اور عبادت ہے۔ وَ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً سے مراد جنت ہے۔

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں: یہ بہترین تفسیر ہے کیوں کہ دنیا کی حسنات میں علم نافع اور عمل صالح ہی سب سے عظیم بھلائی ہیں۔(۴۴)

اس سلسلے میں ابن ابزیٰ کا قصہ تو کیا ہی خوب ہے۔ قصہ یہ ہے کہ نافع بن عبدالحارث کو امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے مکہ کا گورنر بنا رکھا تھا۔ عسفان کے مقام پر امیر المؤمنین سے ان کی ملاقات ہوگئی تو امیر المؤمنین نے پوچھا کہ آپ مکہ میں اپنا قائم مقام کس شخص کو بنا کر آئے ہیں۔ نافع نے جواب دیا ابن ابزیٰ کو! حضرت عمرؓ نے پوچھا ابن ابزیٰ کون ہے؟ نافع نے بتایا: ہمارے غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: کیا تو نے لوگوں پر ایک غلام کو گورنر بنا دیا ہے؟ نافع نے کہا: وہ قرآن کے قاری اور مسائل وراثت کے بہت بڑے

۴۳- فتح الباری ج ۱/ ۲۰۴

۴۴- مفتاح دار السعادۃ ج ۱/ ۷۷

عالم ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: آپ کے نبی کا یہ فرمان ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ آخَرِيْنَ (۴۵)

''اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآنِ مجید) کے ذریعے کچھ قوموں کو بلند مقام عطا فرمائے گا اور کچھ کو پستی میں ڈال دے گا۔''

ابراہیم الحربی نے بیان کیا ہے:

''عطاء بن ابی رباح مکہ کی ایک عورت کا سیاہ رنگ غلام تھا۔ سلیمان بن عبدالملک اور اس کے دو بیٹے عطاء کے پاس آئے، وہ اس وقت نماز پڑھ رہا تھا، وہ لوگ اس کی طرف رُخ کر کے اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے، وہ نماز سے فارغ ہوا تو ان کی طرف رخ کیا، وہ اس کے پاس بیٹھے مسلسل مناسک حج کے بارے میں اس سے سوال پوچھ رہے تھے لیکن وہ بے نیازی کے ساتھ ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا، سلیمان نے بیٹوں سے کہا اٹھو! وہ اٹھ بیٹھے، سلیمان نے کہا بیٹو! دونوں علم کے حصول میں جت جاؤ، میں اس سیاہ غلام کے ہاتھوں اپنی اس ذلت کو بھول نہیں سکوں گا۔''(۴۶)

---○○---

۴۵۔ مسلم نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ حدیث ۸۱۷، احمد نے اپنی مسند میں۔ الفتح الربانی جلد۱/۱۴۶

۴۶۔ مفتاح دار السعادۃ ج۱/ ۱۶۵

رسول اللہ ﷺ اور تجرباتی علم

جس علم کی بات اسلام نے کی ہے اور قرآن وسنت میں اس کے حصول کی ترغیب دلائی گئی ہے وہ تو مکمل طور پر اس شعور وادراک کا نام ہے جو استدلال تک پہنچانے کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے مسلمین تقلید کو ''علم'' شمار نہیں کرتے، اس لیے کہ تقلید میں دلیل و حجت کے بغیر دوسرے کی بات کی پیروی کی جاتی ہے۔

اس اعتبار سے اسلام میں علم جس قدر وسیع ومتنوع دائروں اور میدانوں پر مشتمل ہے۔ لفظ ''سائنس'' اپنے جدید مغربی مفہوم میں اس کی وضاحت پیش کرنے سے قاصر ہے۔

علم کا دائرہ تو ماورائے کائنات تک وسیع ہے، جو وحی الٰہی کے ذریعے جاری ہوا اور اس سے وجود کبریٰ کے حقائق منکشف کیے اور ان ازلی سوالوں کے جوابات فراہم کیے جنھوں نے انسان کو اس وقت سے ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا جب سے اس نے غور وفکر اور فلسفہ وعقل سے کام لینا شروع کیا تھا، مثلاً:

- انسان کا مصدر ومنبع کیا ہے؟
- اس کا انجام ومنتہا کیا ہے؟
- اس کا مقصد تخلیق کیا ہے؟

ان سوالوں کا جواب وحی الٰہی سے ملا تو انسان کو اپنا مبدأ ومنتہا اور پیغام معلوم ہوا۔ پھر اس نے خود کو بھی دریافت کر لیا۔ اپنے رب کو بھی پا لیا اور اپنے مقصد وجود پر مطمئن بھی ہو گیا۔

یہ ہے وہ چیز جس پر لفظ ''العلم'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ بلکہ امام ابن عبدالبر کے الفاظ میں اسے ''العلم الاعلیٰ'' کہنا چاہیے۔

علم، انسان اور اس سے متعلق ان تمام مطالعہ جات جو اس کی زندگی کے مختلف گوشوں اور

اس کے سیاسی و معاشی، اجتماعی وانفرادی اور زمانی و مکانی تعلقات سمیت ان پہلوؤں پر محیط ہے جو فرد اور سماج سے متعلق ہیں۔

علم، کائنات کی پستی و بلندی میں پھیلے اس مادہ پر بھی بات کرتا ہے جس میں طبیعات، کیمیا، بیالوجی، فلکیات، طب اور انجینئرنگ وغیرہ کے علاوہ وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کا تعلق مشاہدہ و تجربہ سے ہوتا ہے۔

مغرب کے نزدیک علم یہی ہے۔ جب وہ "سائنس" کی بات کرتے ہیں تو اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ وہ آگے بڑھ بھی کیسے سکتے ہیں؟ سائنس جس کی وہ بات کرتے ہیں وہ تو جائزوں اور اندازوں کی تابع ہے۔ مشاہدہ و تجربہ اس پر حکمرانی کرتے ہیں۔ لیبارٹریاں اور تجربہ گاہیں اس علم کی "تخلیق" کو ممکن بناتی ہیں لیکن اسلام علم کی اس قسم میں پیچھے نہیں ہے جسے "مادہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ اسے ایمان کا مقابل ٹھہراتا ہے نہ مخالف۔ جس طرح دیگر ادیان کی تاریخ کے مخصوص ادوار اس طرح کے نظریات وعقائد کی نشاندہی کرتے ہیں، بلکہ میں پوری وضاحت اور فخر سے یہ بات کہتا ہوں کہ قرآن وسنت کی تعلیمات نے دل و دماغ کی اس زمین کو جہاں علم کی بود و باش ہوتی ہے، اس قدر تیار کیا ہے کہ اس کی جڑیں راسخ اور شاخیں طویل ہو جاتی ہیں اور علم کا یہ شجر ثمر بار اپنے رب کے حکم سے پھل دینا شروع ہو جاتا ہے۔

آیئے! قرآن وسنت کی یہ تعلیمات ایک نظر دیکھ لیں:

۱۔ علمی و تحقیقی بنیادوں پر ذہن سازی

ایک عقل و ذہنیت وہ ہے جو عمومی اور وہمی قسم کی ہوتی ہے۔ یہ ہر اس چیز کو صحیح مان لیتی ہے جو اس کے سامنے بیان کی جائے اور ہر اس چیز کو قبول کر لیتی ہے جو اس کی طرف پھینکی جائے۔ خصوصاً اس وقت جب یہ بات ان کے بڑے بزرگوں اور دادوں پردادوں کی طرف سے ہو جنھیں اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگ عظیم تصور کرتے ہیں، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ اس سطح کی ذہنیت رکھنے والے عام لوگ ان کی تقلید ہی کرتے ہیں۔ یہ ذہنیت اپنے افکار کا جائزہ لیتی ہے نہ اپنی معلومات کی جانچ پرکھ کرتی ہے۔ ان لوگوں کا تو حال یہ ہوتا ہے: هٰذَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَ نَا "یہ تو وہ راستہ ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔" یا نَحْنُ مَعَ النَّاسِ

اَحْسَنُوْا اَوْ اَسَاؤُوْا ''لوگ اچھائی کریں یا برائی ہم تو ان کے ساتھ ہیں۔''

اس ذہنیت کے مقابلہ میں ''علم و تحقیق کی جویا'' ذہنیت ہے۔ یہ ذہنیت نتائج کو مقدمات کے بغیر نہیں مانتی۔ حجت و دلیل کے علاوہ کسی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتی۔ جہاں ٹھوس یقین اور مستند علم کا تقاضا ہو وہاں میلان و گمان کو اہمیت نہیں دیتی۔ قرآن و سنت نے ان بنیادی نکات و نشانات کی واضح نشاندہی کی ہے جن پر اس ذہنیت کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ یہ نکات ترتیب وار ملاحظہ کریں:

۱۔ کسی دعویٰ کو دلیل کے بغیر قبول نہ کیا جائے، مدعی خواہ کوئی ہو۔ دلیل ایسی ہو جو عقل و شعور کے نزدیک ''دلیل'' کی حیثیت رکھتی ہو۔ قرآن کہتا ہے:

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ. [النمل:۶۴]

''کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔''

● محسوس کی جانے والی چیزوں کے ضمن میں مشاہدہ و تجربہ پیش کیا جائے۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ [الزخرف:۱۹]

''انھوں نے فرشتوں کو، جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں عورتیں قرار دے لیا، کیا ان کے جسم کی ساخت انھوں نے دیکھی ہے۔''

● منقول معاملات میں صحیح اور باوثوق بات پیش کی جائے۔

اس بارے میں قرآن کہتا ہے: اِيْتُوْنِيْ بِكِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ. [الاحقاف:۴] ''اس سے پہلے آئی ہوئی کوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ (ان عقائد کے ثبوت میں) تمھارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو۔''

۲۔ ● ہر اس موقع و محل پر گمان کو رد کر دیا جائے جہاں پختہ یقین اور ثقہ علم تقاضا کرے۔

قرآنِ حکیم نے مشرکین کے معبودانِ باطل کے بارے میں مزعومات کا یہ کہہ کر رد کر دیا ہے:

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا [النجم:۲۸]

"حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انھیں حاصل نہیں ہے، وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیے جانے کے یہودی ونصرانی مزعومات کو قرآنِ حکیم نے یہ کہہ کر باطل قرار دیا ہے:

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا. [النساء:۱۵۷]

"اِن کے پاس اس معاملہ میں محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انھوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا۔"

صحیح حدیث میں آیا ہے:

اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ[1]

"گمان سے بچو کیوں کہ سب سے بڑی جھوٹی بات وہ ہوتی ہے جو گمان کی بنیاد پر کی جائے۔"

۳۔ جہاں معقولیت وغیر جانبداری کا تقاضا ہو یا اشیاء کی ماہیت اور قوانینِ فطرت کا معاملہ ہو وہاں جذبات و ہیجانات اور خواہشات و شخصی رجحانات کو ٹھکرا دیا جائے خواہ اس کے نتائج کچھ بھی نکلیں۔ قرآن مشرکین کی ان الفاظ سے نکیر کرتا ہے:

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَی الْاَنْفُسُ [النجم:۲۳]

"حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. [ص:۲۶]

"لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔"

۱۔ اس حدیث کو احمدؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

رسولِ کریم ﷺ سے خطاب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ [القصص:۵۰]

''اب اگر وہ تمھارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟''

۴۔ دوسروں کی ذہنی وفکری غلامی اور جمود وتقلید سے بغاوت کی راہ اختیار کرنا خواہ یہ لوگ (جن کی تقلید وغلامی ہورہی ہے) آباء واجداد میں سے ہوں یا دینی قیادت وسیادت کے مناصب پر فائز قد آور شخصیات ہوں یا عام لوگ اور جمہور ہوں۔ قرآنِ کریم نے ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جو کہتے ہیں: بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ''بلکہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔''

اور ان کے جواب میں ساتھ ہی فرمایا گیا:

أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ. [البقرہ:۱۷۰]

''اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انھی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟''

قرآنِ حکیم نے تو ان لوگوں کے لیے بڑی دردناک سزا بیان کی ہے جو اپنے بڑوں بزرگوں کی اندھی پیروی میں لگے رہے اور ان بڑوں نے انھیں راہِ راست سے ہی برگشتہ کر دیا۔ قرآن نے ان متبوع و مطاع لوگوں کی قیامت کے دن اپنے اَتباع و مطیع لوگوں سے اظہارِ برأت کا بھی ذکر کیا ہے اور اس وقت ان دونوں کا اپنی گمراہی کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرانے کا بیان بھی آیا ہے۔ قرآن نے جن سخت الفاظ میں انھیں متنبہ کیا ہے ان پر توجہ فرمایئے: لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ. [الاعراف:۳۸] ''ہر ایک کے لیے دوہرا عذاب ہی ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔''

حدیث میں بھی ایسے لوگوں کو خوفناک انجام سے ڈرایا گیا ہے جو اکثریت کی پیروی آنکھیں بند کر کے کرتے ہیں خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ ایسے پیروکاروں کی عقلی پستی کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو آزاد ہوتے ہوئے بھی کسی کا پیرو ہونا ہی اپنے لیے بہتر خیال کرتے ہیں حالانکہ اللہ نے تو ان کو سید و سردار پیدا کیا ہے۔ حدیث میں ہے:

لَا يَكُنْ اَحَدُكُمْ اِمَّعَةً يَقُوْلُ: أَنَا مَعَ النَّاسِ اِنْ أَحْسَنُوْا أَحْسَنْتُ وَاِنْ أَسَاؤُوْا أَسَأْتُ وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا أَنْفُسَكُمْ اِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ أَسَاؤُوا أَلَّا تَظْلِمُوْا[۲]

''تم میں سے کوئی تابع مہمل نہ بن جائے کہ وہ کہتا پھرے کہ: میں تو لوگوں کے ساتھ ہوں اگر وہ اچھائی کریں گے تو میں بھی اچھائی کروں گا اور اگر وہ برائی کریں گے تو میں بھی برائی کروں گا۔ بلکہ اپنے نفوس کو اس بات کا خوگر بناؤ کہ اگر لوگ اچھائی کریں گے تو اچھائی کرو گے اور اگر وہ برائی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو تم ظلم کا یہ راستہ اختیار نہیں کرو گے۔''

یہ اخلاقی زاویۂ نگاہ جو انسانی شخصیت کی حیثیت کو ممتاز کرتا ہے، محض عملی روش وطور طریقوں میں ہی جاری نہیں ہونا چاہیے بلکہ فکر و نظر کو بھی اسی اعتبار سے تشکیل پانا چاہیے۔

۵- غور و خوض، سوچ و بچار اور تامل و تفکر سے کام لینا: قرآن اس حوالے سے کہتا ہے:

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ [الاعراف:۱۸۵]

''اور ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟''

غور و فکر کا یہ عمل انسان اپنے وجود پر بھی آزمائے۔ انسان کا اپنا نفس بھی ایک

۲- ترمذیؒ نے اسے روایت کیا ہے اور حسن غریب کہا ہے۔

عالم ہے۔قرآن کہتا ہے: وَ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. [الذٰریٰت:۲۱]

''خود تمھارے اپنے وجود میں (بہت سی نشانیاں ہیں) کیا تم کو سوجھتا نہیں؟۔''

یہ تامل و تفکر انسانی معاشرے، قوموں کے عروج و زوال اور انسانی تاریخ کے وسیع و عریض صفحات میں بھی ہونا چاہیے۔قرآن نے اس ضمن میں فرمایا ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ. [آل عمران:۱۳۷] ''تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں۔ زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔''

۲- جہالت و لاعلمی کے خلاف جنگ

تعلیم کو عام کرنا اور ناخواندگی و جہالت کو ختم کرنا بھی انھی تعلیمات میں سے ہے، جو سوسائٹی کو تفکر و تامل اور سائنسی تحقیقات کے لیے تیار کرتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ کو پورے عرب میں پھیلی ہوئی جہالت کے خلاف جنگ کی شدید خواہش تھی، جہالت کا عالم یہ تھا کہ عرب دیگر اقوام میں 'اُمِّيِّيْنَ' اَن پڑھ مشہور تھے، قرآن نے بھی انھیں اسی نام سے یاد کیا ہے:

بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ [الجمعۃ:۲]

''جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انھی میں سے اٹھایا۔''

نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا یہ ارشاد بھی اس وقت کی صورتِ حال کی صحیح ترجمانی کرتا ہے:

نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسِبُ[۳]

''ہم تو ایسی قوم ہیں جو نہ لکھ سکتے ہیں نہ حساب کتاب کر سکتے ہیں۔''

یہ کس قدر شاندار حقیقت ہے کہ اس اَن پڑھ قوم میں یہی وہ امی نبی ہیں جنھوں نے سب سے پہلے قلم کی عزت و توقیر کو معتبر ٹھہرایا، لکھنے کے عمل (کتابت) کو عملاً رواج دیا، اور ہر اعتبار سے اپنے پیروانِ کرام میں سے ناخواندگی کا خاتمہ کیا۔

اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ اولین وحی اور اولین آیات میں ہی قرأت،

۳- امام بخاریؒ نے اسے روایت کیا ہے۔

قلم اور تعلیم کی رفعتِ شان اور اہمیت کو بیان کر دیا گیا تھا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ. [العلق:۱-۵]

"پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

اس موضوع سے متعلق قرآنِ مجید میں جو دوسری سورت نازل ہوئی اس کا تو نام ہی "سورۃ القلم" رکھ دیا گیا۔ اس سورۃ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اس آلے (قلم) کی قسم کھائی ہے جو وجود میں تو بہت چھوٹا ہے لیکن اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے بہت بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ. [القلم:۱]

"ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ کو جب کبھی موقع میسر آتا کہ آپؐ مسلمانوں کو لکھنے کی تعلیم دلوا سکیں تو آپؐ اس موقع کو ضائع نہ کرتے اور دوسرے کاموں پر اس کام کو ترجیح دیتے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر ایسے ہی ہوا تھا جب قریش کے کچھ ایسے لوگ قیدی بنا لیے گئے تھے جن کے بارے میں لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ لکھنا جانتے ہیں، آپؐ نے ان میں سے ایک آدمی کو قید سے رہا کرنے کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ وہ مسلمانوں کے دس بچوں کو لکھنا سکھا دے۔

ابن سعد نے عامر الشعبی سے روایت نقل کی ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کے روز کفار کے ستر افراد کو قیدی بنا لیا۔ آپؐ ان کی مالی حیثیت کے مطابق ان کے فدیے مقرر کر رہے تھے۔ مکہ کے لوگ چونکہ لکھنا جانتے تھے اور اہل مدینہ نہیں جانتے تھے لہٰذا جس کے پاس فدیہ دینے کے لیے مال نہیں تھا۔ مدینہ کے بچوں میں سے دس بچے اس کے سپرد کر دیے گئے کہ انھیں کتابت سکھائے۔ اس نے انھیں کتابت سکھا دی۔ جب بچے لکھنے میں ماہر ہو گئے تو اس کام کو اس شخص کی طرف سے بطورِ فدیہ قبول کر لیا گیا۔"(۴)

۴- طبقات ابن سعد: جلد ۱ صفحہ ۲۲۔ مطبوعہ بیروت

ابن سعد نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ زید بن ثابت جو کاتبین وحی میں سے ایک ہیں، یہ ان لوگوں میں شامل تھے جنھیں قریش کے ان گرفتار شدگان نے لکھنا سکھایا تھا۔ نبیؐ کی طرف سے تعلیم کتابت کا یہ اہتمام محض حروف تہجی لکھ لینے کی سوجھ بوجھ حاصل کرنے تک محدود نہیں تھا بلکہ مکمل طور پر مہارت و پختگی پیدا کرانا مقصود تھا تاکہ سیکھنے والا اس کے بعد بھول کر دوبارہ ناخواندگی کی حالت میں نہ چلا جائے۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آپؐ کا اور مشرکین کا دین مختلف تھا لیکن اس اختلاف نے آپؐ کو مشرکین سے وہ خیر حاصل کرنے سے نہیں روکا جو اُن کے پاس تھی۔ اختلاف دین کا کوئی خطرہ بھی کیونکر ہوسکتا تھا؟ محض کتابت کے سیکھنے سے کفار کی عادات واطوار، افکار ونظریات اور ثقافت وتہذیب تو بچوں میں نہیں درآنی تھی اور نہ اس طرح وہ اس سکھانے والے کے رنگ میں ہی رنگ سکتے تھے۔

کتابت سیکھنے سکھانے کے اس عمل کی ترغیب نبی کریم ﷺ نے مردوں تک ہی محدود نہیں رکھی، بلکہ عورتوں کو بھی کتابت سیکھنے پر اُبھارا۔[۵] شفاء بنت عبداللہ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کو لکھنا سکھایا۔[۶]

۳-بوقتِ ضرورت دوسری زبانیں سیکھنا

قرآن وسنت کی ان اہم تعلیمات میں سے ایک یہ ہے کہ علمی و تحقیقی فضا تیار کرنے کے لیے بوقت ضرورت دوسروں کی زبانیں بھی سیکھی جاسکتی ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب ان کے

۵- مستدرک حاکم جلد۲ صفحہ ۳۹۶ پر حضرت عائشہؓ سے مرفوع روایت لَا تُنَزِّلُوْهُنَّ الغُرَفَ وَلَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ (يَعْنِيْ النِّسَآءَ) وَعَلِّمُوْهُنَّ المِغْزَلَ وَ سُوْرَةَ النُّوْرِ ''خواتین کو بالا خانوں سے نیچے اتار کر باہر نہ بھیجو، نہ انھیں لکھنا سکھاؤ، البتہ سوت کاتنا سکھاؤ اور سورۂ نور یاد کراؤ'' اس حدیث کو حاکم نے صحیح الاسناد کہا ہے لیکن امام ذہبی نے ان کا تعاقب کیا ہے اور کہا ہے بَلْ مَوْضُوْعٌ۔ یہ (حدیث صحیح نہیں) بلکہ موضوع ہے۔

۶- احمد اور ابوداؤد نے یہ حدیث روایت کی ہے مگر ابوداؤد اور منذری اس کی حیثیت کے بارے میں کچھ نہیں کہتے جب کہ اس کی سند کے رجال صحیح ہیں سوائے ابراہیم بن مہدی بغدادی مصیصی کے۔ البتہ نیل الاوطار جلد۹ صفحہ ۱۰۳ مطبوعہ دارالجیل لبنان میں ابراہیم کو ثقہ کہا گیا ہے۔

پاس کوئی ایسا علم ہو جسے حاصل کرنا ضروری ہو یا ان کے پاس کوئی حکمت بھرا علمی خزانہ ہو جس سے حکمت و دانش کے موتی چننا ضروری ہو۔ یہ کام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک آدمی دوسرے کی زبان سے ناآشنا رہے۔ غیر قوموں سے استفادے کا طریقہ یہی ہے کہ ان کی زبان سیکھی جائے۔ اسلام دوسروں کی زبان سیکھنے سے منع نہیں کرتا بلکہ ایک اعتبار سے اس کا حکم دیتا ہے وہ اس لیے کہ اس طرح اسلام کی دعوت دنیا میں پھیلے گی اور دعوت پھیلنے کا ذریعہ یہی زبان بنے گی جسے مسلمان سیکھے گا۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت عالمگیر ہے، اگرچہ آپ عربی ہیں، آپؐ پر نازل کی گئی کتاب عربی زبان میں ہے۔ آپؐ کو آپؐ کی قوم کی زبان میں اللہ نے احکام اس لیے دیے تاکہ آپؐ اس قوم کے سامنے ان احکام کی وضاحت کرسکیں۔ جب کہ آپ مبعوث تو ساری انسانیت کی طرف ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا. [الفرقان:۱]

''تاکہ (نبیؐ) سارے جہان کے لیے خبردار کردینے والا ہو۔''

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ. [الانبیاء:۱۰۷]

''اے نبیؐ! ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا. [الاعراف:۱۵۸]

''اے محمدؐ! کہو کہ اے انسانو میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں۔''

اس صورتِ حال میں آپؐ اور دیگر اقوام وقبائل کے درمیان ترجمانی کی اشد ضرورت تھی تاکہ ان لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی جاسکے، اور ان کا جواب بھی معلوم ہوسکے۔ اس مقصد کے لیے آپؐ کے پاس کئی صحابہؓ ایسے تھے جو فارسی، رومی اور حبشی زبانیں جانتے تھے۔ ان زبانوں میں تو یہ لوگ ترجمانی کا فریضہ انجام دے لیتے تھے مگر سریانی زبان جو یہود لکھتے تھے صحابہؓ میں اسے جاننے والا کوئی نہ تھا۔ آپؐ نے کاتبِ وحی، نابغۂ روزگار انصاری حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ وہ یہ زبان سیکھیں اور اس میں لکھنے پڑھنے کی اس قدر استعداد و صلاحیت پیدا کریں کہ یہودیوں سے بات چیت کے دوران یہودی ترجمان (Translater) کی ضرورت باقی نہ رہے۔

حضرت زیدؓ فرماتے ہیں:

"مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کی سریانی زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھنے کا حکم دیا تو میں نے یہ زبان سیکھ لی (زیدؓ فرماتے ہیں) اللہ کی قسم یہود کو میرے کتابت سیکھنے پر یقین نہیں آرہا تھا مگر ابھی آدھا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ میں نے یہ زبان اس قدر سیکھ لی کہ اس میں مہارت و پختگی حاصل کرلی۔ اس کے بعد میں ہی ایسے مکتوب لکھا کرتا تھا جو آپؐ یہودیوں کے لیے لکھواتے تھے اور یہودیوں کی طرف سے آنے والے مکتوب بھی میں ہی آپؐ کو پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔"(۷)

حضرت زید بن ثابتؓ نے اتنی قلیل مدت میں یہود کی یہ زبان شاید اس لیے سیکھ لی تھی اور اس میں پختگی حاصل کرلی تھی کہ انصار یہود کے ہمسائے تھے اور ان کی زبان سے کچھ واقفیت رکھتے تھے۔

مسلمانوں میں تو زبانیں سیکھنے کی طلب و حرص بڑی شدید رہی ہے۔ انھوں نے دیگر زبانیں سیکھ کر اپنی کتابوں کے تراجم ان کی زبانوں میں اور ان کی کتابوں کے تراجم اپنی زبانوں میں کیے۔

ایک شاعر اس بارے میں کہتا ہے:

بِقَدَرِ لُغَاتِ الْمَرْءِ يَكْثُرُ نَفْعُهُ
فَتِلْكَ لَهُ عِنْدَ الْمُلِمَّاتِ أَعْوَانٌ
فَأَقْبِلْ عَلَى دَرْسِ اللُّغَاتِ وَحِفْظِهَا
فَكُلُّ لِسَانٍ فِي الْحَقِيقَةِ إِنْسَانٌ

"آدمی جس قدر زیادہ زبانیں جانتا ہو اس کے فوائد و منافع اسی قدر زیادہ ہوتے ہیں۔ مصائب کے وقت یہ زبانیں اس کا سہارا بنتی ہیں۔"

"زبانیں سیکھنے اور انھیں حفظ کرلینے پر توجہ دیجیے۔ درحقیقت ہر زبان ایک انسان کی حیثیت رکھتی ہے۔"

۷۔ اس حدیث کو بخاریؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: جمع الفوائد اور اعذب الموارد جلد ا حدیث ۳۱۹ مطبوعہ مدینہ منورہ

۴- اعداد و شمار سے کام لینا

ہمارے آج کے اس دور میں اعداد و شمار کے انداز میں بات کرنا، معاملات کو سمجھانے اور سلجھانے کا بہترین علمی طریقہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہی چیز ایک تحقیقی علم رکھنے والے اور ایک سطحی معلومات رکھنے والے اور نام نہاد محققین کے درمیان فرق کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ریاست قائم کرنے کے ساتھ ہی اس اسلوبِ استدلال سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ حضرت حذیفہ ؓ بن الیمان سے روایت کرتے ہیں:

كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَقَالَ: أَحْصُوْا لِيْ كَمْ يَلْفَظُ الْإِسْلَامَ "ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپؐ نے فرمایا: گنتی کر کے مجھے بتاؤ کہ مسلمانوں کی تعداد کیا ہے۔"

امام بخاریؒ کی ایک روایت میں ہے:

أَنَّهُ قَالَ: اُكْتُبُوْا لِيْ مَنْ يَلْفَظُ بِالْإِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ: قَالَ حُذَيْفَةُ: فَكَتَبْنَا لَهُ أَلْفًا وَخَمْسَمِائَةِ رَجُلٍ[۸]

"آپؐ نے فرمایا کہ: لکھ کر مجھے دو کہ مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے۔ حذیفہؓ کہتے ہیں۔ ہم نے آپؐ کو لکھ کر دیا کہ پندرہ سو آدمی ہیں۔"

اس شمار سے مراد لکھی ہوئی تعداد ہے، اور اسے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ درست طور پر معلوم کر سکیں کہ اس وقت مسلمانوں کی عسکری افرادی قوت کیا ہے۔ کیا یہ اس قدر ہے بھی سہی کہ اس دشمن کا مقابلہ کر سکے جو اس کے انتظار میں ہے۔ اسی لیے تو محض مردوں کی گنتی کا کہا گیا تھا یعنی ایسے آدمی جو لڑائی لڑ سکتے تھے۔

اعداد و شمار کا یہ استعمال مملکت اسلامیہ کے ابتدائی ایام میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچا اور یہ سارا کچھ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر بڑی آسانی سے مکمل ہوا۔ دیکھیے کہ اسلام وسائلِ تعلیم (سائنٹیفک طریقوں) کے استعمال کو کس قدر تحسین کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

۸- دیکھیے: جامع الاصول جلد ا صفحہ ۱۰۰، حدیث ۵۷، تحقیق عبدالقادر الارناؤوط

اس کے برعکس ''عہد نامہ قدیم'' سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی قوم میں اعداد و شمار کے استعمال کو رواج دے تو ان پر کوئی آسمانی آفت ٹوٹ پڑی۔ گویا یہ اعداد و شمار تقدیر اور ارادۂ الٰہی کے لیے کوئی چیلنج تھا۔ مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل نے اسی سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ توراۃ اور کتاب مقدس (انجیل) علمی و تحقیقی فکر پیدا کرنے کے لیے مناسب رہنمائی فراہم نہیں کرتیں۔

۵- منصوبہ بندی کرنا

بات کو مدلل بنانے کے لیے جس طرح شماریات کا اسلوب اختیار کرنا تحقیقی و سائنسی کہلاتا ہے۔ کام کی منصوبہ بندی کرنا اور اہداف مقرر کرنا بھی ویسا ہی تحقیقی طریقہ استدلال ہے۔ بلکہ یہ اعداد و شمار کی نسبت زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اہداف اور منصوبہ بندی کی بنیاد اعداد و شمار پر ہی استوار ہوتی ہے۔ اس کا مطلب مستقبل کے امکانات کو پیش نظر رکھ کر ایک لائحہ عمل متعین کرنا اور ایسے اہداف مقرر کرنا ہوتا ہے جو پہلے معلوم اور حاصل شدہ نہ ہوں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو منصوبہ بندی اور مستقبل کی پلاننگ کو دین سے متصادم و متناقض خیال کرتے ہیں یا دین کو ایسا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ اس قدیم تصور کے اثرات ہیں جس نے علم کو ایمان کے مدمقابل لا کھڑا کیا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے کی ایسی ضد قرار دیا جو کبھی جمع نہیں ہو سکتیں اور انھیں ایسے متوازی خطوط بنا دیا جو کبھی مل نہیں سکتے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دین اپنی اصل کے اعتبار سے قائم ہی مستقبل کی منصوبہ بندی پر ہے۔ یہ اسی دین کا دیا ہوا تصور ہے جو ایک مؤمن و مسلم کا عقیدہ بن جاتا ہے اور وہ اپنے آج کی کمائی کو کل کے لیے محفوظ کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ یا وسیع مفہوم میں یوں کہہ لیجیے کہ مؤمن و مسلم اپنی زندگی میں موت کے لیے تیاری کرتا ہے، اپنی دنیا میں آخرت سنوارنے کی تگ و دو کرتا ہے۔ یہ سارا سلسلہ تب ہی ممکن ہے جب مؤمن اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل متعین کرے اور اپنے لیے ایک منہج وضع کرے جو اسے مقصد تک پہنچا دے۔ یہی اللہ کی خوشنودی و رضا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ایک ایسا واقعہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اہل عقل کے لیے عبرت کے طور پر بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے۔ اس واقعہ میں قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ غذائی قحط

سے نپٹنے کے لیے پندرہ سال کے لیے زرعی بنیادوں پر منصوبہ بندی کی گئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ الہام اور خوابوں کی تعبیر کے علم کی روشنی میں جان لیا تھا کہ عنقریب ملک میں یہ قحط عام ہونے والا ہے۔ اور یوسف علیہ السلام نے ہی قحط سے نپٹنے کا یہ منصوبہ تجویز کیا اور اس کے نفاذ کی ذمہ داری بھی انھیں کے اوپر ڈالی گئی۔ آپ علیہ السلام کی اس تجویز و منصوبہ میں سارے مصر اور اس کے گردونواح کے لیے سراسر خیر و برکت ہی تھی۔ آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:

تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ. ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ. ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ. [یوسف: ۴۷-۴۹]

"سات برس تک لگاتار تم کھیتی باڑی کرتے رہو گے۔ اس دوران میں تم جو فصلیں کاٹو اُن میں سے بس تھوڑا سا حصہ، جو تمھاری خوراک کے کام آئے، نکالو اور باقی کو اُس کی بالوں ہی میں رہنے دو۔ پھر سات برس بہت سخت آئیں گے۔ اُس زمانے میں وہ سب غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اُس وقت کے لیے جمع کرو گے۔ اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو۔ اُس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا جس میں بارانِ رحمت سے لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور وہ رس نچوڑیں گے۔"

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مستقبل کی پلاننگ اللہ پر توکل اور قضا و قدر پر ایمان کے منافی ہے۔ اس لیے وہ اس بات کو انتہائی بعید از قیاس سمجھتے ہیں کہ دین منصوبہ بندی کے تصور کو بھی قبول کرے چہ جائے کہ اس پر ابھارے اور اس کی طرف رہنمائی فرمائے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص بنظرِ عمیق قرآن و سنت کا مطالعہ کرتا ہے اس کے لیے تو یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں مآخذِ شریعت کوتاہ نظری و عدم تفکر کے رویے کو قبول نہیں کرتے اور نہ اس تصور کو کہ معاملات کو یونہی چھوڑ دیا جائے اور وہ کسی ضابطہ و رابطہ اور نظام کے بغیر چلتے رہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تو واضح فرمایا ہے کہ اللہ پر توکل کا مطلب یہ نہیں کہ اسباب و ذرائع کو ترک کر دیا جائے اور زندگی گزارنے کے جو طور و اطوار مروج ہیں انھیں نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ ایسی

چیزیں ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے موجودات کا یہ نظام قائم کر رکھا ہے۔ کوئی مسلمان اس اعرابی کے قصے سے ناواقف نہیں ہوگا جو نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی اونٹنی کو مسجد کے سامنے چھوڑ آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں اللہ پر توکل کرنے کے باوجود بھی اونٹنی باندھ دوں یا اس توکل کی بنیاد پر کھلی رہنے دوں۔ آپؐ نے فرمایا: اونٹنی بھی باندھو اور اللہ پر توکل بھی رکھو۔ (۹)

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اسباب سے کام لینا توکل کے خلاف ہے، امام طبریؒ ان کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''درست بات تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ پر پختہ یقین رکھتا ہو، اور اسے یہ بھی یقین ہو کہ اللہ کا کوئی فیصلہ اگر اس کے خلاف ہے تو وہ ہو کر رہتا ہے، ایسا آدمی تو اسباب کی فراہمی کو توکل کی شان میں عیب نہیں سمجھتا کیوں کہ وہ تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے مطابق ایسا کر رہا ہے۔ خود نبی کریم ﷺ سے اس قسم کے بے شمار واقعات منقول ہیں۔ آپؐ نے میدانِ جنگ میں جسم پر دو زرہیں اور سر پر خود بھی پہنی۔ جنگ احد میں پہاڑی درے پر تیر اندازوں کو بھی متعین کیا۔ غزوۂ خندق میں مدینہ کے گرد خندق بھی کھودی۔ مدینہ وحبشہ کی طرف ہجرت کا حکم بھی دیا اور خود مدینہ کی طرف ہجرت بھی کی۔ کھانے پینے کے اسباب بھی مہیا کیے۔ اہل خانہ کے لیے قوت لایموت کا اہتمام بھی کیا۔ آپؐ اس بات کے کبھی منتظر نہ رہے کہ آسمان سے یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ نازل فرما دے گا۔ حالانکہ آپ سے زیادہ یہ حق کس کو حاصل تھا کہ آسمان سے اس کے لیے ان چیزوں کا نزول ہو۔''(۱۰)

سیرت النبیؐ کا مطالعہ رکھنے والا ہر شخص دیکھتا ہے کہ آپ ہر کام کی تیاری اس کے شایانِ

۹- ترمذیؒ نے اسے حدیث انس سے روایت کیا ہے اور غریب یعنی ضعیف کہا ہے لیکن یحییٰ القطان نے ان کی تردید کی ہے۔ صحیح ابن حبان میں یہ حدیث عمر بن امیہ ضمری سے مروی ہے اور اس کی سند جیسا کہ زرکشیؒ نے کہا ہے، صحیح ہے۔ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اس راوی سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: ''قیدھا وتوکل''، یعنی اونٹنی کو باندھ دو اور اللہ پر توکل بھی رکھو۔ زین العراقی کے مطابق اس کی سند جید ہے۔ دیکھیے: فیض القدیر صفحہ ۷ حدیث ۱۱۹۱

۱۰- امام شوکانی نے اسے نیل الاوطار مطبوعہ دار الجیل بیروت میں جلد ۹ صفحہ ۹۲ پر نقل کیا ہے۔

شان کرتے تھے۔ کام کی اہمیت کے مطابق اس کے لیے اسباب فراہم کرتے تھے۔ اس دوران آپ کام کے نقصان دہ پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھتے اور تمام امکانات و احتمالات کا جائزہ لیتے، تاکہ احتیاط کا پہلو بھی اسی قدر پیش نظر رہے۔ آپ نے یہ سب کچھ کیا ہے حالانکہ آپ سب سے زیادہ اللہ پر توکل رکھنے والے تھے۔

ذرا ہجرت کا منظر نگاہوں میں لایئے! قریش کی سختیاں جب برداشت سے باہر ہو گئیں تو آپؐ نے صحابہؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر دیا گیا حکم نہیں تھا بلکہ اس وقت کی صورتِ حال میں حبشہ کی سیاسی و دینی اور جغرافیائی اہمیت کا بھرپور ادراک تھا۔

اس وقت حکمت و دانائی اور مستقبل کی بہترین حکمت عملی کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ آپ کسی اور علاقہ و ملک کی طرف ہجرت کا حکم دیتے جو جزیرۂ عرب میں حبشہ سے بھی دور کیوں نہ ہوتا لیکن قریش کا وہاں دینی و ادبی اثر ورسوخ ہوتا اور وہ وہاں پہنچ کر مسلمانوں کو پا لیتے۔

یہ بھی حکمت نہ تھی کہ مسلمان فارس و روم کی زیر سلطنت کسی ملک کی طرف چلے جاتے کیوں کہ یہاں تو حکمرانی ہی متکبرین کی تھی جن کی گردنوں میں قوت وسطوت کا سریا گڑا ہوا تھا۔ یہ اس نئی دعوت کو کیونکر قبول کر سکتے تھے۔

مناسب یہ بھی نہ تھا کہ مسلمان چین و ہند جیسے دور دراز ملک میں چلے آتے جہاں سے ان کی خیر خبر ملنا ہی ناممکن ہو جاتا اور ہجرت اطمینان کے بجائے ہلاکت کا باعث بن جاتی۔ اس صورتِ حال میں حبشہ ہی جغرافیائی اعتبار سے مناسب ملک تھا۔ یہ نہ زیادہ دور تھا نہ زیادہ قریب۔ البتہ قریش و حبشہ کے درمیان سمندر تھا۔ دینی اعتبار سے بھی یہی موزوں جگہ تھی کیوں کہ یہاں کے نصرانی اہل کتاب ہی محبت ومودت کے اعتبار سے مسلمانوں کے قریب ہو سکتے تھے۔ حبشہ کی سیاسی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے کہ یہاں ایسا شخص حکمران تھا جو عدل و انصاف میں مشہور تھا۔ اسی لیے تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا تھا: **إِنَّ بِهَا مَلِكًا أَرْجُوا أَلَّا تُظْلَمُوا عِنْدَهُ** ''وہاں ایسا آدمی حکمران ہے کہ مجھے امید ہے اس کی بادشاہی میں تم پر ظلم نہیں کیا جا سکے گا۔''

مذکورہ صورتِ حال سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ اپنے

گردو پیش کی دنیا سے کٹ کر نہیں رہے حالانکہ کہ بعض مسلمانوں اور بعض ممالک کے درمیان مواصلات کی عدم سہولیات کے باعث سفر کی زبردست دشواریاں حائل تھیں۔

یہ واقعہ فارس و روم کی جنگ کے حوالے سے مسلمانوں کے موقف پر روشنی ڈالتا ہے اور مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان اس بحث پر بھی جس کے پس منظر میں سورۂ روم کی ابتدا میں کہا گیا ہے:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ.

[الروم:۲-۳]

''رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں، اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔''

- اسی طرح اس صورتِ حال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان موجود تو تھے لیکن ابھی آغاز دعوت میں تھے، مگر اس کمزور و بے یقینی کی صورتِ حال کے باوجود اس وقت کی مشرقی و مغربی دو عظیم جنگی طاقتوں کے درمیان برپا عالمی کشمکش سے غافل ولاتعلق نہ تھے۔

ہجرت کے اس واقعہ سے زیادہ واضح صورتِ حال تو ہجرت مدینہ سے متعلق آپؐ کے موقف کی ہے۔ یہاں تو مستقبل کی منصوبہ بندی بڑی واضح ہو کر سامنے آتی ہے اور توکل ایمانی بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ نبی کریمؐ نے اپنی طرف سے وسائل و ذرائع اور احتیاط کے ان تمام پہلوؤں پر تیاری کی جو اس سلسلہ میں مددگار ہو سکتے تھے، یہ تیاری اس قدر تھی کہ کوئی انسان اس طرح کے موقع پر اپنی استعداد و استقامت کے مطابق جو کچھ کر سکتا ہے وہ آپؐ نے کیا۔

نبی کریم ﷺ اپنی جائے ہجرت پر جہاں عنقریب آپؐ جانے والے تھے تب مطمئن ہوئے جب آپؐ نے اوس و خزرج کے اہل ایمان سے بیعت عقبۂ اولی وثانیہ میں ان سے بیعت لے لی اور یہ شرط عاید کی کہ وہ (خزرج و اوس) آپؐ کی اسی طرح حفاظت و مدافعت کریں گے جس طرح وہ اپنی جانوں اور اپنی اولاد کی کرتے ہیں۔

- آپؐ نے اپنے لیے جس شخص کو رفیق سفر بنانا تھا اس کی طرف سے بھی مکمل طور پر مطمئن تھے کیوں کہ یہ سفر بڑا جانگسل اور خطرات ومصائب سے اٹا پڑا تھا۔ اس طرح کی سنگین صورت

حال میں ابوبکرؓ سے بہتر رفیق سفر اور کون ہو سکتا تھا؟

آپؐ نے اپنے اس جاں نثار کی طرف سے بھی اطمینان حاصل کر لیا تھا جس نے تاک میں بیٹھے دشمن کی بے وفائیوں اور خطرات میں کود کر آپؐ کے گھر میں رات گزارنا تھی۔ اس اہم اور خطرناک ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے شہسوارِ اسلام سیدنا علیؓ ابن ابی طالب سے موزوں کون ہو سکتا تھا؟

آپؐ نے راستوں اور گزرگاہوں کے ایک ماہر کا انتظام بھی کیا جو خفیہ راستوں اور ان کے پیچ وخم سے خوب واقف تھا۔ یہ اہتمام اس لیے کیا تا کہ آپؐ تعاقب کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ یہ فریضہ سرانجام دینے والے ایک امانت دار مشرک تھے جن کا نام عبداللہ بن اریقط تھا۔ فقہاء نے اس سے یہ جواز اخذ کیا ہے کہ تکنیکی وفنی نوعیت کی تفتیش میں بااعتماد وامانت دار غیر مسلموں سے مدد لی جا سکتی ہے۔

آپؐ نے ان اونٹنیوں کو بھی تیار کرایا جن پر آپؐ، آپؐ کے رفیق سفر اور دلیل راہ کو سوار ہونا تھا اور یہ لوگ طے کردہ مقام پر آپس میں ملے جہاں قافلے پڑاؤ کرتے تھے۔

آپؐ نے جس خفیہ راستے کو اختیار کیا کئی دن وہاں خفیہ ہی رہے، یہاں تک کہ قریش مکہ کی طلبِ تلاش کی حدت کم ہو گئی اور وہ مایوس ہونے لگے۔ آپؐ اس راستے پر جہاں زیادہ دیر تک قوم کی نظروں سے اوجھل رہے وہ مدینہ کے معروف راستے سے علیحدہ راہ پر واقع غارِ ثور تھا۔

آپؐ نے ایک ایسا گروہ بھی تیار کیا جو کھانے کا سامان اور دشمن کی سرگرمیوں کی خبریں آپؐ تک پہنچاتا تھا۔ ان لوگوں میں اسماء بنت ابی بکر اور عبداللہ بن ابی بکر شامل تھے۔ ان کے بعد ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ اپنی بکریاں آپؐ کے پاس لے جاتے اور آپؐ کو ان کا دودھ پلاتے اور اسماء وعبداللہ کے نقوش قدم پر بکریاں ہانکتے ہوئے انھیں مٹاتے واپس چلے جاتے۔ یہ منصوبہ کتنا زبردست تھا اور کس قدر باریک بینی سے تیار کیا گیا تھا کہ اس میں کوئی خلا باقی نہیں رہا تھا۔ ہر سپاہی کو اس کی صلاحیتوں اور حالات کے تقاضے کے مطابق مناسب کردار سونپا گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی ذمہ داری علی واسماء کی ذمہ داری سے مختلف تھی۔ اور ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مناسب ترین تھا۔

اس قدر باریک بینی کے باوجود قریب تھا کہ حکمت عملی ناکام ہو جاتی کیوں کہ مشرکین غار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے، اور وہ غار کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ یہاں تک پہنچ جانا ہی معاملہ کا کھوج لگا لینے اور حکمت عملی ناکام بنا دینے کے لیے کافی تھا اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے قدموں تلے نظر ڈالتا۔ کوئی شخص ایسا کرتا تو یقیناً آپؐ اور آپؐ کے رفیق غار میں اسے نظر آ جاتے۔ یہی وہ موقع تھا جب ابوبکرؓ معاملے کی نزاکت دیکھ کر ڈر گئے تھے اور رسول اللہ ﷺ سے اس کا اظہار بھی کر دیا کہ: ''اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے قدموں کے نیچے نگاہ ڈال لیتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔'' اس کے جواب میں آپؐ نے ایمانی مضبوطی میں گندھے ہوئے الفاظ فرمائے تھے: مَا ظَنُّكَ يَا أَبَابَكْرٍ بِاثْنَيْنِ، اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا ''اے ابوبکر ان دو کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے۔'' لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا [التوبہ:۴۰] ''نہ ڈرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

توکل کے حقیقی کردار کا اظہار تب سامنے آتا ہے جب انسان اپنی استطاعت و دسترس میں موجود تمام قوتوں سے کام لے چکا ہوتا ہے اور حکمت عملی و تدابیر اور ممکنہ اسباب و ذرائع اختیار کر چکا ہوتا ہے پھر ان مفاجات کو اللہ وحدہٗ پر چھوڑ دیتا ہے جن کو روکنا اور ٹالنا اس کے اپنے بس کی بات نہیں۔ اور یہی اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کا کلمہ بلند کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو پھر یہ کلمہ اپنا اثر بھی دکھاتا ہے۔

۶- دنیاوی امور میں تجرباتی طریق کا اقرار و اثبات

ماڈرن اور مغربی مفہوم میں ''سائنس'' کو جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ علم کی بنیاد کسی ایسے ماڈل، تصور یا اندازے کے اس فلسفہ پر قائم نہیں جو ارسطو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ تو مشاہدہ و تجربہ کی منطق پر قائم ہے اور انھی نتائج کو صحیح مانتی ہے جو مشاہدہ و تجربہ سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے اس کو ''تجرباتی علم'' اور اس طریقہ کو ''تجرباتی طریقہ'' کہا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دنیاوی امور میں تجربہ کے اُصول کو تسلیم کرنے میں سبقت فرمائی۔ زراعت، صنعت اور طب وغیرہ کے امور اس کی واضح مثالیں

ہیں۔ان امور میں جہاں تجرباتی علم نفع بخش اور فائدہ مند نتائج پیدا کرے وہ تو شرعی طور پر جائز ہیں، اور جہاں ضرر رساں نتائج برآمد ہوں، شریعت ان کی اجازت نہیں دیتی۔

اس اُصول کی واضح مثال کھجوروں کو گابھا دینے کے مسئلہ میں آپؐ کا موقف ہے۔آپؐ نے اپنے انصاری صحابہؓ کو دیکھا کہ وہ گابھا دینے کا عمل کر رہے ہیں، آپؐ نے مکہ میں پرورش پانے کے باعث چونکہ ایسا عمل نہ دیکھا تھا اور مکہ کی وادی بھی بے کاشت ہی تھی وہاں اس طرح کے مسائل کیسے پیش آسکتے تھے۔آپؐ نے ظن وتخمین کی بنیاد پر صحابہؓ سے کچھ فرمایا جو اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔انصار نے اس فرمانِ نبویؐ کا مفہوم یہ لیا کہ یہ حکم وحی اور دین کا معاملہ ہے اور دین کی مخالفت نہیں کی جاسکتی۔لہٰذا انھوں نے اس سال گابھا دینے کا عمل نہ کیا۔پھل کا موسم آیا تو کھجوروں کی نکمی فصل پیدا ہوئی۔آپؐ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے وضاحت فرمائی کہ آپؐ کا یہ کہنا دنیاوی مسائل کی طرز کا ایک مشورہ اور اپنے محدود ماحول سے متعلق تجربات کی روشنی میں قائم کیا گیا ایک خیال تھا، کوئی باقاعدہ وحی الٰہی نہ تھی۔آخر میں آپؐ نے ان سے فرمایا: اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ تم اپنے دنیاوی معاملات کو زیادہ جانتے ہو۔یہ خالصتاً دنیاوی فنی امور ہیں جن کو لوگوں کی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی پر چھوڑ دیا گیا۔وہ اس کی تدبیر اپنے فوائد ومصالح کے مطابق کریں کیوں کہ وہی ان معاملات کا فہم وعلم زیادہ رکھتے ہیں۔وحی کی شان یہ نہیں کہ اس طرح کے معاملات میں دخل اندازی کرے۔

یہ واقعہ صحیح مسلم ومسند احمد میں متعدد صحابہ حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ، حضرت رافع بن خدیجؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ سے مروی ہے۔

مسند احمد میں ہے:

عَنْ طَلْحَةَؓ قَالَ: مَرَرْتُ مَعَ النَّبِیِّ فِیْ نَخْلِ الْمَدِیْنَةِ. فَرَأٰی أَقْوَامًا فِیْ رُؤُوْسِ النَّخْلِ. فَقَالَ: مَا یَصْنَعُ هٰؤُلَاءِ؟ قَالَ یَأْخُذُوْنَ مِنَ الذَّکَرِ فَیَحُطُّوْنَ فِی الْاُنْثٰی یَلْحَقُوْنَ بِهٖ. فَقَالَ: مَا أَظُنُّ ذٰلِکَ یُغْنِیْ شَیْئًا. فَبَلَغَهُمْ، فَتَرَکُوْهُ وَنَزَلُوْا عَنْهَا. فَلَمْ تَحْمِلْ تِلْکَ السَّنَةِ شَیْئًا، فَبَلَغَ ذٰلِکَ النَّبِیَّ فَقَالَ: اِنَّمَا هُوَ ظَنٌّ ظَنَنْتُهٗ اِنْ کَانَ یُغْنِیْ شَیْئًا فَاصْنَعُوْا فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ وَالظَّنُّ یُخْطِئُ وَیُصِیْبُ.

وَلٰكِنْ مَا قُلْتُ لَكُمْ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَلَنْ أَكْذَبَ عَلَى اللّٰهِ.(۱۱)

''حضرت طلحہ ؓ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدینہ میں کھجور کے باغات کے پاس سے گزرا تو آپؐ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کی چوٹیوں پر چڑھے ہوئے ہیں، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ: یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا یہ نر کھجور کا بور اُتارتے ہیں اور مادہ کھجور پر گرا کر اس کے بور میں ملا دیتے ہیں۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا: ''میرا نہیں خیال کہ یہ چیز انھیں فائدہ دے۔'' لوگوں تک آپؐ کی یہ بات پہنچی تو انھوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا، اور درختوں سے نیچے اتر آئے۔ (ہوا یہ کہ) اس سال کھجوروں نے پھل نہ دیا۔ رسول اللہ ﷺ تک یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: وہ تو ایک اندازہ وگمان تھا جس کا میں نے اظہار کیا تھا اگر یہ عمل کوئی فائدہ دیتا ہے تو اسے کرو۔ میں بھی تمھاری طرح انسان ہی ہوں (جیسے تم خیال کر لیتے ہو میں نے بھی کیا) اور گمان یا اندازہ وخیال غلط بھی ہوتا ہے اور صحیح بھی۔ ہاں جب میں تم سے یہ کہوں کہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تو میں اللہ سے غلط بات ہرگز منسوب نہیں کر سکتا۔''

صحیح مسلم میں رافع بن خدیج کی روایت اس طرح ہے:

إِنَّهُ قَالَ لَهُمْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهِ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ(۱۲)

''آپ نے لوگوں سے فرمایا میں بھی انسان ہوں، جب کسی دینی معاملے میں تمھیں حکم دوں تو اسے اختیار کر لیا کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بھی انسان ہوں (خطا کا امکان ہوتا ہے)۔''

صحیح مسلم ہی میں حضرت عائشہؓ وحضرت انسؓ کی روایت اس طرح ہے:

أَنَّهُ قَالَ لَهُمْ بَعْدَ أَنْ خَرَجَ التَّمْرُ شِيْصًا، مَا لِنَخْلِكُمْ؟ قَالُوْا: قُلْتَ

۱۱۔ مسند احمد، حدیث ۱۳۹۹۔ شیخ احمد شاکر نے کہا ہے اس کی سند صحیح ہے۔ یہی روایت مختصراً مسند احمد حدیث ۱۳۹۵ میں بھی آئی ہے۔ امام مسلمؒ نے بھی اسے حدیث ۲۳۶۱ میں روایت کیا ہے۔

۱۲۔ مسلم حدیث ۲۳۶۲

كَذَا وَكَذَا قَالَ: أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ،(۱۳)

''جب کھجوروں نے نکما پھل دیا تو آپ نے لوگوں سے دریافت کیا یہ تمھاری کھجوروں کو کیا ہوا؟ لوگوں نے کہا: آپؐ نے فلاں موقع پر ایسے فرمایا تھا۔ یہ سن کر آپؐ نے جواب دیا تم اپنے دنیوی معاملات کے بارے میں زیادہ جانتے ہو۔''

یہاں جس قانون واُصول کو ماننا ضروری ہے وہ مشق و ممارست اور مشاہدہ و تجربہ کا نتیجہ ہوتا ہے اور ان امور میں انسانی عقل ہی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ وحی کا کام تو یہ ہے کہ وہ عام بنیادی اور اہم نکات وضوابط لوگوں کے سامنے رکھ دے اور انسان کو اپنے علم کی روشنی میں ان امور میں تصرف کا اختیار دے دے۔ لوگوں کے لیے تو یہ جلیل القدر الفاظ ہی کافی ہیں: أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ کہ تم اپنے دنیوی معاملات کے بارے میں زیادہ جانتے ہو۔''

۷- اہل علم اور ماہرین و محققین کی رائے تسلیم کرنا

ہر فن اور تجربہ کے محققین و ماہرین اور اہل علم و معرفت کی آرا کو تسلیم کرنا بھی صحیح علمی و عقلی رویہ ہے۔ اس کی طرف قرآن نے بھی رہنمائی کی ہے۔

فَسْئَلْ بِهِ خَبِيْرًا. [الفرقان:۵۹] ''اس کی شان بس کسی جاننے والے سے پوچھو۔''

وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ [الفاطر:۱۴] ''حقیقت حال کی ایسی صحیح خبر تمھیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔''

امور حربیہ میں عسکری ماہرین کی رائے ماننا ضروری ہے۔ معاشیات میں ماہرین معاشیات کی رائے سے استفادہ ضروری ہے۔ زرعیات میں ماہرین زراعت کی آرا کو وزن دینا ضروری ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر مسائل و معاملات میں ان کے ماہرین و متخصصین سے استفادہ ضروری ہے۔

معرکۂ بدر میں قریش ابھی وادی کے آخری کنارے پر ہی آ کر ٹھہرے تھے کہ رسول کریم ﷺ میدان کی طرف نکل پڑے، آپؐ ان سے پہلے پانی کے چشموں تک پہنچنے کی کوشش میں تھے جب آپؐ اپنی جانب کے چشمہ پر پہنچ گئے تو وہیں پڑاؤ کر لیا۔

۱۳- مسلم حدیث ۲۳۶۳

اس موقع پر حباب بن منذر انصاریؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں تجویز پیش کرتے ہیں:

"اے اللہ کے رسولؐ! کیا اس جگہ پر ٹھہرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کہ اس مقام سے ہم نہ آگے بڑھ سکتے ہیں نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں؟ یا یہ آپ کی رائے کے مطابق یہ جنگی چال ہے یا کوئی اور ایسی ہی تدبیر؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں! یہ میری رائے اور جنگی تدبیر وحکمت عملی ہے۔" میں نے کہا یا رسول اللہؐ! یہ جگہ ٹھہرنے کے لیے مناسب نہیں ہے، لوگوں کو یہاں سے اٹھا لیجیے تاکہ ہم دشمن کے قریب ترین پانی تک پہنچ جائیں اور وہاں جا کر ٹھہریں۔ ہم پانی کے اس ذخیرے (جہاں اب ٹھہرے ہوئے ہیں) میں دوسرے چھوٹے چھوٹے کنوؤں کو ضم کرلیں اور اس پر حوض بنا کر اس کو بھر لیں گے۔ اس طرح ہمیں تو پانی میسر رہے گا لیکن دشمن کی رسائی یہاں تک نہ ہو سکے گی۔ رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: آپ نے زبردست مشورہ دیا ہے۔"[۱۴]

۱۴- سیرت ابن ہشام جلد۲ صفحہ۲۷۲ پر ابن اسحٰق سے مروی حدیث اس طرح ہے: ابن اسحٰق کہتے ہیں: میں نے بنی سلمہ کے کچھ آدمیوں سے یہ حدیث سنی کہ وہ حباب بن منذر کا ذکر کر رہے تھے......الخ۔۔۔شیخ البانی محمد الغزالی کی فقہ السیرۃ کی تخریج میں اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ ابن اسحٰق اور بنی سلمہ کے درمیان واسطہ کے مجہول ہونے کی بنا پر یہ سند ضعیف ہے۔ (جب کہ بنی سلمہ کے یہ لوگ بھی مجہول ہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ لوگ حباب بن منذر کو ملے بھی ہیں یا نہیں) حاکم نے مستدرک جلد۳ صفحہ۴۲۷ پر اسے موصول بیان کیا ہے مگر صحیح نہیں کہا۔ ذہبی نے اسے منکر کہا ہے مگر ابن حجر نے الاصابہ جلد۱ صفحہ۴۲۷ پر سیرت ابن اسحٰق کے طریق سے موصول روایت کیا ہے۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں: یزید بن رومان نے عروہ اور کچھ دوسرے لوگوں سے حدیث روایت کی ہے، یہ سب لوگ ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔ عروہ نے حباب کے قول کا ذکر کیا ہے......الخ...... یہ سند عروہ تک تو صحیح ہے مگر حباب تو خلافت عمرؓ میں ہی فوت ہو گئے تھے اور عروہ خلافت عمرؓ کے اواخر میں پیدا ہوئے، ان کی حباب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ حدیث مرسل ہے اور اسے ان صحابہؓ کے درمیان اس واقعہ کی شہرت کے باعث تقویت ملی جنھیں عروہ ملے ہیں۔ اور ایسے صحابہ تو بہت سے ہیں جو اپنے بچوں کو غزوات کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ اس حدیث کا ضعیف سند کے ساتھ ذکر شاید ابن شاہین کے ہاں بھی ملتا ہے اور الاصابہ میں بھی۔ سیرت کی کتب میں حباب کی یہ خبر منقول ہے اور اسے قبول کیا گیا ہے۔

حضرت حباب بن منذرؓ دراصل یہ وضاحت چاہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے پڑاؤ کے لیے جس جگہ کا انتخاب کیا ہے آیا یہ وحی الٰہی کے مطابق ہے، اگر ایسا ہے تب تو ہر حال میں وحی کا حکم ہی نافذ ہونا چاہیے اور اس کی سمع وطاعت کے بغیر چارہ نہیں! یا پڑاؤ کی اس جگہ کا انتخاب اس عسکری وحربی حکمت عملی کا حصہ ہے جسے آپؐ نے بحیثیت سالار معرکہ وامام مسلمین اختیار کیا ہے۔ اگر صورتِ واقعہ یہ تھی تب تو وہ اپنی رائے دے سکتے تھے، خصوصاً اس اعتبار سے کہ وہ اس علاقہ اور اس کی اہم جگہوں سے خوب واقف تھے، جیسا کہ ابن سعد نے ذکر کیا ہے۔ (۱۵)

حضرت حبابؓ نے اپنا منصوبہ پیش کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی تحسین فرمائی اور اپنی رائے چھوڑ کر ان کی رائے اختیار کی، اسے نافذ کیا اور بھرپور انداز میں فرمایا: لَقَدْ أَشِرْتَ بِالرَّأْيِ.

اسی طرح سعد بن معاذؓ نے آپؐ کے لیے ایک خیمہ بنانے کی تجویز پیش کی تا کہ آپؐ اس میں بیٹھ کر دور سے ہی معرکہ کی نگرانی کر سکیں، آپؐ نے ان کی بھی تحسین فرمائی اور ان کی تجویز بھی زیر عمل آئی۔ (۱۶)

غزوۂ احزاب میں سلمان فارسیؓ نے نبی کریم ﷺ کو مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کی تجویز دی تھی۔ نبی کریمؐ نے ان کا یہ مشورہ وتجویز قبول کی اور اس پر عمل بھی ہوا۔ مشرکین کے گھوڑ سوار لشکر جب سرپٹ بھاگتے ہوئے مدینہ کی طرف بڑھے تو خندق دیکھ کر پکار اٹھے: اللہ کی قسم! اس طرح کی جنگی حکمت عملی عرب وضع نہیں کر سکتے۔ یہ کسی باہر کے آدمی کی رائے ہوگی۔ (۱۷)

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ مسلمانوں نے ایسے اسلوب اختیار کیے جن سے روم و فارس وغیرہ اپنے دشمن کا مقابلہ کرتے تھے اور یہ انداز ان کے لیے مددگار بھی ہوتے تھے۔ بڑی بات یہ تھی کہ تمام چیزیں ان کی زندگی کے لیے خیر کا باعث ہی بنتی تھیں۔ اس لیے کہ حکم وسائل و ذرائع کی ذات پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ ان کے مقاصد پر عائد ہوتا ہے۔

۱۵- طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۵ مطبوعہ بیروت

۱۶- سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۷۲-۲۷۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی۔ بیروت

۱۷- سیرت ابن ہشام: جلد ۱ ص ۲۳۵

۸- ہر نفع بخش علم حاصل کرنا

نبی کریم ﷺ ہر اس علم کے حصول کی ترغیب دیتے ہیں جس سے اسلام اور اہل اسلام کو فائدہ پہنچ سکتا ہو، خواہ یہ علم غیر مسلموں سے ہی کیوں نہ حاصل کیا جائے۔ معلوم ہے کہ آپؐ نے مشرکین کے قیدیوں سے بدر میں اپنے بچوں کو کتابت سکھا کر کیسے ان سے استفادہ کیا۔ ابن ماجہ و ترمذی نے ایک حدیث روایت کی ہے:

اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ، أَنّٰى وَجَدَهَا، فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا(۱۸)

''حکیمانہ قول مؤمن کی گمشدہ متاع ہے یہ جہاں بھی اسے ملے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اسے حاصل کرے۔''

حضرت علیؓ کا قول ہے:

''علم مؤمن کی گمشدہ متاع ہے، اسے حاصل کرو خواہ مشرکین کے پاس سے ہی حاصل کرنا پڑے۔''(۱۹)

مذکورہ اُصول کا انطباق زیادہ تر ان مادی علوم کے نتائج پر ہی ہوتا ہے جن پر ان کے موجدین و مخترعین کے عقائد و افکار کی کوئی چھاپ نہ ہو۔ کیوں کہ یہ علوم قوانینِ طبعیہ سے متعلق ہوتے ہیں اور ہر مؤمن و کافر ان قوانین کا معترف ہوتا ہے اور نیک و فاجر ان کے اجراء کو مانتا ہے۔

اسی لیے مسلمانوں نے علومِ فطرت طب، کیمیا، فلکیات، بصریات، ریاضیات وغیرہ اور قدیم تہذیبوں کی اقوامِ یونان، فارس اور روم سے متعلق علومِ تاریخ حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

ایسا معاملہ مذکورہ علوم سے ہی مخصوص ہے۔ اُن تعلیمات و مطالعات کا معاملہ اس سے مختلف ہے جن کا تعلق دین اور اس کے مبادیات و مفاہیم سے ہو اور یہ تعلیمات اپنے قاری و متعلم پر سوسائٹی، تاریخ، انسان، فطرت اور اللہ کے بارے میں ایک تاثر چھوڑ جاتی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کو ناپسند کیا تھا جب حضرت عمرؓ کو اہل کتاب کے صحیفے کو پڑھتے دیکھا تھا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرما کر ایسی کتب سے بے نیاز کر

۱۸- حدیث ضعیف الاسناد ہے لیکن معناً صحیح ہے۔

۱۹- جامع بیان العلم جلد ا ص ۱۲۱

دیا ہے جن میں تحریف وتبدل ہو چکا۔ اللہ کے فرمودات انسانی خیالات وخواہشات سے گڈمڈ کر دیے گئے۔ اس طرح ان کتب کے محفوظ ومأمون ہونے کی حیثیت ہی مشکوک ہوگئی اور دین تو ایسے معصوم ومحصون اور محفوظ ومأمون مصدرِ الٰہی سے ہی حاصل کرنا ضروری ہے جس کی نسبت اللہ کی طرف ثابت ویقینی ہو۔

امام احمدؒ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

أَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِؓ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ بِكِتَابٍ أَصَابَهُ مِنْ بَعْضِ أَهْلِ الْكِتَابِ. فَرَآهُ النَّبِيُّ ﷺ فَغَضِبَ فَقَالَ: أَمُتَهَوِّكُونَ فِيهَا يَا ابْنَ خَطَّابٍ؟ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً، لَا تَسْأَلُوا عَنْ شَيْءٍ فَيُخْبِرُوا بِحَقٍّ فَتُكَذِّبُوا بِهِ أَوْ بِبَاطِلٍ فَتُصَدِّقُوا بِهِ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي[20]

''عمر بن خطابؓ نبیؐ کے پاس اہل کتاب کی کوئی کتاب لے آئے۔ نبیؐ نے اسے دیکھا تو غضب میں آ گئے اور فرمایا: ''ابن خطاب! کیا تم ابھی تک اسی میں حیران کھڑے ہو؟ اس ہستی کی قسم! جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔ میں تمھارے پاس ایک شفاف و چمکدار کتاب لے کر آیا ہوں۔ تم ان لوگوں سے کسی بارے میں سوال نہ کرو کہ وہ تمھیں اس کے متعلق حق بات بتا دیں اور تم اس کو جھٹلا بیٹھو یا وہ غلط بات بتا دیں اور تم اس کی تصدیق کر بیٹھو۔ اس اللہ کی قسم! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر موسیٰ علیہ السلام بھی حیات ہوتے تو میرے اتباع کے بغیر ان کے لیے بھی کوئی چارہ نہ ہوتا۔''

۲۰۔ احمد نے اسے روایت کیا ہے جیسا کہ شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا کی ''ترتیب المسند''، کتاب العلم حدیث ۶۲ میں ہے، صاحبِ ''تنقیح'' سے اس کی تخریج سے متعلق نقل کیا گیا ہے کہ اس کے رجال حسن کے رجال کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ حدیث احمد اور ابن ماجہ کے ہاں ابن عباس سے مروی ہے اس کی اسناد حسن ہے۔ ابن حبان نے بھی جابر سے صحیح الاسناد کے ساتھ روایت کی ہے۔ احمد اور ابن سعد کے ہاں ایک دوسرے باب میں عبداللہ بن ثابت انصاری سے مروی ہے۔ اور حاکم نے اسے ''الکنٰی''، طبرانی نے ''الکبیر'' اور بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں روایت کیا ہے۔ دارمی کے ہاں جابر کی سند سے مروی ہے۔
الفتح الربانی جلد ۱ صفحہ ۱۷۵

نبی کریمؐ غضبناک ہو گئے، آپؐ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آپؐ نے اس کی مذمت میں سختی اختیار کی۔ یہاں معاملہ دین کا تھا اور دین صادق المصدوق کے علاوہ کسی سے لیا نہیں جا سکتا ہے۔

ہاں! علوم وفنونِ حیات اور دیگر علوم جنھیں لوگ اپنے فکر و فلسفہ، غور وخوض اور تجربات سے حاصل کرتے ہیں یہ تو ملکیت عامہ ہے۔ جو شخص بھی یہ علوم سکھانے کے لیے تیار ہو اس سے سیکھ لینے چاہییں۔ مشرق ومغرب میں انھیں تلاش بھی کرنا چاہیے۔ ان علوم کا جاننے والا کوئی مسلمان ہو یا مشرک اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں نبی کریم ﷺ نے مسلمان بچوں کو کتابت سکھانے کے لیے مشرک قیدیوں سے استفادہ کیا تاکہ ناخواندگی کا خاتمہ ہو، غزوۂ خندق میں اہل فارس کا انداز اختیار کرتے ہوئے خندق کھودی، محاصرہ طائف میں منجنیق کا استعمال کیا اور ایک رومی بڑھئی کے ہاتھ کے بنے ہوئے منبر پر خطبہ دیتے رہے۔

تاریخ بھی بتاتی ہے کہ آپ کے خلفائے راشدین نے امت مسلمہ میں ایسے امور کو رواج دیا جو اہل عرب میں رائج نہ تھے اور نہ وہ ان سے واقف تھے۔ ان امور میں انھوں نے غیر اقوام سے استفادہ کیا تھا اس لیے کہ انھوں نے ان کے اندر فائدہ ونفع دیکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے بعض صحابہؓ کی تجاویز کو قبول کیا اور اسلامی تقویم (کیلنڈر) کا اجراء کیا، اور مختلف امور ومسائل کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے رجسٹر مرتب کرنے کا اہتمام کیا۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ رجسٹروں کی تدوین کا آغاز تو ہجرتِ مدینہ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ گزشتہ صفحات میں کتابی حساب کتاب کا ذکر آچکا ہے جو اس کی مثال ہے۔[۲۱]

۹- اوہام وخرافات پر ضرب کاری

قرآن وسنت کی عطا کردہ ان تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم اوہام وخرافات اور شعبدہ بازیوں پر سخت ضرب ہے جو بار بار لگائی گئی۔ توہم پرستی وجادوگری کا یہ بازار دورِ جہالت میں نفع بخش منڈی کی صورت اختیار کر گیا تھا اور یہ سب کچھ ان ادیانِ سماویہ کے سائے تلے ہو رہا تھا جو محرّف ومبدّل اور خود ساختہ تھے۔ اس پیشہ کی مارکیٹ بنانے کے لیے دلال مارے مارے پھرتے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے تھے لوگ اسے سچ سمجھتے تھے۔ وہ جو حکم دیتے تھے لوگ اسے مانتے تھے۔ وہ

۲۱- دیکھیے: "التراتیب الاداریہ" یا "نظام الحکومۃ النبویۃ" للکتانی جلد ۱ صفحہ ۲۲۷-۲۲۸

لوگوں کو بلاتے تھے تو لوگ ان کی بات پر لبیک کہتے تھے۔ یہ کاہن و قیافہ باز اور جادوگر و شعبدہ باز نجومی تھے۔ بزعم خویش وہ کائنات کا نظام درہم برہم کرنے، غیب سے پردہ ہٹانے اور سینوں کے راز کھول دینے پر قادر تھے۔

اسلام نے اس تباہ کن بازار کے دروازے پوری قوت و طاقت کے ساتھ بند کر دیے۔ اس کے پیشہ ور تاجروں اور دھوکہ باز دلالوں پر سخت سنگ باری کی۔ اس منڈی کے جعلی اور بناوٹی مال کو ضبط کر کے رکھ دیا۔ اور پوری وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ نظامِ کائنات میں جاری اللہ کے قوانین تبدیل نہیں ہو سکتے۔ غیب کا علم اللہ کے سوا کوئی نہیں رکھتا، انسانیت کی خیر و فلاح قوانین الٰہیہ کے احترام اور اسباب و مسببات کے ضابطہ کو ماننے بغیر ممکن نہیں۔

یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے، اس لیے کہ اجلی ستھری سیرت پاک میں سنن کا مطالعہ ہمیں یہی کچھ بتاتا ہے۔ امام بخاریؒ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے: وہ کہتے ہیں: پیارے نبیؐ کے بیٹے ابراہیم (جو ام المؤمنین ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے) کی وفات کے دن سورج گرہن ہو گیا، لوگ کہنے لگے۔ یہ ابراہیم کی موت کے باعث ہوا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهٖ ''سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے انھیں گرہن نہیں لگتا۔'' نبی کریم ﷺ نے یہ فرما کر عہد جاہلیت کے اس تصور کو یکسر رد کر دیا جو لوگوں میں عام تھا کہ سورج و چاند گرہن کسی بڑی شخصیت کی موت کی وجہ سے ہوتا ہے، اور یہ واضح کر دیا کہ یہ گرہن آیاتِ الٰہی میں سے ایک آیت (نشانی) ہے جو اللہ کے مقرر کیے ہوئے طریقے پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔

دیگر بہت سی احادیث بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہیں:

''اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ'' قَالُوْا وَمَا هُنَّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ: ''اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ......الخ''[۲۲]

''سات تباہ کن چیزوں سے بچو'' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! یہ چیزیں کونسی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا کرانا......الخ۔''

۲۲- بخاریؒ و مسلمؒ اور دیگر نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

وَمَنْ عَقَدَ عُقْدَةً ثُمَّ نَفَثَ فِيهَا فَقَدْ سَحَرَ، وَمَنْ سَحَرَ فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِّلَ إِلَيْهِ(۲۳)

''جس نے گرہ لگا کر اس میں پھونکا اس نے جادو کیا اور جس نے جادو کیا اس نے شرک کیا، اور جس کسی نے تعویذ لٹکایا اسے اس تعویذ کے ہی سپرد کر دیا گیا۔''

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَطَيَّرَ أَوْ تُطِيِّرَ لَهُ أَوْ تَكَهَّنَ أَوْ تُكُهِّنَ لَهُ أَوْ سَحَرَ أَوْ سُحِرَ لَهُ وَمَنْ أَتٰى كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ، كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ(۲۴)

''وہ ہم میں سے نہیں جس نے شگون لیا یا جس کے لیے شگون لیا گیا، جس نے کاہنوں والا عمل کیا یا جس کے لیے ایسا کیا گیا، جس نے جادو کیا یا جس کے لیے جادو کیا گیا اور جو کسی کاہن کے پاس گیا اور اس کی بات کی تصدیق کی اس نے محمدؐ پر نازل ہونے والے دین کا انکار کیا۔''

مَنْ أَتٰى عَرَّافًا أَوْ كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ(۲۵)

''جو کسی کاہن کے پاس آیا اور اُس کی باتوں کی تصدیق کر دی تو اس نے اُس چیز کا انکار کیا جو محمدؐ پر نازل کی گئی ہے۔''

۲۳- نسائی نے اسے حسن کی روایت سے عن ابی ہریرہ کے طریق سے روایت کیا ہے اور ہم ذکر کر آئے ہیں کہ ان کے سماع کا ثابت ہونا راجح ہے۔

۲۴- بزار نے جید اسناد کے ساتھ اسے حدیث عمران بن حصین سے روایت کیا ہے۔ طبرانی نے حدیث ابن عباس سے وَمَنْ أَتٰی سے آخر تک کے الفاظ کے علاوہ پوری روایت حسن سند کے ساتھ روایت کی ہے جیسا کہ ترغیب میں حدیث ۴۳۸۴ ہے، بزار نے حدیث جابر سے آخری جملہ بسند جید روایت کیا ہے دیکھیے ترغیب ۴۳۸۸

۲۵- اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے لیکن ان سب کی اسناد میں کلام ہے۔ اسے منذری نے مختصر السنن میں ذکر کیا ہے، حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے: بخاری و مسلم کی شرط پر یہ صحیح ہے۔

وَمَنْ أَتٰى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ فَصَدَّقَهُ. لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ يَوْمًا. (۲۶)

''جو کسی کاہن کے پاس گیا پھر اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا اور اس کے جواب کو درست مان لیا، اس شخص کی نماز چالیس دن تک قبول نہ ہوگی۔''

ابن مسعودؓ سے موقوف روایت مروی ہے:

مَنْ أَتٰى عَرَّافًا أَوْ سَاحِرًا أَوْ كَاهِنًا يُؤْمِنُ بِمَا يَقُولُ، كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (۲۷)

''جو کسی کاہن یا جادوگر کے پاس گیا اور اس کی بات کو مان لیا تو اس نے اس چیز کا کفر کیا جو محمدؐ پر نازل کی گئی۔''

کاہن اس شخص کو کہتے ہیں، جو بعض خفیہ باتوں کی خبر دے، ان میں سے کچھ درست ہوتی ہیں اور اکثر غلط ہوتی ہیں، اس کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ جن اسے باتیں بتاتا ہے۔

عرّاف (پیش گو) بھی کاہن کی طرح ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جادوگر ہوتا ہے۔ امام بغویؒ فرماتے ہیں: پیش گو وہ ہے جو معاملات کے مقدمات و اسباب کی بنیاد پر ان کے وقوع پذیر ہونے کی جگہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے علم کا دعویٰ کرتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کی کوئی چیز چوری ہو جائے تو اسے یہ بتانا کہ چور کون ہے، چیز گم ہو جائے تو اس کے گم ہونے کی جگہ کی نشاندہی کرنا، وغیرہ۔

کاہن و عراف کی ایک مثال نجومی بھی ہے۔ نجومی وہ ہے جو نجوم اور کائنات ارضی میں ان کے اسرار و تاثرات کے علم کی بنیاد پر مستقبل کی خفیہ خبریں بتانے کا دعویدار ہو۔ بعض لوگ نجومی کو کاہن ہی کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

مَنِ اقْتَبَسَ عِلْمًا مِنَ النُّجُومِ فَقَدِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ، زَادَ مَا زَادَ (۲۸)

۲۶- حاکم نے اسے روایت کیا ہے۔

۲۷- طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں جیسا کہ ترغیب حدیث ۴۳۹۵ میں ہے۔

۲۸- احمد، ابوداؤد و ابن ماجہ نے حدیث ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ نووی نے ''الریاض'' میں اور ذہبی نے ''الکبائر'' میں کہا ہے: ابوداؤد کی سند صحیح ہے۔ دیکھیے الفیض جلد ۶/۸۰

''جس نے علم نجوم سے کچھ سیکھا گویا اس نے جادو کی ایک قسم سیکھی، وہ جس قدر اس میں آگے بڑھتا جائے گا اسی قدر جادو میں آگے بڑھتا رہے گا۔''

یہاں علمِ نجوم سے مراد علمِ فلکیات (Astronomy) نہیں ہے، (جیسا کہ اس سے پہلے اسے نام دیا جاتا تھا) علم فلکیات تو وہ علم ہے جس میں بہت سے مسلمان علماء نے تحقیق و جستجو کی اور دورِ حاضر میں اس کی تحقیق کا میدان بڑا وسیع ہے اور اس کی شاخیں کثیر ہیں، یہ وہ علم ہے جس کی بنیاد مشاہدہ، تجربہ، قیاس اور آلات کے استعمال پر قائم ہوتی ہے۔ اسی علم سے یہ ممکن ہوا کہ انسان چاند تک پہنچ گیا ہے اور وہاں کی مٹی اور پتھر لانے میں کامیاب ہوا ہے تا کہ ان نمونوں کا تجربہ کر کے وہ اس جہاں سے آگے بھی پیش رفت کر سکے۔

اس معاملہ میں اور کسی دینی حقیقت یا شرعی قاعدہ و اُصول یا قرآن و سنت کی کسی ثابت شدہ نص میں قطعاً کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے۔

یہ موقع نہیں ہے کہ اس قول باری تعالیٰ سے استدلال پیش کروں اور نہ یہ موقع ہی ہے کہ السلطان کی تفسیر علم کروں جیسا کہ بعض علمائے عصر نے کی ہے:

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا، لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ [الرحمٰن:۳۳]

''اے گروہِ جن وانس اگر تم زمین و آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو، نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑا زور چاہیے۔''

البتہ یہ بات تو عیاں ہے کہ آیت کا سیاق پوری وضاحت کے ساتھ یہ دلالت کر رہا ہے کہ یہ خطاب آخرت کے بارے میں ہے دنیا کے بارے میں نہیں۔ اور اس سے مراد جن وانس کی بے بسی ہے، وہ عدالت الٰہیہ کی گرفت سے کسی طرح بھاگ نہیں سکیں گے اِلَّا یہ کہ اللہ کی سلطنت سے ہی بھاگ نکلیں، اور اللہ کی سلطنت و بادشاہت سے کیسے بھاگ سکتے ہیں اور کہاں جا سکتے ہیں؟ پس ''لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ'' کا معنی ہے لَا تَنْفُذُوْنَ مُطْلَقًا تم ہرگز بھاگ نہیں سکتے کیوں کہ اللہ کی طاقت وسطوت کے سامنے تمھاری قوت و طاقت کی حیثیت ہی کیا ہے۔

جب کہ چاند تک جانا اقطار السمٰوات والارض سے فرار نہیں ہے، اس لیے کہ چاند

تو نظامِ شمسی کے دائرہ گردش میں ہی محوگردش رہتا ہے، بلکہ زمین کے قریب ترین سیارہ چاند ہے، اگر ہم چاند پر جانے والے کو قطر ارض سے خارج کہیں جس طرح کہ بظاہر نظر آتا ہے تو اقطار السماء سے تو وہ ایک لحظہ کے لیے بھی خارج نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ قرآن کا کہنا ہے کہ چاند آسمان میں ہے۔

تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَاءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا [الفرقان:۶۱] ''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اُس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

مذکورہ استدلال کی نسبت تسخیر کائنات کا عموماً اور شمس و قمر کا خصوصاً استدلال پیش کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اس نوع کی آیات قرآنِ حکیم میں بہت سی ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ حرام علمِ نجوم وہ ہے جسے جادو کی ایک شاخ کہا گیا ہے اور یہ وہ علم ہے جو نجوم کی تاثیر سے متعلق ہے نہ کہ ان کی تسخیر سے متعلق۔ علماء کا موقف بھی یہی ہے۔[۲۹]

جن تعلیمات کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہ علمی سوچ اور علمی زندگی کے قیام کے لیے بہتر نفسیاتی و سماجی فضا پیدا کرنے میں مددگار ہیں اور ہم اس کی جھلک عروج و توازن کی بلندیوں پر فائز اس اسلامی دور تہذیب و تمدن میں دیکھ چکے ہیں، جس نے زمین کو آسمان سے ملا دیا تھا۔ علم و ایمان کو اکٹھا کر دیا تھا اور مادہ و روح کو باہم جوڑ دیا تھا۔

۱۰۔ طب۔ تجرباتی علم پر رسول اللہ ﷺ کی توجہ کا ایک نمونہ

اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ اسلام نے عام طور پر اور رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر کس تجرباتی علم پر کوئی توجہ دی ہے تو اس کی بہترین مثال طب ہے۔ اس مثال میں ان علوم کے بارے میں قرآن و سنت کا موقف مجسم ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

ضروری ہے کہ یہاں ان بنیادی باتوں کا تذکرہ کر دیا جائے جن کا اسلام نے ہی اہتمام کیا ہے اور ان مبادیات پر صحیح سائنسی طب کی ایک مضبوط عمارت قائم کی ہے۔

۲۹۔ دیکھیے: فیض القدیر جلد ۳ صفحہ ۲۵۶، جلد ۶ صفحہ ۸۰

اولاً: اسلام نے انسان کے بدن کا حق اور اس کی قدر و قیمت کا اعتراف کیا ہے اور اس حق کی ادائیگی پر زور دیا ہے:

اِنَّ لِبَدَنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا ''تجھ پر تیرے بدن کا حق ہے''

بدن کا حق یہ ہے کہ بھوک کے وقت اسے غذا ملے، تھکاوٹ کے وقت آرام پہنچے اور آلودہ ہو جائے تو اسے صاف کیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی اس کا حق ہے کہ بیماری کے وقت اس کا علاج کرایا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بدن کا حق واجب ضرور ہے لیکن انسان اس کی ادائیگی میں اس قدر منہمک نہ ہو جائے کہ وہ اُن دیگر حقوق کو بھول جائے جن میں اللہ عز و جل کا حق بھی شامل ہے۔ احادیث میں تو واضح طور پر اعتدال کا رویہ اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کا منہج اس کے نبی کی سنت اعتدال ہی ہے۔ اور سنت کے بارے میں فرمایا: فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّی ''جو میری سنت سے روگردانی کرے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔''

اسلام نے ترکِ دنیا کے ان مذاہب میں چھائی ہوئی اس فکر کو بھی باطل قرار دیا ہے کہ روح کی ترقی کے لیے جسم کو سختیوں میں مبتلا رکھا جائے۔ اسلام نے تو یہ واضح کیا ہے کہ انسان کا وجود دو چیزوں ''جسم اور روح'' پر قائم ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کی بہتری و نمو کی خاطر مشقت میں کیسے ڈالا جا سکتا ہے؟

ثانیاً: بہت سے لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ بیماری کا علاج ایمان بالقدر کے منافی ہے۔ اسلام نے اس مشکل کو بھی حل کر دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے ادویات کے ذریعے علاج کرنے کرانے اور پرہیز کرنے کے بارے میں پوچھا گیا: هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا کہ کیا یہ چیزیں تقدیر کے فیصلے میں کوئی تبدیلی و کمی بیشی کر سکتی ہیں؟

اس پر آپ ؐ کا جواب بڑا واضح اور قطعی تھا کہ هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ[30]

30- اسے ابوخزامہ کی حدیث سے ترمذی، ابن ماجہ، احمد اور حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے اس کے باوجود کہ اس میں ابوخزامہ ہے اور وہ مجہول ہے، اس کے باقی رجال ثقہ ہیں۔

یعنی "(علاج کے لیے دوا استعمال کرنا اور پرہیز اختیار کرنا) یہ بھی تقدیر میں سے ہی ہے۔"

آپؐ نے اس جواب کے ساتھ یہ واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسباب و مسبّاب کا اکٹھا اندازہ کرتا ہے۔ جس طرح اس کا یہ مقدر کرنا ہے کہ بیماری فلاں فلاں نتائج چھوڑے گی اسی طرح اس نے یہ بھی مقدر کر رکھا ہے کہ اس کی دوا فلاں فلاں طریقے سے ہوگی اور اس کی حفاظتی تدابیر فلاں فلاں ہوں گی۔ سمجھدار مؤمن تو وہ ہے جو اللہ کی تقدیر کا دفاع اللہ کی تقدیر سے ہی کرتا ہے جیسا کہ وہ اللہ کی ایک تقدیر سے اللہ کی دوسری تقدیر کی جانب بھاگتا ہے۔

ثالثاً: بیماری خواہ کوئی ہو، اس سے شفا کا امکان پیدا کر کے اسلام نے مریض و معالج کے لیے امید کا ایک دروازہ وا کر دیا ہے۔ جسم و جان کو ریزہ ریزہ کر دینے اور گھلا کر رکھ دینے والی ناامیدی کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ اور اس تصور و سوچ کا بھی خاتمہ کر دیا ہے کہ کوئی بیماری ایسی بھی ہے جو لاعلاج ہے۔ اس بارے میں بہت سی احادیث موجود ہیں۔

- مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ دَاءً اِلَّا أَنْزَلَ لَهٗ شِفَاءً [بخاری عن ابی ہریرہؓ]

  "اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری اتاری ہے اس کی شفا بھی اتاری ہے۔"

- لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ، فَإِذَا أَصَابَ دَوَاءُ الدَّاءَ بَرِىءَ بِإِذْنِ اللّٰهِ [رواہ مسلم واحمد عن جابرؓ]

  "ہر بیماری کی دوا ہے جب بیماری کو دوا پہنچ جاتی ہے تو مریض اللہ تعالیٰ کے حکم سے شفایاب ہو جاتا ہے۔"

- جَاءَ اَعْرَابِیٌّ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَنَتَدَاوٰى؟ قَالَ نَعَمْ، فَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَنْزِلْ دَاءً اِلَّا أَنْزَلَ لَهٗ شِفَاءً. عَلِمَهٗ مَنْ عَلِمَهٗ وَ جَهِلَهٗ مَنْ جَهِلَهٗ [رواہ احمد عن اسامۃ ابن شریک]

  "ایک دیہاتی عرب نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: یا رسول اللہؐ! کیا ہم علاج کر لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری اتاری ہے تو اس کی شفا بھی اتاری ہے۔ البتہ اس کو جاننے والے جانتے ہیں اور نہ جاننے والے نہیں جان پاتے۔"

دوا تو اللہ کی پیدا کردہ چیزوں میں سے ہی ہے۔ یہ اہل علم اور ماہرین پر منحصر ہے کہ وہ تحقیق کریں، جستجو کریں، محنت کریں اور اسے تلاش کر لیں، ناامید ہو کر اپنے ہتھیار نہ ڈال دیں۔ ایک نہ ایک دن تو وہ ضرور اس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں وہ پہنچنا چاہتے ہیں۔

امام شوکانیؒ تو یہاں تک کہتے ہیں:

حدیث میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ اس شخص کو علاج کرانے میں کوئی حرج نہیں جس کے علاج سے ڈاکٹر مایوسی اور بے بسی کا اظہار کر چکے ہوں۔

رابعاً: اسلام نے متعدی امراض کے بارے میں سنت الٰہیہ کا بھی اعتراف کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ فِرَارَکَ مِنَ الْاَسَدِ ''مجذوم سے اس طرح دور بھاگو جس طرح شیر سے دور بھاگتے ہو۔'' اور آپؐ نے مجذوم کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر بیعت لینے سے احتراز فرمایا۔ بلکہ آپؐ نے جانوروں میں بھی امراض کی چھوت کا اعتراف کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: لَا یُوْرِدَنَّ مُمَرِّضٌ عَلٰی مُصِحٍّ ''متعدی امراض میں مبتلا اونٹوں کا مالک اپنے اونٹوں کو پانی پلاتے وقت صحت مند اونٹوں سے نہ ملائے۔'' ممرض سے مراد خارش زدہ اونٹوں کا مالک ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ پانی پلاتے وقت مرض زدہ اونٹوں کو تندرست اونٹوں سے دور رکھے۔

رہا معاملہ حدیث ''لَا عَدْوٰی'' کا، یعنی کوئی بیماری متعدی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اشیاء اپنی فطرت اور طبیعت کے اعتبار سے متعدی نہیں ہوتیں بلکہ ان میں یہ تاثیر تو اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوتی ہے جو اس نے خلق میں جاری کر رکھی ہے۔

اسی طرح صحت مند و تندرست کا ایسے مریضوں سے دور رہنا بھی ثابت ہے جن سے امراض لگ جانے کا خطرہ ہو۔ آپؐ نے طاعون کے بارے میں حکم دیتے ہوئے فرمایا:

اِذَا سَمِعْتُمْ بِہٖ بِاَرْضٍ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَیْہِ، وَاِذَا وَقَعَ وَاَنْتُمْ بِاَرْضٍ فَلَا تَخْرُجُوْا مِنْھَا فِرَارًا مِنْہُ. [متفق علیہ]

''جب تم کسی زمین کے بارے میں سن لو کہ وہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور جب کسی ایسی زمین میں پھوٹ پڑے جہاں تم موجود ہو تو پھر اس کے ڈر سے وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔''

خامساً: طبِ روحانی یعنی کہانت و جادوگری جس کی مثالیں تعویذات و تمائم اور کوڑی وغیرہ کا دھندہ اختیار کرنے والے لوگ تھے، یہ کاروبار دورِ جہالت میں خوب چل رہا تھا، اور اس کی منڈی بڑی نفع بخش تھی لیکن اسلام نے اس کا مقابلہ کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اسے باطل قرار دے کر شرک ٹھہرایا۔ اس کے خلاف سخت جنگ کا اعلان کیا اور کسی جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے یا آسیب کا اثر زائل کرنے کے لیے کسی طریقے و عمل کی اجازت نہ دی سوائے اس کے کہ اس میں اللہ کا ذکر ہو اور اس کے اسماء حسنٰی ہوں کیوں کہ یہ تو محض دعا ہے اور دعا شرعاً قابل تعریف ہے۔

سادساً: ایسی صحیح طب جو محض دہشت انگیزی و دعویداری پر نہیں بلکہ علم و تجربہ پر قائم ہو، رسول اللہ ﷺ اپنے قول و عمل اور تقریر و تبویب کے ساتھ اس طب کے بارے میں بہترین اسوہ پیش کرتے ہیں۔

آپؐ نے خود اپنا بھی علاج کرایا اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا کیوں کہ جس ذات نے بیماری پیدا کی ہے اسی نے دوا بھی پیدا کی ہے۔ آپؐ نے ابی بن کعبؓ کے پاس ایک طبیب کو بھیجا، اس نے ابی کی ایک رگ کاٹی اور اسے آگ سے داغ دیا۔[31] یعنی آپؐ نے اس (کے لیے) عمل جراحی کا اجراء کرایا) یعنی آپریشن کرایا۔ دوسرا واقعہ یہ کہ بنی ثقیف کا مشہور طبیب حارث بن کلدہ آیا تو آپؐ نے سعد بن ابی وقاصؓ کے ساتھ بھی ایسا ہی کرنے کا فرمایا۔[32]

حارث بن کلدہ کا مسلمان ہونا ثابت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے طب کے میدان میں اہل کفر سے استعانت کو جائز قرار دیا ہے۔[33] جب کہ راجح اور بہتر تو یہی ہے کہ مسلمان کا علاج مسلمان ہی کرے مگر یہ یاد رہے کہ یہاں یہ احکام شرعی ہیں جس طرح رمضان وغیر رمضان میں روزہ چھوڑنے کا جواز ہے۔ یہ بھی طبیب سے متعلق حکم کے مطابق ہی ہے۔

ایک صحابیؓ کو زخم لگا اور خون منجمد ہو گیا۔ آپؐ نے بنی انمار کے دو آدمیوں کو بلایا۔ انھوں نے زخمی کو دیکھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: اَيُّكُمَا أَطَبُّ تم میں سے زیادہ ماہر کون ہے؟ انھوں نے کہا: أَ فِي الطِّبِّ خَيْرٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ ''یا رسول اللہ ﷺ کیا طب میں کوئی

۳۱- مسلم

۳۲- ابوداؤد

۳۳- التراتیب الاداریہ، الکتانی جلد ۱/ ۴۵۷

بھلائی (فائدہ) بھی ہے؟" آپؐ نے فرمایا: اَنْزَلَ الدَّوَاءَ الَّذِیْ اَنْزَلَ الدَّاءَ[۳۴] "جس نے بیماری اتاری ہے اس نے دوا بھی اتاری ہے۔"

ابن قیمؒ کہتے ہیں:

"اس حدیث میں یہ حکم ہے کہ ہر علم وفن میں اس کے ماہر متخصص سے مدد لی جائے کیوں کہ وہ درستی کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔"[۳۵]

سابعاً: نبی کریم ﷺ سے مروی ہے:

مَنْ تَطَبَّبَ وَلَمْ يُعْلَمْ عَنْهُ الطِّبُّ فَهُوَ ضَامِنٌ[۳۶]

"جس نے طب کا پیشہ اختیار کیا اور وہ طب کو جانتا نہیں تھا تو وہ (اس کے نقصان) کا ذمہ دار ہوگا۔"

آپؐ نے اس حکم کے ساتھ ان جعلی وعطائی ڈاکٹروں کا ناطقہ بند کر دیا ہے جو ڈاکٹروں اور طبیبوں کا لبادہ اوڑھے بیٹھے ہیں۔ آپؐ نے اس مسئولیت کا بوجھ اور ذمہ داری بھی انھی پر ڈالی ہے جو غلط تشخیص اور علاج کے معاملے میں ان سے ہوگی اور اہل علم وفن اور ماہرین کے احترام و مقام کا خیال رکھنا بھی ضروری ٹھہرایا ہے۔ ہر علم کے جاننے والے اور ہر صنعت کے ماہرین مخصوص ہوتے ہیں: وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ

ان سات بنیادی نکات میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ طب سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے موقف پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ یہ وہ موقف ہے جو یورپ کی بیداری سے صدیوں پہلے کا ہے۔ اسی موقف پر عالم اسلام میں نظری و عملی طب (Theoritical and Practical Medicen) کی بنیاد پڑی۔ اس دور کی کتب یورپی اور دیگر اقوام کے لیے صدیوں مراجع (References) کا کام دیتی رہیں۔ اس سلسلے میں ابن سینا کی "القانون" رازی کی "الحاوی" اور ابن رشد کی "الکلیات" کا تذکرہ ہی کافی ہے۔

---○○---

۳۴- موطا امام مالک

۳۵- زاد المعاد لابن قیم جلد ۳/ ۲۲۵

۳۶- ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے حدیث عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے۔ حاکم نے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے بھی ان کی تائید کی ہے۔ دیکھیے: فیض القدیر ج ۶ ص ۱۰۶

اخلاقیاتِ علم

اسلام کی نظر میں علم محض معلومات اکٹھا کر لینے کا نام نہیں۔ خواہ یہ معلومات اپنے موضوع کے اعتبار سے جلالت قدر کی حامل ہوں اور مسلّمہ طریق سے حاصل کی گئی ہوں۔ یہاں تک کہ طریق نبوت سے حاصل ہونے والا علم، جو ''اعلیٰ علم'' ہے، اس کو بھی محض سیکھ لینا اور حاصل کر لینا کافی نہیں، بلکہ ایک اہل علم کے لیے ان اخلاقی قدروں کا التزام ضروری ہے جو علم اس کے لیے لازمی قرار دیتا ہے، یہی وہ اوصاف و اقدار ہیں جن کے باعث اہل علم انبیاء کے وارث قرار پاتے ہیں۔

ہم یہاں حدیث نبوی کی روشنی میں ان اخلاقی فضائل کا ذکر کرتے ہیں، جن سے آراستہ ہونا اہل علم کے لیے واجب ہے۔

۱۔ مسئولیت کا احساس

ان بنیادی باتوں میں سے اولین بات اللہ کے سامنے مسئولیت و جوابدہی کا احساس ہے۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ چونکہ نبوت کے مقام سے بلند کوئی مرتبہ نہیں لہٰذا اس رتبہ کے ورثا کے مقام و مرتبہ جیسا کوئی مرتبہ نہیں۔ مسئولیت بھی درجات کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اس لیے اس مرتبہ کے حاملین کی مسئولیت اسی حساب سے ہوگی۔

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَنْ تَزُوْلَ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ أَرْبَعِ خِصَالٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَ أَفْنَاهُ؟ وَ عَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَ أَبْلَاهُ؟ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اِكْتَسَبَهُ وَ فِيْمَ أَنْفَقَهُ؟ وَ عَنْ عِلْمِهٖ مَا ذَا عَمِلَ بِهٖ؟ (۱)

۱۔ بزار اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے، ترغیب حدیث ۱۵۶۴ کے الفاظ یہی ہیں۔

''قیامت کے روز کوئی آدمی اس وقت تک قدم نہیں ہلا سکے گا جب تک اس سے چار باتوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے گا۔ اس کی عمر کے بارے میں کہ اسے کس کام میں ختم کیا؟ اس کی جوانی کے بارے میں کہ اسے کس کام میں بڑھاپے تک پہنچایا؟ اس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اور اس کے علم کے بارے میں کہ اس پر کس حد تک عمل کیا؟۔''

انسان کے علم کا دائرہ جیسے جیسے وسیع ہوتا جاتا ہے اس کی مسئولیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ جس طرح ایک مسئلے کا علم رکھنے والا دس مسائل کے جاننے والے کی مانند نہیں ہوسکتا اور جس طرح زیادہ مال کے مالک کا حساب کتاب زیادہ ہوگا۔ اس کے سوال طویل اور جواب مشکل ہوں گے۔ اسی طرح علم کا معاملہ ہے۔ جس کا علم زیادہ ہوگا اور وہ حقائق و معارف کا زیادہ جاننے والا ہوگا اس کی مسئولیت بھی اسی قدر بڑی اور ذمہ داری اسی قدر بھاری ہوگی۔

صاحب علم کی مسئولیت و جوابدہی کے کئی پہلو ہیں:۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ علم سیکھنے اور حاصل کرنے کے بعد اس کی حفاظت و صیانت کا کیا بندوبست کیا؟ اسے ترقی دینے اور بڑھانے کے لیے تحقیق و جستجو سے کس قدر کام لیا؟ شجرِ علم کو بار آور کرنے کے لیے اس پر کس حد تک عمل کیا؟ اسے پھیلانے، بڑھانے اور اس کے فوائد عام کرنے کے لیے کتنے لوگوں کو اس کی تعلیم دی، جو اس کے حصول کے خواہش مند تھے؟ کتنے لوگوں کو تیار کیا کہ وہ اس علمی ورثہ کے وارث اور اس امانت کے محافظ بن جائیں تاکہ اوپر سے چلے آنے والے اس علمی سلسلہ کی کڑیوں میں انقطاع واقع نہ ہو۔

اور اس سب کچھ سے پہلے اللہ کے لیے قبولیتِ علم کی خاطر رکھے جانے والے خلوص کی مسئولیت کا معاملہ ہے۔

حضرت مالک بن دینارؒ حضرت حسن بصریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

مَا مِنْ عَبْدٍ يَخْطُبُ خُطْبَةً اِلَّا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ سَائِلُهُ عَنْهَا-أَظُنُّهُ قَالَ- مَا أَرَادَ بِهَا؟

''رسول اللہؐ نے فرمایا: کوئی آدمی تقریر کرتا ہے تو اللہ اس سے اس کی تقریر کے بارے میں پوچھے گا

(صحابیؓ کا کہنا ہے: میرا خیال ہے، آپؐ نے فرمایا) کہ وہ خطیب و مقرر اس خطبہ سے کیا چاہتا تھا؟"

مالک بن دینارؒ جب یہ حدیث بیان کرتے تو زاروقطار روتے تھے۔ یہاں تک کہ سلسلہ بیان منقطع ہو جاتا۔ پھر کہتے: تم یہ سمجھتے ہو کہ رونے سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوگئی ہیں، یہ تو مجھے معلوم ہے کہ قیامت کے روز اللہ عزوجل مجھ سے پوچھیں گے کہ میں اس رونے سے کیا چاہتا تھا؟(۲)

حضرت ابوالدرداءؓ زاہد و فقیہ صحابیِ رسولؐ کہتے ہیں: میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میرا رب قیامت کے روز مجھے سرعام مخلوق کے سامنے طلب کرے اور مجھے آواز دے: اے عویمر! (ابوالدرداءؓ کا نام عامر تھا اس کی تصغیر عویمر ہے) میں کہوں: میرے رب میں حاضر ہوں! تو اللہ سوال کرے کہ جو علم حاصل کیا تھا اس پر عمل کہاں تک کیا تھا؟(۳)

۲- علم کے امانت ہونے کا احساس

اخلاقیاتِ علم میں امانت و دیانت بھی ہے۔ اور امانت و دیانت تو لوازمِ ایمان میں سے ہیں کیوں کہ جس شخص میں امانت داری نہیں وہ مومن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی صفات میں فرمایا ہے:

وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ. [المؤمنون:۸]

"اور وہ لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں۔"

امانت لوازمِ ایمان میں سے ہے تو خیانت لوازمِ نفاق میں سے ہے۔ منافق کی واضح علامات میں سے ایک علامت یہ ہے کہ:

اِنَّهٗ اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ(۴)

"جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔"

حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تَنَاصَحُوْا فِی الْعِلْمِ فَاِنَّ خِیَانَةَ اَحَدِكُمْ فِیْ عِلْمِهٖ اَشَدُّ مِنْ خِیَانَتِهٖ

۲- ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔
۳- بیہقی نے اسے روایت کیا ہے، ترغیب جلد۱ حدیث ۲۱۵
۴- متفق علیہ

فِیْ مَالِہٖ، وَاِنَّ اللّٰہَ سَائِلُکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ(۵)

''علم کے بارے میں ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہا کرو (تاکہ کوئی علم میں خیانت نہ کرے) تم میں سے کسی ایک کی علمی خیانت اس کی مالی خیانت سے بڑا جرم ہے اور اللہ قیامت کے روز تم سے اس بارے میں پوچھے گا۔''

مالی خیانت خواہ کتنی بڑی ہو اس کے نقصانات محدود ہوتے ہیں جب کہ علمی خیانت تو معاشرے میں خاندانوں کے خاندان تباہ کر دیتی ہے۔

یہ بات بھی امانتِ علم میں سے ہے کہ کسی نظریے اور قول کو اسی شخص سے منسوب کیا جائے جس کا وہ ہے۔ کسی دوسرے کے علم سے استفادہ کر کے اس کی فضیلت و برتری کو خود سے منسوب نہ کیا جائے۔ یہ تو چوری ہے اور دھوکہ دہی و جعل سازی کی ایک قسم ہے۔

اسلاف کا کہنا ہے: بات کی برکت اس میں ہے کہ اسے اس کے کہنے والے سے منسوب کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ اسلافِ متقدمین کی کتب اسانید سے بھری پڑی ہیں جن کے ذریعے مختلف علوم میں آراء واقوال ان تک پہنچے۔ اِسناد کا اہتمام محض حدیث اور علوم دین میں ہی نہیں کیا گیا بلکہ علومِ تاریخ ولغت اور ادب وغیرہ میں بھی یہ اہتمام موجود ہے۔

یہ بھی امانتِ علم میں سے ہے کہ انسان علم رکھنے کے باوجود کوئی بات کرتے وقت توقف سے کام لے اور نامعلوم کے بارے میں کہے کہ مجھے معلوم نہیں۔ کسی علمی معاملہ میں لاعلمی کا اظہار کرنے میں کوئی شرمندگی وندامت نہیں اور کسی معاملہ میں علم کی روشنی میں بات کرنا تکبر وغرور نہیں۔ اس بات میں بھی کوئی شرمندگی نہیں ہونی چاہیے اور نہ علم باعث تکبر بننا چاہیے کہ آدمی کسی حقیقت یا علمی فائدہ کو اپنے سے کم علم یا اپنے سے کم عمر یا اپنے سے کم مرتبہ شخص سے حاصل کر رہا ہے۔

اس بات کی وضاحت کے لیے مشہور حدیث جبریل علیہ السلام کافی ہے: رسول اللہ ﷺ سے لوگوں کی موجودگی میں جبریل نے قیامت سے متعلق سوال کیا تو آپؐ نے پوری وضاحت سے

۵- طبرانی نے اسے روایت کیا ہے اس کے سب راوی سوائے سعد البقال کے ثقات ہیں، صرف ایک راوی میں اختلاف ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد جلد۱/ ۱۴۱، الترغیب جلد۱ حدیث ۲۰۶

جواب میں فرمایا: مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ ”جواب دینے والا سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔“

حضرت جبیر بن مطعمؓ روایت کرتے ہیں کہ

اَنَّ رَجُلًا قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَیُّ الْبُلْدَانِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ؟ وَ اَیُّ الْبُلْدَانِ اَبْغَضُ اِلَی اللّٰهِ؟ قَالَ: لَا اَدْرِیْ حَتّٰی اَسْئَلَ جِبْرِیْلَ“ فَاَتَاهُ فَاَخْبَرَهٗ جِبْرِیْلُ: اِنَّ اَحَبَّ الْبِقَاعِ اِلَی اللّٰهِ الْمَسَاجِدُ وَ اَبْغَضَ الْبِقَاعِ اِلَی اللّٰهِ الْاَسْوَاقُ(۶)

”ایک آدمی نے سوال کیا: یارسول اللہؐ کون سی جگہیں (یعنی زمین کے ٹکڑے) اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں اور کون سے سب سے زیادہ مبغوض؟ آپؐ نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں جب تک جبریل سے نہ پوچھ لوں۔ پھر جبریلؑ آپؐ کے پاس آئے تو جبریلؑ نے آپؐ کو بتایا کہ اللہ کو سب سے محبوب قطعۂ زمین مساجد ہیں اور سب سے مبغوض قطعۂ زمین اللہ کے نزدیک بازار ہیں۔“

ایک امانتدار عالم کی شان یہ ہے کہ وہ سوال کرنے والے کو برا نہیں جانتا اور اگر کوئی فتویٰ پوچھے تو اسی بارے میں فتویٰ دیتا ہے جس پر اسے مکمل یقین ہو اور وہ اسے بادضاحت جانتا ہو۔ جس شخص نے بغیر علم کے فتویٰ دیا، یا اس سے کوئی مشورہ لیا گیا تو اس نے ایسا مشورہ دیا جس پر اس کا اپنا بھی یقین نہیں ہے تو اس نے امانت میں خیانت کی اور خود کو اللہ کی سزا کا مستحق ٹھہرا لیا۔ حدیث میں موجود ہے:

مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ کَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ، وَ مَنْ اَشَارَ عَلٰی اَخِیْهِ بِاَمْرٍ یَعْلَمُ اَنَّ الرُّشْدَ فِیْ غَیْرِهٖ فَقَدْ خَانَهٗ(۷)

۶۔ منذری نے ترغیب حدیث ۴۷۰ میں کہا ہے: اسے احمد و بزار نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ اس کے ہیں۔ اسے ابویعلیٰ اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے...... بازار کا مبغوض ہونا اس لیے ہے کہ وہاں حرص و ہوس، طمع و لالچ، دھوکہ دہی و فریب کاری اور غیر اللہ کی قسمیں کھانا اور اللہ کے ذکر سے غافل رہنے کی فضا عام ہوتی ہے، ان کے مبغوض ہونے کا مطلب تجارت اور بیع و شراء کی کراہیت نہیں ہے۔

۷۔ ابوداؤدؒ اور حاکمؒ نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

''جس شخص کو بغیر علم کوئی فتویٰ دیا گیا (اور اس نے اس پر عمل کیا) تو اس کا گناہ اسی پر ہوگا جس نے اس کو فتویٰ دیا۔ اور جس نے اپنے کسی بھائی کو ایسے کام کا مشورہ دیا کہ خیر اور بھلائی اس کام میں نہیں بلکہ کسی اور میں تھی تو اس نے اپنے بھائی سے خیانت کی۔''

صحابۂ عظامؓ اور تابعین کرامؒ نے علمائے امت سے یہی تعلیم حاصل کی تھی۔ جس معاملے کے بارے میں انھیں علم نہیں ہوتا تھا وہ اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرنے سے ڈرتے نہیں تھے اور وہ اس بات میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے کہ کوئی دوسرا حقیقت کی طرف ان کی رہنمائی کرے اور وہ تکبر و علمی برتری کو رکاوٹ بنائے بغیر اپنے موقف سے رجوع کر لیں یا ان کا اجتہاد بدل جائے تو وہ کسی شرمندگی اور حرج کو محسوس کیے بغیر اپنا فتویٰ تبدیل کر لیں۔

امام ابن سیرینؒ کہتے ہیں:

نبی ﷺ کے بعد ابوبکرؓ سے زیادہ لاعلمی سے ڈرنے والا کوئی نہ تھا اور ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ سے زیادہ لاعلمی سے ڈرنے والا کوئی نہ تھا۔ ابوبکرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا اور وہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ میں اس کی اصل نہ پاتے تو فرماتے أَجْتَهِدُ رَأْيِي، فَإِنْ يَكُنْ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ وَ إِنْ يَكُن خَطَأً فَمِنِّي وَ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ''میں اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہوں اگر یہ درست ہو تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اگر غلط ہو تو اس میں میرا قصور ہوگا اور میں اس غلطی پر اللہ سے معافی مانگتا ہوں۔''[۸]

یہ امیر المومنین حضرت عمرؓ ہیں، عورتوں کے مہر سے متعلق منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں تو ایک عورت انھیں ٹوک دیتی ہے اور وہ جو کچھ سنتے اور دیکھتے ہیں کوئی عار محسوس کیے بغیر اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: كُلُّ النَّاسِ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ[۹] ''سب لوگ عمر سے زیادہ فقیہ ہیں۔''

امیر المومنین حضرت علیؓ کا حال سنیے جو امت کے عظیم ترین جج ہیں، الجھے مسائل و معاملات

۸۔ ابن سعد وابن عبدالبر فی العلم، کنز العمال جلد ۱ حدیث ۱۴۱۹

۹۔ ابن کثیرؒ نے اسے اپنی تفسیر جلد ۱ صفحہ ۴۶۷ مطبوعہ الحلبی میں ذکر کیا ہے۔ اور ابویعلیٰ کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے اس کی سند جید وقوی ہے۔

کی گتھیاں سلجھا دیتے ہیں، علم کا ایسا سمندر ہیں کہ اس میں کوئی تکدر واقع نہیں ہوتا، اس کے باوجود فرماتے ہیں:

''تم میں سے کسی شخص کو شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے پاس علم نہ ہو اور وہ علم حاصل کرے۔ اور اس سے ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے جس کے متعلق وہ نہیں جانتا اور کہہ دے مجھے اس بارے میں علم نہیں۔''(۱۰)

ایک شخص حضرت علیؓ سے سوال کرتا ہے اور آپؓ جواب دیتے ہیں تو ایک آدمی کہتا ہے امیر المومنین! مسئلہ ایسے نہیں ہے جیسے آپ نے بتایا ہے بلکہ ایسے ایسے ہے، حضرت علیؓ کہتے ہیں: تو نے درست کہا ہے میں نے غلط کہا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ: وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ(۱۱)

۳۔ عجز وانکسار کا اظہار

عاجزی و انکساری بھی علماء کے اخلاق میں سے ہے۔ عالمِ حق غرور و خودرائی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ پختہ ادراک رکھتا ہے کہ علم بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اس کی تہہ تک کوئی پہنچ نہیں سکتا۔ اور اللہ عزوجل نے سچ ہی فرمایا ہے:

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا. [بنی اسرائیل:۸۵]

''اور تمھیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔''

حق شناس عالم یہ جانتا ہے کہ علم وعلماء کا قافلہ بڑا طویل ہے۔ یہ ماضی کے دھندلکوں میں چلتا ہوا حال میں پہنچا ہے اور مستقبل کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ اس قافلہ کے کسی فرد اور شریکِ سفر کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ سابقین کے علم وفضل کو حقیر جانے یا اس سے وابستہ رہنے والوں کی جہد وسعی کا انکار کرے۔

ہر چیز کا علم تو سوائے اللہ کے کس کے پاس ہو سکتا ہے۔ انسان ایک چیز کے بارے میں جانتا ہے تو بیسیوں سیکڑوں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں لاعلم ہوتا ہے۔ وہ آج اگر کسی چیز کا

۱۰۔ کنز العمال جلد ۱ حدیث ۱۴۳۷

۱۱۔ کنز العمال جلد ۱ حدیث ۱۴۳۶، صاحب کنز العمال کہتے ہیں، اسے ابن جریر اور ابن عبدالبر نے العلم میں بیان کیا ہے۔

علم حاصل کرتا ہے تو کل وہ اس سے ناواقف تھا اور آج اگر کسی چیز کو جان لیتا ہے تو کل اسے بھول جائے گا۔ یہ تو اشیاء کے ظاہر کا علم رکھتا ہے اور باطن سے لاتعلق ہوتا ہے، حاضر کو جانتا ہے اور مستقبل اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔

علم و معرفت کا دعویٰ کرنے والے اکثر ایسے ہیں جو طلبائے علم سے بھی آدھا علم رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت ان لوگوں جیسی ہے جو کسی چیز کے چھلکے کا علم رکھتے ہیں اور اس کے مغز سے واقف نہیں ہوتے، اشیاء کا ظاہری علم رکھتے ہیں اور ان کی گہرائی سے واقف نہیں ہوتے۔

جو شخص اپنے افقِ علم کو وسعت دے گا اور اپنے ادراک کو تعمق سے بہرہ یاب کرے گا وہ اپنے اوپر ہر نئی حقیقت کے منکشف ہونے پر کہے گا کہ اسے جو کچھ معلوم ہوا ہے اس سے زیادہ تو ابھی اس کے ادراک سے باہر ہے۔ اور علم تو اس قدر بڑا ہے کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور علم کے لیے یہی اعتراف کافی ہے۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں:

كُلَّمَا أَدَّبَنِي الدَّهْـرُ أَرَانِي نَقْصَ عَقْلِي
أَوْ أَرَانِي اِزْدَدْتُ عِلْمًازَادَنِي عِلْمِي بِجَهْلِيْ

”جب بھی زمانے نے مجھے کوئی تادیب سکھلائی ہے اس نے مجھے میری کم عقلی دکھائی ہے۔ یا میں نے دیکھا ہے کہ میرے علم میں اضافہ ہوا ہے تو میرے علم نے میری کوتاہ علمی کا احساس شدید کر دیا۔“

حافظ منذری نے اپنی کتاب الترغیب و الترہیب میں الترھیب مِنَ الدّعوٰی فی العلم والقرآن کے عنوان کے تحت ایک حدیث ذکر کی ہے جسے بخاری و مسلم نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے:

عَنِ النَّبِيِّ قَالَ: قَامَ مُوسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةِ وَالسَّلَامِ خَطِيبًا فِي بَنِيْ إِسْرَائِيلَ فَسُئِلَ: أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ فَقَالَ: أَنَا أَعْلَمُ فَعَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، إِذْ لَمْ يَرُدَّ الْعِلْمَ إِلَيْهِ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ: أَنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِيْ بِمَجْمَعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ. قَالَ: يَا رَبِّ: كَيْفَ بِهِ، فَقِيلَ

لَهُ: اِحْمَلْ حُوْتًا فِيْ مِكْتَلٍ فَإِذَا فَقَدْتَّهُ فَهُوَ ثَمَّ...... فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ فِيْ اِجْتِمَاعِهِ بِالْخِضْرِ...... اِلٰى اَنْ قَالَ: فَانْطَلَقَا يَمْشِيَانِ عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ لَيْسَ لَهُمَا سَفِيْنَةٌ، فَمَرَّتْ بِهِمَا سَفِيْنَةٌ فَكَلَّمُوْهُمْ أَنْ يَحْمِلُوْهُمَا فَعَرَفَ الْخِضْرَ فَحَمَلُوْهُمَا بِغَيْرِ نَوْلٍ...... فَجَاءَ عُصْفُوْرٌ فَوَقَعَ عَلٰى حَرْفِ السَّفِيْنَةِ، فَنَقَرَ نَقْرَةً أَوْ نَقْرَتَيْنِ فِي الْبَحْرِ، فَقَالَ الْخِضْرُ: يَا مُوْسٰى، مَا نَقَصَ عِلْمِيْ وَ عِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ اِلَّا كَنَقْرَةِ هٰذَا الْعُصْفُوْرِ فِيْ هٰذَا الْبَحْرِ.

''نبی ﷺ نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں کھڑے وعظ کر رہے تھے تو ان سے کسی نے سوال کیا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ علم کس کے پاس ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ اللہ نے اس پر ان کی گرفت فرمائی کہ انھوں نے علم کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا ہے۔ اور ان کی طرف وحی کر دی کہ: ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ دو دریاؤں کے سنگم (مجمع البحرین) پر ہے جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب اس تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا: ایک مچھلی کو برتن میں رکھ لو جہاں یہ مچھلی گم ہو جائے وہ آدمی وہیں ہوگا......

پھر آپ نے موسیٰ علیہ السلام کی خضر سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''موسیٰ و خضر دونوں ساحل سمندر پر جا رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی کشتی نہیں تھی، ایک کشتی ان کے پاس سے گزری تو اس سے انھوں نے بات کی کہ وہ انھیں سوار کر لیں، کشتی والوں نے خضر کو پہچان لیا اور ان دونوں کو بغیر کرائے کے سوار کر لیا...... دوران سفر ایک چڑیا آ کر کشتی کے کنارے پر بیٹھ گئی اور اس نے سمندر میں ایک یا دو چونچ ڈبو کر پانی پیا، خضر علیہ السلام نے کہا اے موسیٰ! میرے اور آپ کے علم نے اللہ کے علم سے اسی قدر حاصل کیا ہے جس قدر اس چڑیا نے سمندر سے پانی پیا ہے۔''

عبارت کے آخر میں علم سے مراد معلومات ہے۔

اللہ کے بندے خضر علیہ السلام نے یہ چاہا تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اس بات کو مؤکد کر دیں کہ انسان کا علم تو ایسی شے ہی نہیں کہ اللہ کے علم کے مقابلے میں اس کا ذکر کیا جائے یا اسے اللہ کے علم سے کوئی قابل ذکر نسبت ہو۔

یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے علماء اور علم کلام کے شہسوار جنھوں نے متقدمین و متاخرین کے افکار سے استفادہ کیا، پورا پورا دن حقائق کبریٰ کی حقیقت و کنہہ پر غور و خوض کرتے رہے لیکن آخر کار کسی کنارے نہ پہنچ سکے، ان علماء میں سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے علم کی خاطر سواریوں کو چلا چلا کر ہلاک کر ڈالا، اور بڑے بڑے لمبے سفر کیے، انھی لوگوں میں سے علم کلام و علم اُصول کی مشہور کتب کے مصنف، صاحب تفسیرِ کبیر اور امام المتکلمین فخر الدین رازیؒ کا کہنا ہے:

اَلعِلْمُ لِلرَّحْمٰنِ جَلَّ جَلَالُهٗ وَسِوَاهُ فِي جَهْلَاتِهٖ يَتَغَمْغَمُ
مَا لِلتُّرَابِ وَ لِلْعُلُوْمِ وَ اِنَّمَا يَسْعٰی لِيَعْلَمَ اَنَّهٗ لَا يَعْلَمُ!

''علم تو رحمٰن جل جلالہ کے پاس ہے۔ اس کے سوا تو سب اپنی جہالتوں میں غوطہ زنی کرتے رہتے ہیں۔ اس خاک (انسان) اور علوم کی نسبت ہی کیا ہے، انسان تو اس لیے سیکھنے اور علم حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے کہ اس کے پاس علم نہیں۔''

اسی مفہوم کے اقوال متعدد علماء مثلاً باقلانی، امام الحرمین اور شہرستانی وغیرہ سے منقول ہیں۔

حدیث رسولؐ میں ایسے لوگوں کی مذمت آئی ہے جو اپنے پڑھے اور سیکھے ہوئے پر بڑے دعوے کرتے ہیں، تکبر سے کام لیتے ہیں اور پھول جاتے ہیں۔ اگر وہ علمائے حق ہوتے تو اپنی حیثیت سے آگاہ ہوتے، اور انھیں تو علم ہی تھوڑا سا دیا گیا ہے بلکہ تھوڑے میں سے بھی بہت تھوڑا علم انھیں ملا ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

يَظْهَرُ الْاِسْلَامُ حَتّٰى تَخْتَلِفَ التُّجَّارُ فِي الْبَحْرِ، وَ حَتّٰى تَخُوضَ الْخَيْلُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ يَظْهَرُ قَوْمٌ يَقْرَؤُوْنَ الْقُرْآنَ يَقُوْلُوْنَ: مَنْ اَقْرَأُ مِنَّا؟ مَنْ اَعْلَمُ مِنَّا؟ مَنْ اَفْقَهُ مِنَّا؟ ثُمَّ قَالَ لِاَصْحَابِهٖ: هَلْ فِي

أُولٰئِکَ مِنْ خَیْرٍ؟ قَالُوا: اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. قَالَ أُولٰئِکَ مِنْکُمْ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، أُولٰئِکَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ[12]

''حقیقی اسلام اس وقت تک نظر آتا رہے گا جب تک سمندر میں تاجروں کی آمدورفت جاری رہے گی اور جب تک گھوڑے اللہ کی راہ میں خطرات سے نبرد آزما رہیں گے۔ پھر ایسے لوگ آ جائیں گے جو یہ کہتے ہوئے قرآن پڑھیں گے کہ: ہم سے زیادہ پڑھا ہوا کون ہے؟ ہم سے زیادہ علم والا کون ہے؟ ہم سے زیادہ فقیہ کون ہے؟ پھر آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: کیا ایسے لوگوں میں کوئی خیر ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسولؐ زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ لوگ تم میں سے، اس امت میں سے ہوں گے۔ یہی لوگ آگ کا ایندھن بنیں گے۔''

عالم کو جب تواضع کی نعمت عطا ہوتی ہے تو وہ اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ اپنے ساتھ دوسرے کو بھی حصہ دار بناتا ہے اور اس کا حق اسے دیتا ہے، وہ باطل دعوؤں کے ساتھ لوگوں سے مقابلہ بازی نہیں کرتا۔

ابن عبدالبر نے امامِ دارالہجرت حضرت مالک بن انس سے روایت کیا ہے کہ ابن انس فرماتے ہیں:

ابوجعفر منصور (اموی خلیفہ) حج پر آیا تو اس نے مجھے بلایا۔ میں اس کے پاس گیا اور حدیث سنائی۔ اس نے سوالات کیے میں نے جواب دیے۔ منصور کہنے لگا میرا ارادہ ہے کہ آپ کی مرتب کردہ کتاب مؤطا کے نسخے لکھوائے جائیں اور انھیں سب شہروں میں بھیج دوں اور یہ حکم دے دوں کہ لوگ اسی کے مطابق عمل کریں۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف نہ بڑھیں

12- منذری نے الترغیب حدیث 229 میں کہا ہے: اس کو طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور بزار نے سند میں کسی کمزوری کے بغیر روایت کیا ہے اور ابویعلی، بزار اور طبرانی نے اسے حدیث عباس بن عبدالمطلب سے بھی روایت کیا ہے۔ منذری نے ابن عباس سے ایک اور موضوع حدیث بھی ذکر کی ہے جو اس کا شاہد قرار دی جا سکتی ہے۔ اس حدیث کے بارے میں کہا ہے: اس کو طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے اور ان شاء اللہ اس کی سند حسن ہے۔

اور اس نئے پیدا ہونے والے علم کو چھوڑ دیں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس علم کی اصل تو اہل مدینہ کی روایت اور ان کا علم ہی ہے۔

امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے کہا: امیر المومنین ایسا نہ کیجیے! لوگوں کے پاس بہت سے اقوال پہنچ چکے ہیں۔ انھوں نے بہت سی احادیث سن لی ہیں اور بے شمار روایات بیان کر چکے ہیں۔ ہر قوم نے پہلے ملنے والی بات کو اپنا لیا ہے۔ اسی پر عمل کر رہے ہیں اور اسی کے زیادہ قریب ہیں۔ ایسا کرنے والے مختلف لوگ ہیں جن میں اصحابِ رسولؐ بھی شامل ہیں۔ انھیں ان کے اعتقاد سے ہٹانا بڑا سخت اور نازک معاملہ ہے۔ لوگ جس موقف و طریقہ پر ہیں، اور جو راستہ انھوں نے اختیار کر رکھا ہے ان کو اسی پر رہنے اور چلنے دیں۔

ابو جعفر نے کہا: اگر مالکؒ مجھے اس بات کا اختیار دے دیتے تو میں اس کا حکم دے ڈالتا۔

امام ابن عبدالبر نے یہ قصہ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: اہل فہم و بصیرت کے انصاف کی انتہا یہی ہوتی ہے۔(۱۳)

ابن عبدالبر نے ہی عبدالرحمٰن بن القاسم کی طرف منسوب کر کے یہ بیان کیا ہے کہ عبدالرحمٰن نے کہا: میرے نزدیک اہل مصر سے زیادہ تجارت کے مسائل کوئی نہیں جانتا۔ مالک نے فرمایا: کس وجہ سے؟ اس نے کہا: آپ کی وجہ سے! امام مالکؒ فرماتے ہیں: میں تجارت کے مسائل جانتا ہی نہیں ہوں، اہل مصر نے مجھ سے کیسے سیکھ لیے؟(۱۴)

علمائے حق کا مقام و مرتبہ یہی ہے کہ وہ اللہ کے لیے عجز و انکساری اختیار کریں، اپنے ساتھ انصاف کریں، دوسروں کے موقف کا بھی خیال رکھیں اور اس کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

إِذَا سَمِعْتَ الرَّجُلَ يَقُولُ هَلَكَ النَّاسُ. فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ(۱۵)

۱۳- جامع بیان العلم جلد ا صفحہ ۱۵۹

۱۴- حوالہ مذکور

۱۵- مسلم، مالک، احمد اور ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ بخاری نے الادب المفرد میں بیان کیا ہے۔

''جب تو کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنے کہ لوگ ہلاک ہو گئے تو وہ شخص لوگوں سے زیادہ ہلاک ہونے والا ہے۔''

ایسا اس وقت ہوگا جب کہنے والے کی حالت بتا رہی ہو کہ وہ اپنی خودسری وخودرائی، اپنے علم وعبادت پر اتراتے ہوئے، دوسروں کو حقیر جانتے ہوئے اور ان کے احسانات وخدمات کو جھٹکتے ہوئے یہ بات کر رہا ہے۔

اَھلکھم کاف پر پیش اور زبر دونوں طرح روایت ہوا ہے۔ پیش آنے کی صورت میں اس کا مطلب ہوگا: وہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ ہلاک ہونے والا ہے۔ اور ہلاکت وتباہی کا زیادہ حقدار ہے، اس لیے کہ وہ لوگوں کو حقیر جانتا اور ان کے عیوب ومعائب کا ذکر کرتا ہے اور خود کو بڑا متقی وپرہیزگار سمجھتے ہوئے تکبر کرتا ہے۔

زبر کے ساتھ اس کا مفہوم ہوگا کہ: اس نے لوگوں کو ہلاک ہونے والا کہا ہے۔ درحقیقت لوگ ہلاک ہونے والے نہیں ہیں۔ یا اس کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ اس نے لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس اور اس کی بخشش ومغفرت سے ناامید کر کے ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

امام غزالیؒ کہتے ہیں:

''آپ ﷺ نے اس شخص کو ہلاک ہونے والا اس لیے فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کو حقیر جان رہا ہے، اللہ کے بارے میں دھوکہ کھا گیا ہے، اللہ کے مکر سے بے خوف ہو گیا ہے، اور اس کی سطوت وہیبت سے بے پروا ہو گیا ہے۔ اسی لیے تو اس کو لوگ ہلاک ہوتے نظر آ رہے ہیں اور خود کو محفوظ سمجھ رہا ہے، حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے ایسا سمجھنے کے باوجود وہ ہلاکت میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے بُرا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ دوسروں کو حقیر سمجھ رہا ہے۔ لوگ تو اللہ کے ہاں اس کی تعظیم وتکریم کا اعتقاد رکھنے کی وجہ سے نجات پا جائیں گے۔ اور اس سے قریب ہونے کے باعث وہ اللہ کے قریب ہو جائیں گے جب کہ وہ اپنے آپ کو ان کی صحبت ومجالست سے بلند خیال کرتے ہوئے ان سے دور ہٹنے اور ان سے کنارہ کشی کرنے کے باعث اللہ کے عذاب کا مستحق ٹھہر جائے گا۔ ہلاکت تک پہنچانے والی اس سے زیادہ اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔''[16]

16- فیض القدیر جلد ۱ صفحہ ۳۷۸

۴- عزت وخودداری

وہ عزت جو مؤمنین کے فضائل خصوصی میں شمار ہوتی ہے، علماء کے اخلاق میں شامل ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ [المنافقون:۸]

''عزت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مؤمنین کے لیے ہے۔''

اور علماء تو مؤمنین کا منتخب گروہ ہوتے ہیں۔

عزت غرور وتکبر اور خود رائی سے الگ شے ہے۔اس لیے یہ اس عجز وانکساری کے منافی نہیں ہے جس کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں۔

یہ عزت وخودداری حکومت وسلطنت پر ناز کرنے والوں، دولت وثروت پر فخر کرنے والوں،قوت وسطوت کے زعم میں گمراہ ہونے والوں،حسب ونسب پر اترانے والوں اور تعداد میں زیادہ ہونے کے دعویداروں کے مقابلہ میں ایک اعزاز وسربلندی اور شانِ بے نیازی ہے۔

یہ عزت علم وایمان سے میسر آتی ہے، یہ اثم وعدوان کی بنا پر حاصل کیا ہوا رعب ودبدبہ نہیں ہے، یہ وہ عزت ہے جو اللہ سے مانگی جاتی ہے لوگوں کے پاس تلاش نہیں کی جاتی نہ بادشاہوں کے دروازوں پر سجدہ ریز ہونے سے میسر آتی ہے،قرآن کا کہنا ہے کہ:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا[فاطر:۱۰]

''جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔''

حجاج نے خالد بن صفوان سے پوچھا: بصرہ کا سردار کون ہے؟ اس نے کہا: حسن بصری! حجاج بولا: وہ کیسے؟ وہ تو غلام ہے؟ یعنی عرب کے کسی بڑے خاندان کے قبیلہ سے نہیں ہے۔ خالد نے کہا: لوگ اپنے دین کے معاملے میں ان کے محتاج ہیں لیکن وہ لوگوں کے ہاں موجود سامانِ دنیا سے بے نیاز ہے۔ میں نے بصرہ کے کسی ایسے معزز کو نہیں دیکھا جو اس کے حلقۂ علم میں پہنچنے کا متمنی نہ ہو، ان میں سے ہر کوئی اس کے اقوالِ زریں کو سنتا اور نوادراتِ علمی کو لکھتا

ہے۔ حجاج نے کہا: اللہ کی قسم یہی اصل سرداری ہے[۱۷]

استغناء اس دولتِ احساس وشعور کا نام ہے جو آدمی کو اشیاء کا مالک بننے سے پہلے نصیب ہوتی ہے اور وہ دنیا کی ان حقیر اشیاء کی خواہش وطلب نہیں کرتا۔ لوگوں میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو خزانوں کے مالک ہوتے ہیں لیکن دل کے فقیر ہی رہتے ہیں اور ہاتھ دوسروں کی طرف پھیلائے رکھتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو خالی ہاتھ ہوتے ہیں لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قارون سے بڑے مالدار ہیں۔ حدیث میں یہی بات بیان کی گئی ہے:

لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرْضِ، اِنَّمَا الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ[۱۸]

"تونگری کثرتِ متاع کا نام نہیں، یہ تو دل کے غنیٰ کا نام ہے۔"

یہی وہ قلبی تونگری وامیری ہے جس کی تصویر امام شافعی نے ان قوی وعمیق اشعار میں کھینچی ہے جو ان سے منسوب ہیں:

أَمْطِرِىْ لُؤْلُؤًا جِبَالَ سَرَنْدِيبَ ... وَ فِيْضِى آبَارَ تَبْرِيزِ تِبْرَا!!
أَنَا اِنْ عِشْتُ لَسْتُ أَعْدَمُ قُوتًا ... وَ اِذَا مِتُّ لَسْتُ أَعْدَمُ قَبْرًا!!
هِمَّتِىْ هِمَّةُ الْمُلُوْكِ وَ نَفْسِى ... نَفْسُ حُرٍّ تَرَى الْمَذَلَّةَ كُفْرًا!
وَ اِذَا مَا قَنِعْتُ بِالْقُوْتِ عُمْرِى ... فَلِمَاذَا أَهَابُ زَيْدًا و عُمَرًا؟!

"سری لنکا کے پہاڑو چاہے لعل و جواہر کی بارش کرو! تبریز کے کنوؤ چاہے سونا و چاندی اُگلو! میں اگر زندہ رہا تو نانِ جویں سے محروم نہیں رہ سکتا اور مر گیا تو قبر سے باہر نہیں رہ سکتا۔ میری ہمت بادشاہوں جیسی اور میرا دل آزاد منش آدمی جیسا ہے جو خواری وذلت کو کفر سمجھتا ہے، جب میں نے عمر بھر نانِ جویں پر ہی قناعت کی ہے تو مجھے زید وعمر سے ڈر کیسا؟"

اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے طلب کرنے پر مشہور عالم دین ابو حازم اس کے پاس گئے تو سلیمان نے ان سے کچھ سوال پوچھے۔ انھوں نے دین میں مداہنت کو روا رکھے بغیر

۱۷- جامع بیان العلم جلد ا صفحہ ۷، ۵۰۷

۱۸- عن ابی ہریرہؓ، متفق علیہ

اور حق میں نرمی اختیار کیے بغیر عالمانہ عزت اور مؤمنانہ قوت سے جواب دیے جس سے سلیمان دہل گیا، اور کہا:

اے ابو حازم! آپ ہمارے ہاں کیوں نہیں آ جاتے؟ آپ ہمیں فیض پہنچائیں ہم آپ کو نوازیں گے!

ابو حازم نے کہا: مجھے خطرہ ہے کہ میں ذرا سا بھی حق سے سرک گیا تو اللہ مجھے دنیا و آخرت میں دگنا عذاب دے گا......!

سلیمان نے کہا: اپنی کوئی ضروریات بتائیں؟

ابو حازم نے کہا: مجھے آگ سے نجات دلا کر جنت میں داخل کرا دو!

سلیمان نے کہا: یہ تو میرے بس میں نہیں۔

ابو حازم نے کہا: تو پھر مجھے اس کے سوا کوئی اور ضرورت درپیش نہیں جو تمھارے سامنے پیش کروں۔ (۱۹)

یہ ہے علماء کی شانِ عزت و خودداری! ان کی یہ عزت و شان اس لیے ہے کہ وہ اپنے سینوں میں کلماتِ الٰہی محفوظ کیے ہوئے ہیں، ہاتھوں میں ہدایت و رہنمائی کے چراغ پکڑے ہوئے ہیں اور سونے چاندی اور دولت و ثروت سے قیمتی خزانے اپنے دلوں میں لیے بیٹھے ہیں، وہ بہترین وراثت کے بھی مالک ہیں، یہ وراثت انھیں نبوت سے ملی ہے۔ اگر یہ ورثۂ نبوت نہ ہوتا تو مخلوق مادیت کی گمراہیوں، جاہلیت کے اندھیروں اور اوہام و اہواء کی ضلالتوں میں زندگی گزارتی۔ تو پھر ان علمائے حق سے زیادہ درست بات کہنے والا راہِ راست پر چلنے والا کون ہو سکتا ہے؟

اسی لیے حدیث میں بیان کیا گیا ہے:

مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ ثُمَّ رَاى أَنَّ أَحَدًا أُوتِيَ أَفْضَلَ مِمَّا أُوتِيَ فَقَدِ اسْتَصْغَرَ مَا عَظَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى (۲۰)

"جس نے قرآنِ حکیم پڑھا پھر اس کے ذہن میں یہ خیال در آیا کہ اسے جو

۱۹۔ سنن دارمی جلد ا صفحہ ۱۲۵

۲۰۔ عراقی نے الاحیاء کی احادیث کی تخریج میں کہا ہے: اسے طبرانی نے حدیث عبداللہ بن عمر سے ضعیف سند کے ساتھ یہاں بیان کیا ہے۔

کچھ نصیب ہوا کسی اور کو اس سے افضل ملا ہے تو اس نے اس چیز کو چھوٹا بنا کر پیش کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے عظیم قرار دیا ہے۔"

نبوت...... جس سے آگے مخلوق کی کوئی خواہش نہیں ہو سکتی، جب اس کا ورثہ بہترین ورثہ ہے تو شرف وفضل میں اس سے تعلق رکھنے والا رتبہ اس کے وارثین کا ہی ہے اور وارثین علمائے کرام ہیں۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں: جس نے قرآن پڑھ لیا اس نے نبوت کو اپنے پہلوؤں میں لے لیا سوائے اس کے کہ اس پر وحی نہیں آتی!

"قرآن پڑھنے" کا مفہوم حدیث اور صحابہ وقرونِ اولیٰ میں مجرد پڑھ لینا یا معانی واسرار کے فہم وتدبر کے بغیر اس کے کلمات کو حفظ کر لینا نہیں تھا بلکہ قرأت سے مراد علم وفقہ تھے۔ اسی لیے علماء ان لوگوں کو "قراء" کہتے ہیں۔

ابوالاسود کہتے ہیں: علم سے زیادہ باعزت کوئی شے نہیں، بادشاہ لوگوں پر حکومت کرتے ہیں جب کہ علماء بادشاہوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

ایک شاعر نے یہی معنی اپنے اس شعر میں مراد لیے ہیں:

إِنَّ الْأَكَابِرَ يَحْكُمُوْنَ عَلَى الْوَرٰى   وَ عَلَى الْأَكَابِرِ يَحْكُمُ الْعُلَمَاءُ!

"بڑے لوگ رعایا پر حکمرانی کرتے ہیں اور ان بڑوں پر علماء حکمران ہوتے ہیں۔"

دراصل علماء کا صحیح مقام ہی یہ ہے، ان کا کلمہ ہی بلند وبرتر ہے۔ کیوں کہ وہ کلمہ الٰہی سے ماخوذ ہے۔ زندگی اور انسان کی سمت متعین کرنے والے یہی ہیں، اِلَّا یہ کہ وہ اپنے مقام ومرتبہ سے گر جائیں اور امراء کے ہمرکاب چلنا شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ قاضی الجرجانی پر رحم فرمائے وہ کہتے ہیں:

وَ لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْعِلْمِ صَانُوْهُ صَانَهُمْ   وَلَوْ عَظَّمُوْهُ فِي النُّفُوْسِ لَعَظُمَا
وَلٰكِنْ أَهَانُوْهُ فَهَانَ، وَ دَنَّسُوْا   مُحَيَّاهُ بِالْأَطْمَاعِ حَتّٰى تَجَهَّمَا

"اگر اہل علم، علم کی حفاظت کرتے تو وہ بھی ان کی حفاظت کرتا، اگر وہ اسے اپنے دلوں میں عظمت دیتے تو وہ عظیم بنتا، مگر اہل علم نے اس کی توہین کی تو اسے رسوا ہونا پڑا اور انھوں نے حرص وطمع کے ساتھ اس کے چہرہ کو داغ دار کیا تو اس نے بھی ان سے منہ موڑ لیا۔"

۵- علم کے تقاضوں پر عمل کرنا

اسلام میں علم کی اصل اخلاقیات، علم کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم اور نیت وارادہ میں ایک تعلق ہے، جو عمل کی صورت میں سامنے آتا ہے، اکثر لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ علم تو حاصل کر لیتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے، یا حاصل کیے ہوئے علم کے خلاف عمل کرتے ہیں، اس کی مثال اس ڈاکٹر جیسی ہے جو یہ جانتا ہو کہ فلاں چیز کھانے یا پینے سے میری صحت پر بُرا اثر پڑے گا لیکن وہ عادات اور خواہش نفس کی بات مانتے ہوئے ان چیزوں کو کھانے سے نہیں رُکتا۔

اسی طرح اخلاقیات کا وہ عالم ہے جو کسی روش وراستے کو واضح طور پر رذیل دیکھتے ہوئے بھی اس پر قائم رہتا ہے، اسی میں آگے بڑھتا رہتا ہے اسی طرح دین کا وہ عالم ہے جو ایک کام کو ناپسندیدہ وغلط سمجھتا ہے اور لوگوں کو تو اس سے منع کرتا ہے لیکن خود اس کا مرتکب ہوتا ہے...... علم کی یہ خالص نظری قسم ہے اس کو اسلام پسند کرتا ہے نہ قبول کرتا ہے۔ اس طرح کی کیفیت میں تو بعض اوقات جہالت ولاعلمی علم سے بہتر ہوتی ہے۔

حقیقی علم وہ ہے جو اپنے جاننے والے کی بصیرت کو منور کر دے اور جزاء وسزا کو مجسم کر کے اس کی نظروں کے سامنے رکھ دے۔ اس طرح بعید اسے قریب محسوس ہو، غائب سامنے دکھائی دیتا ہو اور فاصلے سمٹ جاتے ہوں، اس تقویٰ اور نیکی پر اس کی عزیمت مضبوط ہو جاتی ہے اور فسق وفجور کی طرف اس کا میلان کم ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو کبشہ انماری کی روایت کردہ حدیث میں آیا ہے:

عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِنَّمَا الدُّنْيَا لِاَرْبَعَةِ نَفَرٍ: عَبْدٌ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَعِلْمًا فَهُوَ يَتَّقِيْ فِيْهِ رَبَّهُ، وَ يَصِلُ فِيْهِ رَحِمَهُ، وَ يَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيْهِ حَقًّا، فَهٰذَا بِأَفْضَلِ الْمَنَازِلِ. وَ عَبْدٌ رَزَقَهُ اللّٰهُ عِلْمًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا، فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ، يَقُوْلُ: لَوْ أَنَّ لِيْ مَالًا لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَ بِنِيَّتِهٖ فَاَجْرُهُمَا سَوَاءٌ. وَعَبْدٌ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ عِلْمًا، يَخْبِطُ فِيْ مَالِهٖ بِغَيْرِ عِلْمٍ، وَلَا يَتَّقِيْ فِيْهِ رَبَّهُ وَلَا يَصِلُ فِيْهِ رَحِمَهُ، وَلَا يَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيْهِ حَقًّا، فَهٰذَا بِأَخْبَثِ الْمَنَازِلِ. وَ عَبْدٌ لَمْ يَرْزُقْهُ اللّٰهُ مَالًا وَ عِلْمًا،

فَهُوَ يَقُولُ: لَوْ أَنَّ لِيْ مَالًا لَعَمِلْتُ فِيْهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَ بِنِيَّتِهِ، فَوِزْرُهُمَا سَوَاءٌ(۲۱)

''نبی ﷺ نے فرمایا: لوگوں کے چار گروہ ہیں:

۱- ایک آدمی وہ ہے جسے اللہ نے مال اور علم دیا، وہ ان دونوں نعمتوں کے مقابلے میں اللہ سے ڈرتا رہتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے اور اللہ کے حق کا بھی خیال رکھتا ہے، اس آدمی کا مقام و مرتبہ بہترین ہے۔

۲- ایک آدمی وہ ہے جسے اللہ نے علم دیا مگر مال نہیں دیا، وہ نیت کا سچا ہے، وہ کہتا ہے، کاش کہ مجھے اللہ نے مال دیا ہوتا اور میں فلاں آدمی کی طرح کام کرتا، اس کا یہ کہنا اس کی نیت کے مطابق ہے لہٰذا ان دونوں آدمیوں کو برابر کا اجر ملے گا۔

۳- ایک وہ آدمی ہے جسے اللہ نے مال دیا مگر علم نہیں، علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ مال میں غلط تصرف کرتا ہے، نہ اس میں اپنے رب سے ڈرتا ہے نہ صلہ رحمی سے کام لیتا ہے، اور نہ اس میں اللہ کے حق کا خیال رکھتا ہے، یہ آدمی بدترین درجے میں ہے۔

۴- ایک آدمی وہ ہے جس کو اللہ نے مال دیا نہ علم، وہ کہتا ہے: کاش! میرے پاس مال ہوتا اور میں فلاں کی طرح کام کرتا۔ اس کا یہ کہنا اس کی نیت پر منحصر ہے۔ ان دونوں آدمیوں کا بوجھ برابر ہے۔''

یہاں ہم نے دیکھا ہے کہ اہل علم کے مالی معاملات پر علم کے اثرات بڑے واضح ہیں، ''وہ اس میں اللہ سے ڈرتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے اور اللہ کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔'' دراصل یہی آدمی شکر گزار مالدار ہے جو بہترین مقام پر فائز ہے۔ جیسا کہ اوپر حدیث میں آیا ہے۔

آدمی جب مال سے محروم اور علم سے بہرہ یاب ہو تو زندگی میں بھلائی اس کا احاطہ کیے رکھتی ہے، وہ محض عمل کی مشق ہی نہیں کرتا بلکہ ارادہ و امید پر زندگی گزارتا ہے چونکہ اس کا ہر کام اس کی نیت کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا اس کا اور ایک شکر گزار مالدار کا اجر و ثواب برابر ہوتا ہے۔

۲۱- اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے، یہ لفظ ترمذی کے ہیں: امام ترمذی نے کہا ہے حدیث حسن صحیح ہے: الترغیب حدیث ۲۰

جب کہ وہ شخص جو علم سے محروم ہے اس کے پاس مال ہو یا نہ ہو، حدیث نے اس کا جو انجام بتایا ہے، وہ بدترین مقام ہے، خواہ وہ بری زندگی نیتاً گزارے یا لاعلمی کی بنیاد پر ایسا کرے۔

یہاں علم سے مراد اِدھر اُدھر کی سطحی قسم کی معلومات حاصل کر لینا نہیں ہے بلکہ یہ وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے اور اسے یقین و رسوخ کی دولت عطا کر دیتا ہے اور اس علم کے ذریعے اس سے قلق و اضطراب دور کرتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جسے علم نافع کہا گیا ہے۔

فائدہ مند اور نفع بخش علم دراصل وہ ہے جس کے اثرات اس کے جاننے والے پر دکھائی دیں، اس کے چہرے پر نور ہو، دل میں خشیت ہو، کردار و عمل میں استقامت ہو اور اللہ، مخلوق اور اپنے نفس سے وہ سچائی کا معاملہ کر رہا ہو۔ اس علم کی آڑ میں نہ اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہو نہ لوگوں اور نہ خود اپنے نفس کو کسی فریب میں مبتلا رکھتا ہو۔

رہی بات ملمع کی ہوئی گفتگو کو بڑے زور و شور سے بیان کرنے اور میٹھی میٹھی باتوں کو اطرافِ زبان سے ادا کرنے کی جب کہ یہ گفتگو عمل کی تصدیق نہ کرتی ہو، تو یہ ان منافقین کی صفت ہے جو ایسی باتیں کرتے ہیں جن پر عمل نہیں کرتے، لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور خود اس سے رُکے رہتے ہیں، حالانکہ وہ کتاب قرآن کی تلاوت اور حدیث کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

یہی وہ روش ہے جس پر قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کی مذمت کی ہے:

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. [البقرہ:۴۴]

”تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟۔“

گویا قرآنِ حکیم یہ اشارہ کر رہا ہے کہ علم کا عمل کے منافی ہونا اور قول کا فعل کے مخالف ہونا جنون کی ایک قسم ہے یا تضاد و تناقض کا وہ رنگ ہے جو اہل عقل کے شایانِ شان نہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ. كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ. [الصف:۲-۳]

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔''

اس موضوع کی احادیث جو شخص بھی پڑھے گا اس کا دل اس وعید کے خوف سے دہل جائے گا جو اِس قسم کے اہل علم کو سنائی گئی ہے۔ امام غزالیؒ نے ایسے علماء کو ''علمائے دنیا'' کہا ہے۔

حضرت اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:

يُجَاءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقَى فِي النَّارِ، فَتَنْدَلِقُ أَقْتَابُهُ، فَيَدُوْرُ بِهَا كَمَا يَدُوْرُ الْحِمَارُ بِرَحَاهُ. فَيَجْتَمِعُ أَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ. فَيَقُوْلُوْنَ: يَا فُلَانُ! مَا شَأْنُكَ؟ أَلَسْتَ كُنْتَ تَأْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ؟ فَيَقُوْلُ: كُنْتُ آمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا آتِيْهِ. وَ أَنْهَاكُمْ عَنِ الشَّرِّ وَ آتِيْهِ.

''قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا جس کی وجہ سے اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی۔ وہ اِن انتڑیوں کو لیے اس طرح گھوم رہا ہوگا جیسے گدھا چکی کے گرد گھومتا ہے۔ (اس کی یہ حالت دیکھ کر) اہل جہنم اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور اس سے کہیں گے: اے فلاں! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا تو بھلائی کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے منع نہیں کیا کرتا تھا؟ وہ کہے گا: میں تمھیں تو نیکی کا کہتا تھا مگر خود نہیں کرتا تھا۔ تمھیں تو برائی سے روکتا تھا مگر خود اس سے باز نہیں آتا تھا۔''

اسامہ بن زیدؓ ہی کہتے ہیں:

إِنِّي سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ: مَرَرْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِيْ بِأَقْوَامٍ تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِمَقَارِيْضَ مِنْ نَارٍ قُلْتُ: مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرِيْلُ؟ قَالَ: خُطَبَاءُ أُمَّتِكَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ.[۲۲]

''میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ: معراج کی رات کو میں ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔

۲۲- اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔

میں نے پوچھا: جبریل! یہ کون لوگ ہیں! اس نے کہا: یہ آپ کی امت کے وہ خطیب ہیں جو کہتے کچھ تھے اور کرتے کچھ تھے۔"

یہ وہ لوگ ہیں جو گفتگو بڑی حسین کرتے ہیں مگر عمل حسین نہیں کرتے۔ علم سے خود کو منسوب تو کرتے ہیں مگر اس کا حق ادا نہیں کرتے۔ اس طرح وہ امت کے فتنہ وفساد کا باعث بنتے ہیں کیوں کہ وہ قیادت وسیادت کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔

انسانوں کی دو ہی قسمیں ہیں جن پر انسانیت کے صلح وفساد کا دارومدار ہوتا ہے، یہ درست رہیں تو لوگ بھی ٹھیک رہتے ہیں اور یہ بگڑ جائیں تو لوگ بھی خراب ہو جاتے ہیں: یہ لوگ علماء اور امراء ہیں۔ (۲۳)

اللہ تعالیٰ اس شاعر پر رحم فرمائے جو یہ حقیقت بیان کر گیا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الْعُلَمَاءُ يَا مِلْحَ الْبَلَدْ مَا يُصْلِحُ الْمِلْحَ إِذَا الْمِلْحُ فَسَدْ؟

"اے گروہِ علماء! اے وہ لوگو! جو زمین کا نمک ہو، جب نمک ہی خراب ہو جائے تو نمک کو درست کرنے والی کون سی شے ہے؟۔"

یہی وہ چیز ہے جس سے نبی ﷺ نے امت کے بارے میں خطرہ محسوس کیا ہے۔ امیر المؤمنین عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں زبان کے عالم ہر منافق کے بارے میں متنبہ کیا۔ (۲۴)

حضرت عمران بن حصینؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ بَعْدِيْ كُلُّ مُنَافِقٍ عَلِيْمِ اللِّسَانِ (۲۵)

۲۳- ہیثمی نے المجمع جلد اصفحہ ۱۸۷ میں کہا ہے: اسے بزار، احمد اور ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ شیخ احمد شاکر نے کہا ہے: اس کی سند صحیح ہے۔ دیکھیے: مسند کی حدیث ۱۴۳، ۳۱۰

۲۴- یہ حدیث ابن عباس سے ضعیف سند کے ساتھ مرفوعاً مروی ہے۔ ابن عبد البر نے بھی روایت کیا ہے۔ اور ابو نعیم نے الحلیہ میں روایت کیا ہے۔ جیسا کہ الاحیاء کی تخریج میں ہے۔

۲۵- طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے۔ بزار نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے رواۃ کو صحیح کے رواۃ شمار کیا ہے جیسا کہ ترغیب حدیث ۲۲۴ میں ہے۔

''مجھے اپنے بعد تمھارے بارے میں سب سے زیادہ ڈر ایسے منافق سے ہے جو زبان کا عالم ہوگا۔'' (یعنی عمل سے دور اور گفتگو کا ماہر ہوگا)

حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے مرفوعاً مروی ہے:

اِنِّیْ لَا اَتَخَوَّفُ عَلٰی اُمَّتِیْ مُؤْمِنًا وَّلَا مُشْرِکًا. فَاَمَّا الْمُؤْمِنُ فَیَحْجُزُهُ اِیْمَانُهُ، وَاَمَّا الْمُشْرِکُ فَیَقْمَعُهُ کُفْرُهُ، وَلٰکِنْ اَتَخَوَّفُ عَلَیْکُمْ مُنَافِقًا عَالِمَ اللِّسَانِ: یَقُوْلُ مَا تَعْرِفُوْنَ وَ یَعْمَلُ مَا تُنْکِرُوْنَ.(۲۶)

''(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) مجھے اپنی امت کے بارے میں کسی مؤمن سے کوئی خطرہ ہے نہ کسی مشرک سے! مؤمن کو اس کا ایمان (غلط کام کرنے سے) روکے رکھے گا اور مشرک کو اس کا کفر خوار کر دے گا، مگر مجھے تمھارے بارے میں زبان کے عالم، منافق سے خطرہ ہے، یہ شخص ایسی بات کہے گا جسے تم اچھا سمجھتے ہو لیکن کرے گا وہ جسے تم برا سمجھتے ہو۔''

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمٌ فِی الْقَلْبِ فَذَاکَ الْعِلْمُ النَّافِعُ، وَ عِلْمٌ عَلَی اللِّسَانِ، فَذَاکَ حُجَّةُ اللّٰهِ عَلَی ابْنِ آدَمَ(۲۷)

''علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ علم جو دل کی گہرائیوں تک اترا ہوتا ہے اور یہی علم، علم نافع ہوتا ہے۔ دوسرا وہ علم جو زبان تک محدود ہوتا ہے یہ علم انسان کے خلاف اللہ کے پاس ایک حجت ہوگی۔''

علم آدمی کے حق میں حجت ہوسکتا ہے لیکن اس وقت جب اس پر عمل کیا ہو، ورنہ اس کے خلاف

۲۶- الترغیب حدیث ۲۲۳ میں ہے: اسے طبرانی نے الصغیر اور الاوسط میں حارث سے روایت کیا ہے جو اعور ہیں جبکہ ابن حبان وغیرہ نے اسے ثقہ قرار دیا ہے...... حارث ضعیف ہے مگر اس کے دو شاہد اوپر گزر چکے ہیں۔

۲۷- الترغیب: ۱۲۹ میں ہے۔ اسے حافظ ابوبکر الخطیب نے حسن سند کے ساتھ اور ابن عبدالبر نے کتاب العلم میں صحیح سند کے ساتھ حسن سے مرسل روایت کیا ہے۔

حجت ہوگا۔ جب صرف اس کو حاصل کرنے پر ہی اکتفا کر لیا جائے۔ تو یہ یہود جیسی صفت ہے جو کہنے کو تو تورات کے حامل تھے مگر عملاً اس کے حامل نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا. [الجمعہ:5]

''جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انھوں نے اس کا بار نہ اٹھایا، ان کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔''

یا اس طرح کی کیفیت اس شخص کی سی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا علم دیا مگر وہ ان میں سے گزر گیا، وہ اپنی سوچ وفکر میں مادی پستی اور حیوانی روش سے اوپر نہ اٹھ سکا۔ قرآن نے اس بات کو یوں واضح کیا ہے:

وَلٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوَاهُ، فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ[الاعراف:176]

''مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا، لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔''

نبی کریم ﷺ نے اسی لیے تو اس علم سے پناہ مانگی ہے جو فائدہ مند نہ ہو اور یہ وہ علم ہے جو اخلاق سے دور ہو، کیوں کہ یہ تو اپنے جاننے والے کے لیے وبال بن جاتا ہے اور بسا اوقات یہ وبال وتباہی اس کے اردگرد دوسروں تک بھی پہنچ جاتی ہے۔

حضرت زید بن ارقم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعا کیا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ، وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا يَشْبَعُ، وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا. (28)

''اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع بخش نہ ہو، ایسے دل سے جو خوفزدہ نہ ہو، ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو۔''

28- مسلم، ترمذی اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے۔

مذکورہ قسم اِن علماء کی ہے جن کے افعال ان کے اقوال کی اور ان کی خلوت ان کی جلوت کی تکذیب کرتی ہو۔ وہ عام لوگوں کے لیے مجسم فتنہ بن جاتے ہیں کیوں کہ لوگ بات سے زیادہ عمل وکردار سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ:

حَالُ رَجُلٍ فِيْ أَلْفِ رَجُلٍ أَبْلَغُ مِنْ مَقَالِ أَلْفِ رَجُلٍ فِيْ رَجُلٍ

''ہزار آدمی کے مقابلے میں ایک آدمی کا کردار، ایک آدمی کے مقابلے میں ہزار آدمی کی گفتگو سے زیادہ موثر ہے۔''

آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ: عالم سے علم سیکھو، اس کے عمل کی طرف نہ دیکھو لیکن لوگ آپ کی یہ بات ہرگز نہیں سنیں گے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

اِعْمَلْ بِعِلْمِيْ وَاِنْ قَصَرْتُ فِيْ عَمَلِي
يَنْفَعُكَ عِلْمِيْ وَلَا يَضُرَرْكَ تَقْصِيْرِي!

''اگرچہ میں خود کوتاہ عمل ہوں پھر بھی تم میرے علم کے
مطابق عمل کرو، اس لیے کہ میرا علم تمھیں نفع پہنچائے گا
مگر میرا قصور کوتاہی تمھیں نقصان نہیں دے گا۔''

اس سلسلے میں حضرت علیؓ کا قول ہے کہ:

''دو آدمیوں نے میری کمر توڑ ڈالی ہے: ایک جاہل عبادت گزار، دوسرا بے عمل عالم! پہلا اپنی پرہیز گاری وعبادت گزاری کے ذریعے لوگوں کو دھوکہ دیے رکھتا ہے اور دوسرا اپنے عیوب و معائب کی پردہ دری کر کے لوگوں کو گمراہی کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔''

علماء کی یہ قسم اس وقت اور زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے جب یہ حکامِ جور اور امرائے سوء کے حاشیہ بردار بن جائیں۔ یہ ان امراء وحکام کے برے افعال واقوال کو مزین کر کے ان کے سامنے بیان کرتے ہیں اور اپنے فتاویٰ ومشاورت کے ذریعے انھیں اس غلط کام کے کرنے پر اور زیادہ جری کر دیتے ہیں۔

یہی وہ چیز ہے جس نے ماضی میں ادیان کو تباہ کیا اور یہی چیز ہے جس سے بڑے بڑے مخلصین و مصلحین شاکی رہے ہیں۔ امام عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں:

وَ هَلْ أَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكَ وَأَحْبَارُ سُوْءٍ وَ رُهْبَانُهَا
لَقَدْ رَتَعَ الْقَوْمُ فِيْ جِيْفَةٍ يَبِيْنُ لِذِى اللُّبِّ اِنْتَانُهَا

"دین کو برباد کرنے والے بادشاہ اور علمائے سوء کے سوا اور کون ہیں۔ جس کی بنا پر قوم مردار کو کھانے کی مرتکب ہوگئی ہے حالانکہ ہوش منداس کے تعفن کو واضح طور پر محسوس کر لیتا ہے۔"

حضرت ابوالدرداءؓ سے مرفوعاً مروی ہے:

أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْ بَعْضِ الْكُتُبِ أَوْ أَوْحٰى اِلٰى بَعْضِ الْاَنْبِيَاءِ: قُلْ لِلَّذِيْنَ يَتَفَقَّهُوْنَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ، وَ يَتَعَلَّمُوْنَ لِغَيْرِ الْعَمَلِ وَ يَطْلُبُوْنَ الدُّنْيَا بِعَمَلِ الْاٰخِرَةِ يَلْبَسُوْنَ لِلنَّاسِ مُسُوْكَ الْكِبَاشِ. قُلُوْبُهُمْ كَقُلُوْبِ الذِّئَابِ. أَلْسِنَتُهُمْ أَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ وَ قُلُوْبُهُمْ أَمَرُّ مِنَ الصَّبْرِ، اِيَّايَ يُخَادِعُوْنَ، وَبِيْ يَسْتَهْزِءُوْنَ. بِيْ حَلَفْتُ لَأُتِيْحَنَّ فِتْنَةً تَذَرُ الْحَلِيْمَ فِيْهِمْ حَيْرَانَ (۲۹)

"اللہ تعالیٰ نے کسی کتاب میں نازل فرمایا ہے یا کسی نبی کو وحی فرمائی ہے کہ ان لوگوں سے کہہ دیجیے جو فقہ کا علم دین کے لیے حاصل نہیں کرتے، علم عمل کے لیے نہیں سیکھتے اور آخرت کے اعمال کے ذریعے دنیا سمیٹتے ہیں...... یہ لوگوں کے سامنے بھیڑ کی کھال میں نمودار ہوتے ہیں جب کہ ان کے دل بھیڑیوں جیسے ہیں، ان کی زبانیں شہد سے زیادہ میٹھی ہیں مگر دل ایلوا سے بھی کڑوے ہیں، یہ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور مجھ سے استہزاء کرتے ہیں۔ میں بھی اپنی ذات کی قسم کھاتا ہوں کہ ان کو ایسے فتنے میں مبتلا کروں گا جس میں بڑا عقل مند بھی حیران ہو کر رہ جائے گا۔"

۶- علم کو پھیلانے کی خواہش

علماء کے اخلاق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ان میں علم پھیلانے، اس کی تبلیغ کرنے اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی خواہش و تمنا ہو۔ جس طرح ایسے مال میں کوئی خیر نہیں جسے جمع

۲۹- جامع بیان العلم جلد ۱ صفحہ ۲۳۱-۲۳۲

کر کے رکھ دیا جائے اور خرچ نہ کیا جائے۔ اسی طرح اس علم میں بھی کوئی خیر نہیں جس کو چھپا کر رکھا جائے۔ جس طرح مال خرچ کرنے کے لیے ہوتا ہے اسی طرح علم پھیلانے کے لیے ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ اپنے صحابہؓ کو اس چیز کی تبلیغ کی ترغیب و تحریض دیا کرتے تھے جو انھوں نے سن رکھی ہو، تاکہ ان کے بعد آنے والے اور ان سے دور رہنے والوں تک بھی یہ باتیں پہنچ جائیں اور وہ ان سے مستفید ہوں۔

حجۃ الوداع میں آپؐ نے اسلام سے متعلق عظیم خطبہ دیا پھر اس کے آخر میں فرمایا:

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ(۳۰)

''تم جو یہاں موجود ہو، ان لوگوں تک یہ باتیں پہنچا دو جو یہاں حاضر نہیں۔''

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی حدیث میں فرمایا:

بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً(۳۱)

''میری طرف سے پہنچا دو خواہ ایک آیت ہی ہو۔''

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مرفوعاً مروی ہے:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ(۳۲)

''(نبی کریم ﷺ نے فرمایا) اللہ تعالیٰ اس آدمی کو خوش و خرم رکھے جس نے ہم سے کوئی بات سنی اور من وعن اسے دوسروں تک پہنچا دیا۔ جن تک بات پہنچائی جائے ان میں کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس بات کو سننے والوں سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے یاد رکھتے ہیں۔''

حضرت زید بن ارقم سے بھی مرفوعاً مروی ہے:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَبَلَّغَهُ غَيْرَهُ، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى

۳۰- متفق علیہ (حدیث ابی بکرہ)

۳۱- بخاری: باب ما ذکر عن بنی اسرائیل

۳۲- اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ نضرۃ کا معنی تزئین و جمال ہے۔ اور یہ رونق و بشاشت اور حسن کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ ترغیب حدیث ۱۵۰ میں ہے۔

مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ، وَ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَيْسَ بِفَقِيْهٍ(۳۳)

''اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاد و آباد رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سنی اور اس کو دوسروں تک پہنچایا۔ بہت سے عالم وفقیہ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے سے بڑے فقیہ تک بات پہنچانے کا باعث بن جاتے ہیں اور دوسروں تک علمی بات پہنچانے والے بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود اس بات کی فقہ و سمجھ نہیں رکھتے۔''

یہ احادیث اور اس مفہوم کی دیگر احادیث بھی ہیں جن کے باعث صحابہؓ اپنے دلوں میں رکھنے والے علم نبوت کی تبلیغ و اشاعت میں بڑے حریص ہوتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابوذرؓ کو خلیفہ ثالث حضرت عثمانِ غنیؓ نے فتویٰ دینے سے روک دیا تھا لیکن امام کی اطاعت کے وجوب پر ایمان رکھنے کے باوجود حضرت ابوذرؓ کی رائے یہ تھی کہ خاص اس معاملے میں امیرالمؤمنین کی اطاعت لازم نہیں ہے کیوں کہ تبلیغ سے متعلق امرِ رسولؐ امام کی ممانعت فتویٰ سے زیادہ قوی و مضبوط ہے...... حج کے موسم میں جب لوگوں نے ان کے گرد جمع ہو کر ان سے سوال پوچھنا شروع کر دیے تو قریش کا ایک آدمی پاس کھڑا ہو کر کہنے لگا: کیا آپ کو فتویٰ دینے سے منع نہیں کیا گیا؟ ابوذرؓ نے اپنا سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا پھر کہا: کیا تو مجھ پر نگران ہے؟ (اپنی گردن کی طرف اشارہ کر کے کہا) اگر تم تیز دھار تلوار بھی اس پر رکھ دو اور مجھے یہ یقین ہو کہ میں رسول اللہؐ سے سنا ہوا ایک لفظ، اپنی زبان سے ادا کر سکتا ہوں تو تمھاری تلوار کے وار سے قبل میں یہ لفظ ضرور ادا کر کے رہوں گا۔(۳۴)

وہ آیات و احادیث بھی حضرت ابوذرؓ کے موقف کو قوی بناتی ہیں جن میں کتمانِ علم کی بڑی تحذیر آئی ہے اور اس علمی شخص سے لوگوں کو دور رکھنے پر ڈرایا گیا ہے جس سے لوگ فائدہ

۳۳- ابن حبان نے صحیح میں اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے جیسا کہ ترغیب حدیث ۵ میں ہے۔ احمد، ابن ماجہ اور طبرانی کے ہاں حدیث جبیر بن مطعم سے اس کا ایک شاہد بھی ہے۔ دیکھیے: الترغیب ۱۵۳

۳۴- بخاری نے اسے صحیح میں معلق روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۱۷۰ پہ کہا ہے: مسند دارمی اور حلیہ میں ہم نے اس کو موصولاً روایت کیا ہے اور یہ بات معلوم و مشہور ہے کہ امام بخاری جس حدیث کو صیغہ جزم کے ساتھ معلق روایت کریں، جمہور علماء کے نزدیک وہ صحیح کا حکم رکھتی ہے۔

حاصل کریں خصوصاً اس وقت جب لوگوں میں طلب وسوال کا داعیہ وجذبہ فراواں ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہا کرتے تھے: لوگ کہتے ہیں ابو ہریرہ نے احادیث بہت روایت کی ہیں لیکن بات یہ ہے کہ اگر قرآنِ حکیم میں یہ دو آیات نہ ہوتیں تو میں کبھی حدیث بیان نہ کرتا۔ پھر ان آیات کو تلاوت کرتے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَ الْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُوْلٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ. إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ أَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَأُولٰٓئِكَ أَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَ أَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. [البقرہ:۱۵۹-۱۶۰]

”جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم اُنھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی اُن پر لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو اِس روش سے باز آ جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اسے بیان کرنے لگیں، ان کو معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔“

انھی آیات کی طرح یہ آیت بھی ہے:

وَ إِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهُ[آل عمران: ۱۸۷] ”ان اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمھیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا، انھیں پوشیدہ نہیں رکھنا ہوگا۔“

حضرت ابو ہریرہؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَّارٍ(۳۵)

”جس شخص سے علم سے متعلق سوال پوچھا گیا اور اس نے اس کو چھپایا تو

۳۵- ابو داؤد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔ ابن ماجہ، بیہقی اور ابن حبان نے صحیح میں روایت کیا ہے۔ حاکم نے بھی اسی حدیث کو روایت کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح السند ہے مگر بخاری و مسلم نے اسے روایت نہیں کیا۔ دیکھیے: الترغیب: حدیث ۱۹۹

قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔"

اسی مفہوم کی حدیث ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ (۳۶)

عبداللہ بن عمرو سے بھی ایک حدیث ان الفاظ میں مروی ہے!

مَنْ كَتَمَ عِلْمًا أَلْجَمَهُ اللهُ...... الخ (۳۷)

"جس شخص نے علم کو چھپایا اللہ اس کو لگام پہنائے گا....." الخ

امام ابن اثیرؒ نے کہا ہے:

"علمی بات بتانے سے گریز کرنے والا شخص اس آدمی کی طرح ہے جس نے اپنے نفس کو لگام ڈال رکھی ہو۔" مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس کو قولِ حق اور اِخبارِ علم سے روکے رکھے گا، آخرت میں آگ کی لگام کا اس کو عذاب دیا جائے گا۔

مذکورہ وعید اس علم کے بارے میں ہے جس کی تعلیم دوسروں کو دینا اس کے جاننے والے پر لازم و متعین فرض ہے۔ مثلاً اس کے پاس کوئی کافر آ جاتا ہے جو قبولِ اسلام کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے سکھاؤ، بتاؤ کہ اسلام کیا ہے؟ دین کیا ہے؟ یا کوئی ایسا شخص آ جاتا ہے جو حلال و حرام سے متعلق فتویٰ لینا چاہتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے اس بارے میں فتویٰ دو، میری رہنمائی کرو، ایسے مواقع و مسائل پر لازم ہے کہ اہل علم ان کو معروف و صحیح جواب دیں۔ اس وقت بھی اگر کسی نے اپنے آپ کو بات کرنے سے روکے رکھا تو وہ وعید کا مستحق ٹھہرا اور معاملہ کی یہ نوعیت نفلی علوم میں نہیں جن کی دوسروں کو تعلیم دینا لازم ہو۔ (۳۸)

ایک عالم کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے اور نہ وہ اتنی مشقت کر سکتا ہے کہ ہر علم کی تبلیغ شروع کر دے اور ہر سائل کا جواب دے۔ یہ تو متعلم کی ضرورت و حاجت، عالم کی اہلیت و طاقت،

۳۶- اسے ابویعلیٰ نے روایت کیا ہے، اس کے رُوات ثقہ ہیں جن سے صحیح کی دلیل لی ہے۔ طبرانی نے الاوسط اور الکبیر میں جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ دیکھیے: الترغیب ۲۰۱

۳۷- اسے ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ایسی صحیح ہے جس پر کوئی گرد نہیں۔ دیکھیے: الترغیب: حدیث ۱۰۰۔ منذری نے کہا ہے کتمان علم پر وعید کی حدیث مذکورہ روایت کے علاوہ صحابہؓ کی ایک جماعت نے بیان کی ہے۔

۳۸- جامع الاصول جلد ۸ صفحہ ۱۲ حدیث ۵۸۳۷

موضوع کی اہمیت اور کسی دوسرے عالم کی موجودگی یا عدم موجودگی ہوتی ہے جو اِس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ جواب دینا کس وقت ضروری ہے اور کس وقت غیر ضروری!

حدیث میں اپنے نفس کو کلام کرنے سے لگام ڈالنے پر جو وعید آئی ہے۔ میری نگاہ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی طمع و لالچ یا خوفِ خلائق کی بنا پر قصداً سکوت اختیار کرلیا جائے اور یہ کتم شہادت ہے:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ [البقرہ:۱۴۰]

''اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔''

قرآن نے اہل کتاب کی اسی برائی پر ان کی مذمت کی ہے:

وَ إِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ. [آل عمران:۱۸۷]

''ان اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمھیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا، انھیں پوشیدہ نہیں رکھنا ہوگا۔ مگر انھوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کررہے ہیں۔''

اس کا مطلب یہ نہیں کہ نقلی علوم کی نشرواشاعت نہ کی جائے بلکہ یہ ضروری ہے کہ نشروتبلیغ کے زبانی وتحریری وسائل کو استعمال میں لاتے ہوئے ان علوم کو بھی پھیلایا جائے کیوں کہ قلم بھی ایک زبان ہے۔ جب کوئی شخص حرص ورغبت کے ساتھ علم کا حصول چاہتا ہو تو پھر اس علم کے جاننے والے کے لیے ضروری ہے کہ جس طرح اسے یہ علم سکھایا گیا ہے وہ بھی دوسروں کو سکھائے تاکہ علم کی یہ روایت وزندگی باقی رہ سکے۔ یہ کام فرض کفایہ میں شامل ہے اور بعض اہل علم کی افادۂ عام کی خاص اہلیت کے باعث اس علم کی تعلیم وتبلیغ ان پر فرض بھی ہوجاتی ہے۔

بعض صحابۂ کرامؓ کئی ایسی احادیث بیان کرتے تھے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سن رکھی تھیں مگر ان کا مفہوم بیان کرنے سے ڈرتے تھے کہ وہ کوئی دوسرا مفہوم نہ بیان کردیں۔ گناہ

سے بچنے کی خاطر وہ زندگی کے آخری لمحات میں یہ باتیں بیان کرتے تھے، وہ بھی اس خیال سے کہ وہ مر گئے تو یہ علمی حقیقت بھی ان کے ساتھ ہی مر جائے گی۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی موت کا وقت آیا تو وہ کہنے لگے: میں نے تم سے ایک حدیث چھپا کر رکھی ہوئی تھی جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی۔ ابھی میں ہوش وحواس میں ہوں لہٰذا وہ حدیث تم کو سنا دیتا ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

لَوْ لَا أَنَّكُمْ تُذْنِبُوْنَ لَذَهَبَ اللّٰهُ بِكُمْ وَ خَلَقَ خَلْقًا يُذْنِبُوْنَ فَيَغْفِرُ اللّٰهُ لَهُمْ (۳۹)

''اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمھیں ختم کر کے کسی اور قوم کو لے آتا جو گناہ کرتی (اور ان کی استغفار پر) اللہ انھیں معاف کرتا۔''

حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَ مُعَاذٌ رَدِيفَهُ عَلَى حِمَارٍ قَالَ: "يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ! قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ سَعْدَيْكَ ثَلَاثًا. قَالَ: "مَا مِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ" قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَفَلَا أُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْا؟ قَالَ: إِذَنْ يَتَّكِلُوْا......" وَأَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّمًا. (۴۰)

''رسول اللہ ﷺ گدھے پر سوار تھے اور معاذؓ آپؐ کے ردیف تھے، آپؐ نے فرمایا: اے معاذ بن جبلؓ! معاذ نے عرض کیا لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ سَعْدَيْكَ. معاذؓ نے یہ تین بار عرض کیا: آپؐ نے فرمایا: جو آدمی صدقِ دل سے یہ شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، تو اللہ اس کے جسم کو آگ کے لیے حرام کر دے گا۔'' معاذؓ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! کیا میں لوگوں کو یہ بات نہ بتا دوں تاکہ وہ خوش ہو جائیں۔ آپؐ نے فرمایا پھر تو وہ

۳۹۔ مسلم نے اسے التوبہ میں روایت کیا ہے۔ باب سقوط الذنوب بالاستغفار حدیث ۲۷۴۸، ترمذی: کتاب الدعوات باب ۱۰۵ حدیث ۳۵۳۳، مسلم نے حدیث ابی ہریرہ سے روایت کیا ہے، حدیث ۲۷۴۹

۴۰۔ بخاری: کتاب العلم، باب من خص بالعلم قومًا دون قوم کراھیة ألا یفھموا۔

اسی پر بس کر دیں گے......" معاذؓ نے یہ حدیث گناہ سے بچنے کی خاطر بوقت وفات بیان کی تھی۔"

تلامیذِ صحابہؓ، تابعینؒ اور مابعد کے محسنین امت علم کی تبلیغ و تعلیم اور لوگوں تک اس کی شعاعیں پھیلانے اور بکھیرنے پر اسی قدر حریص تھے جس قدر اُن سے قبل کے لوگ حریص تھے۔ ان کی حالت تو یہ ہوتی تھی کہ اگر ان سے علم حاصل کرنے والا یا سوال و جواب کرنے والا کوئی نہ ہوتا تو زمین باوجود اپنی کشادگی کے ان پر تنگ ہو جاتی اور وہ کسی دوسری زمین و علاقے کی طرف سفر کی فکر کرنے لگتے۔

عطاء کہتے ہیں:

"میں سعید بن المسیب کے پاس گیا تو وہ رو رہے تھے۔ میں نے پوچھا تمھیں کون سی چیز رُلا رہی ہے۔ کہنے لگے: کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھ سے سوال کرے!"

سفیان ثوری سے بیان کیا گیا ہے کہ: وہ عسقلان گئے اور وہاں کچھ عرصہ ٹھہرے لیکن کسی نے ان سے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ کہنے لگے میرے لیے کرائے کی سواری کا بندوبست کر دو تا کہ میں اس شہر سے نکل جاؤں۔ یہ تو ایسا شہر ہے جس میں علم کی موت ہے۔

امام غزالی نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد احیاء علوم الدین میں لکھا ہے کہ سفیان ثوری کا یہ فعل تعلیم کی فضیلت اور علم کی بقا کا اہتمام کرنے کی حرص تھی۔

۷۔علم کو چھپانے اور پھیلانے سے متعلق چند مسائل

کتمان و نشرِ علم سے متعلق متعدد مسائل ہیں مناسب ہو گا کہ انھیں یہاں پیش کر کے ان پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

۱۔ بعض معلومات کو پوشیدہ رکھنا کب جائز ہے؟

عالم کا یہ حق ہے کہ وہ کسی مصلحت کی خاطر کچھ معلومات کو لوگوں سے پوشیدہ رکھے، خواہ لوگ اس سے ان کے بارے میں پوچھیں۔ یہ کیفیت اس وقت ہو گی جب ایسی معلومات کے افشا کا نقصان و ضرر علم کے نفع سے زیادہ ہو۔

محض پریشان کرنے کی خاطر سوال کرنے والے کو تادیباً چھوڑا جا سکتا ہے یا اسے سوال کے بجائے کسی اہم اور زیادہ مفید بات کی طرف راغب کرنے کے لیے ایسا کیا جا سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر مسائل و مواقع پر اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے:

كَفٰى بِالْمَرْءِ اِثْمًا اَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ (۴۱)

''آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر اس بات کو دوسروں سے بیان کردے جو اس نے سن رکھی ہے۔''

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے راز کی دو باتیں حفظ کی تھیں ایک تو میں نے افشا کر دی ہے اگر دوسری بھی کردوں تو یہ حلق کاٹ دیا جائے یعنی قتل کر دیا جاؤں۔ (۴۲)

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں، علماء نے ''راز'' کو ان احادیث پر محمول کیا ہے جن میں امرائے سوء کی برائیوں اور ان کے احوال و زمن کی تعیین ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بعض چیزوں کی طرف اشارہ کر دیتے تھے ان کی کوئی صراحت و وضاحت نہیں کرتے تھے۔ شاید وہ لوگوں کے خوف کی بنا پر ایسا کرتے تھے مثلاً ان کا کہنا ہے:

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ رَأْسِ السِّتِّيْنَ وَ إِمَارَةِ الصِّبْيَانِ ''میں ساٹھویں برس اور بچوں کی حکمرانی سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔''

یہ انھوں نے خلافت یزید کی طرف اشارہ کیا ہے اور اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی وہ خلافت یزید سے ایک سال قبل وفات پا گئے۔ (۴۳)

۴۱- مقدمہ صحیح مسلم

۴۲- بخاری: کتاب العلم باب حفظ العلم

۴۳- حافظ نے بھی ابن منیر کا یہ قول نقل کیا ہے: فرقہ باطنیہ نے اس حدیث کو تصحیح باطل کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ اس باطن کا حاصل تو دین میں انحلال کا واقع ہو جانا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ ابوہریرہؓ کے قول ''قطع......'' کا مطلب یہ ہے کہ اہل جور جب اپنے افعال کے عیوب اور اپنی کارستانیوں کی گمراہیاں سنیں گے تو وہ انھیں قتل کر دیں گے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مکتوم احادیث اگر احکام شرعی کے بارے میں ہیں تو انھیں چھپانا درست

۲- کتاب مستعار لینے کا حکم؟

بعض علماء نے طالب علم سے کتاب روک رکھنے کو کتمانِ علم کی وعید میں شامل کیا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ آپ کے متعدد نسخے دستیاب نہ ہوں جب کہ اکثر ایسا ہوتا ہے۔

طلبہ کو کتاب مستعار دینے کے اس وجوب کا یہ تقاضا اس وقت ہے جب طلبہ کو کتاب کی حقیقتاً ضرورت ہو۔ میرے نزدیک کتاب کو طلبہ سے روک لینا بھی منع ماعون (استعمال کی عام چیزوں کا نہ دینا) میں شامل ہے اور اس روش پر قرآنِ مجید میں ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس میں جو وعید آئی ہے وہ تو ہے ہی۔ مگر میری رائے میں یہ وجوب مشروط ہے۔

شرائط حسب ذیل ہیں:

۱- کتاب مستعار لینے والے کو حقیقتاً اس کی ضرورت ہو اور یہ ضرورت کہیں اور سے پوری نہ ہو رہی ہو۔

۲- پبلک لائبریریاں موجود نہ ہوں کہ وہاں سے کتاب مل سکے۔ یا وہاں بیٹھ کر پڑھی جا سکے۔

۳- کتاب بازار میں دستیاب نہ ہو اور آدمی کتاب خرید نہ سکے یا مالی اعتبار سے اس میں کتاب خریدنے کی طاقت ہی نہ ہو۔

۴- وہ آدمی کتاب کے معاملے میں بے پروا مشہور نہ ہو کہ کتاب ضائع و برباد کر دیتا ہے۔

۵- کتاب کے مالک کو کتاب کی ضرورت نہ ہو کیوں کہ اگر اسے ضرورت ہے تو اس کی ضرورت مقدم ہوگی۔ حدیث میں آیا ہے: اِبْدَأْ بِنَفْسِکَ ''اپنے آپ سے کام کا آغاز کرو۔'' دوسری حدیث میں ہے: اِبْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ ''(مال دینا) اس شخص سے شروع کرو جو تمھاری عیالداری میں ہو۔''

(گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) نہیں۔ اس بنا پر کہ اوپر پہلی حدیث میں آیت سے استدلال کرتے ہوئے کتمانِ علم کی مذمت کا ذکر ہو چکا ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ احتمال موجود ہے کہ ابو ہریرہؓ نے مذکورہ مفہوم کے ساتھ زمانہ اخیر میں ملاحم و تغیر احوال اور اشراط قیامت مراد لیا ہو۔ اس بات کا وہ شخص انکار کرے گا جو ایسی باتیں سننے کا عادی ہے اور بے شعوری کے باعث اس پر اعتراض کرے گا۔ دیکھیے الفتح: جلد ا صفحہ ۲۲۷ مطبوعہ الحلبی۔

۳۔حقوق تالیف واشاعت

عصر حاضر میں بعض علماء نے اس بات کو اس زمرے میں شامل کیا ہے جن کا چھپانا حرام ہے کہ کوئی مؤلف اپنی اجازت، معاہدہ اور رائلٹی کے بغیر اپنی کتاب کسی کو شائع کرنے سے روک دے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ جو کوئی بھی کتاب چھاپنا چاہے مؤلف پر ضروری ہے کہ وہ کوئی رکاوٹ ڈالے بغیر، مادی منفعت کا سوچے بغیر اور ذخیرہ اندوزی کا خیال ذہن میں رکھے بغیر اس کی اجازت دے دے۔

عصر حاضر میں لوگوں نے جس چیز کو حقوقِ نشر واشاعت وتقسیم وغیرہ کا نام دے رکھا ہے یہ علماء اس کو ناپسند کرتے ہیں۔یہ عام اور اہم مسئلہ ہے جو تحقیق وتمحیص کا متقاضی ہے مگر میرے پاس وقت نہیں کہ اس پر بحث کی جائے۔

اس موضوع پر گفتگو کافی حد تک اس قدیم بحث وجدال کے مشابہ ہے جو فقہاء کے درمیان برپا رہی کہ دینی امور مثلاً اذان وامامتِ نماز، خطبۂ جمعہ، مساجد میں وعظ وتذکیر وغیرہ پر اُجرت لی جاسکتی ہے یا نہیں؟ کیوں کہ یہ تو دراصل دینی فرض ہے جو ایک مسلمان پر عائد ہوتا ہے لہٰذا اسے یہ فرض ثواب کی نیت سے اللہ کی خوشنودی وقرب کے حصول کے لیے بغیر کسی مادی معاوضہ کے انجام دینا چاہیے۔

قدیم فقہاء کے درمیان شروع ہونے والی یہ بحث تغیر زمانہ کے باعث بالآخر علمائے متاخرین کے اس اتفاق رائے پر آکر ختم ہوئی کہ ان امور کی انجام دہی پر معاوضہ لینا جائز ہے کیوں کہ ان دینی امور میں تعطل واقع ہو جانے کا خطرہ تھا اور بلا اُجرت ومعاوضہ ان امور کو انجام دینے والا کون ملتا؟ لہٰذا شعائر دین کی انجام دہی کو جاری رکھنے، اللہ کے گھروں کو آباد کرنے اور مصلحت دین کا تقاضا یہ ہوا کہ اُجرت کو جائز قرار دیا جائے۔

(اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے)

بہرحال جن جملہ امور پر متنبہ کرنا ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں:

اولاً: کتاب مؤلف کی ملکیت ہوتی ہے۔اسی لیے اس کی اچھائی برائی اسی سے منسوب ہوتی ہے، اس کی غلطیوں پر اسی کا محاسبہ ہوتا ہے۔یہاں ملکیت سے مراد علمی وادبی ملکیت ہے

اور یہ وہ معاملہ ہے کہ شہری قوانین میں ساری دنیا اس کا اعتراف کرتی ہے۔

اس بات میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ جب کوئی شخص کسی چیز کا مالک بن جاتا ہے تو اسے اس میں تصرف کرنے کا کھلا اختیار مل جاتا ہے۔ اسے یہ حق بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس چیز کے ثمرات سے مستفید ہو۔ یہ چیزیں تو ملکیت کے لوازمات میں سے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی گھر کا مالک ہوتا ہے تو اس کا یہ حق ہے کہ وہ اس گھر میں رہے، اسے کرایہ پر دے یا اسے بیچ دے اور اگر کوئی کتاب کا مالک ہے تو اس کا بھی یہی معاملہ ہے۔

ثانیا: ایک علمی کتاب از خود وجود میں نہیں آ جاتی بلکہ یہ طویل مشقت و جہد کا ثمرہ ہوتی ہے جس میں مصنف نے اپنی علمی شخصیت کو گھلایا ہوتا ہے۔ پھر یہ کتاب سخت مشقت اٹھانے، راتوں کو جاگنے اور دن کو پسینہ بہانے کا نتیجہ ہوتی ہے، اس تکلیف کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس مرحلہ سے گزرا ہو، بعض اوقات تو ایک کتاب مصنف کے کئی برس لے لیتی ہے تب کہیں جا کر وجود میں آتی ہے۔ کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ مصنف خطرات میں گھر کر یہ کام کرتا ہے۔ یہ وہ کمائی ہے جسے مصنف طویل عمل کے بعد اپنی کتاب میں جمع کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی کارخانہ یا کوئی عمارت ایک کے مالک کی طویل جدوجہد کا ثمرہ ہوتی ہے۔

ثالثا: ایک مؤلف و مصنف عالم کی زندگی عام لوگوں کی مانند سہل نہیں ہے۔ اس کی زندگی تو دیگر لوگوں کی نسبت ایک خاص اور زائد محنت کا مطالبہ کرتی ہے جب کہ دیگر لوگوں کے مقابلے میں اسے زائد اخراجات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک عالم کو ایک ضخیم لائبریری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے ایسے آدمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو کتاب کی کتابت و طباعت میں اس کی معاونت کرے۔ اسے ایسے آدمی کی ضرورت بھی ہے جو اس کے گھریلو کام کاج میں اس کا معاون ہو کیوں کہ وہ خود تو ان کاموں کی انجام دہی کے لیے فارغ نہیں ہوتا جس طرح عام لوگ فارغ ہوتے ہیں۔ اس کے بغیر تو وہ ایک حقیقی علمی چیز سامنے نہیں لا سکتا۔ وہ کسی یونیورسٹی، وزارت یا ادارے میں ملازم ہی کیوں نہ ہو اگر اس کو اس کی تالیفات کا کچھ معاوضہ نہیں ملتا تو وہ یہ تمام اخراجات کہاں سے پورے کرے؟

رابعاً: مؤلف کتاب کا ایڈیشن شائع کرتا ہے۔ پھر وہ کسی نئی اطلاع، تغیر اجتہاد یا اچھی تجویز کے سامنے آنے پر دیکھتا ہے کہ کچھ چیزیں اس میں اضافہ یا حذف یا تبدیل کر دینی چاہییں۔ اب اگر طابع و ناشر کو مؤلف کی ان تبدیلیوں اور ترامیم کا علم نہ ہوگا تو وہ پہلے ہی مسودہ پر کتاب دوبارہ شائع کر دے گا۔ اس طرح مؤلف کے ذمے ایک ایسی چیز لگ جائے گی جسے وہ نہیں چاہتا کہ اس سے یہ چیز منسوب ہو۔

قدیم علماء کسی عالم کی کتاب کی نقل و روایت کو جائز نہ سمجھتے تھے مگر مؤلف کی اجازت کے ساتھ۔ کئی علماء تو اپنے کچھ طلبہ شاگردوں کو اپنی کسی خاص کتاب کی روایت کی اجازت دے دیتے تھے اور بسا اوقات وہ تمام کتب کی روایت و نقل کی بھی اجازت دے دیتے تھے۔

یہی اجازت ہے جو دورِ حاضر میں حقوقِ طبع و نشر سے مشابہ ہے۔ اب اس میں اضافہ یہ ہو گیا ہے کہ مؤلف کتاب کی تالیف میں صرف ہونے والی جہد پر اُجرت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس طرح ناشر کتاب شائع کرنے کے عوض حاصل ہونے والے نفع میں سے کچھ حصہ مصنف کو بھی دیتا ہے۔

لیکن وہ معاملہ جس میں حقیقی تاکید و تشدید مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ ناشر و مؤلف کتاب پڑھنے والوں کی ضرورت کو دیکھ کر قیمت نہ بڑھائیں جس طرح یونیورسٹی کی بہت سی کتب میں ہوتا ہے۔ یا ایسی کتب میں جو عوام میں مقبول ہوں۔ لوگوں کو اس طرح لوٹنے کے لیے قیمتیں بڑھانا جائز نہیں ہے۔

---oo---

حصولِ علم کے آداب

انسان علم سے بے بہرہ پیدا ہوتا ہے لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جاننے اور باخبر رہنے کی حب وطلب اس کی فطرت میں ڈال دی ہے اور اسے علم کے وہ ذرائع عطا کر دیے ہیں جن کی وساطت سے وہ اپنے نفس اور ماحول کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

وَ اللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِّنْم بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. [النحل:۷۸]

''اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اُس نے تمھیں کان دیے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیے، اِس لیے کہ تم شکر گزار بنو۔''

اسی بنا پر انسان اس قابل ہوا ہے کہ تعلیم حاصل کرے اور سمع و روایت، بصر و مشاہدہ اور فؤاد و تفکیر کے ذریعے حقائقِ وجود و اسرارِ کائنات کی پردہ کشائی کرے۔ یہ وہ ذرائع ہیں جو اللہ تعالیٰ نے امانت کے طور پر انسان کو ودیعت کر رکھے ہیں، اور عنقریب وہ اللہ کی بارگاہ میں ان کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ، اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُوْلٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا. [الاسراء:۳۶]

''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔''

انسان حصولِ علم کے اپنے ارادہ و عزم کو جب مہمیز لگاتا ہے تو یہی وسائل ہیں جن کے ذریعے دین و دنیا کا علم حاصل کرنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے، پھر دنیا کی مصروفیات اسے علم

حاصل کرنے سے نہیں روک سکتیں۔ اللہ کی سنت بھی یہی ہے۔

کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ انسان گھر میں بیٹھا رہے اور آسمان اوپر سے علم برسا دے۔ علم تو اس شخص کو حاصل ہوگا جو اس کی طلب میں نکلے اور اس راہ کی مشکلات و مسائل برداشت کرے۔

حدیث شریف میں اس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ تَعَلَّمُوْا. اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ، وَ الفِقْهُ بِالتَّفَقُّهِ، وَ مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِيْ الدِّيْنِ(۱)

''لوگو! علم حاصل کرو، علم سیکھنے سے اور فقہ سوچنے سے حاصل ہوتی ہے اور اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا کر دیتا ہے۔''

ایک مسلمان کے لیے تو یہ جائز ہی نہیں کہ وہ علم سے کٹ کر زندگی گزارے۔ جو عالم نہیں اسے چاہیے کہ طالب علم بن جائے۔ جو طالب علم نہ بن سکے وہ علم و عقل کی باتیں ہی سن لیا کرے۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اہل علم اور علم دوست لوگوں سے محبت کرنے والا ہی بن جائے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

حضرت ابوبکرۃ سے روایت ہے کہ:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ''اُغْدُ عَالِمًا أَوْ مُتَعَلِّمًا أَوْ مُسْتَمِعًا أَوْ مُحِبًّا، وَلَا تَكُنِ الْخَامِسَةَ فَتَهْلَكَ'' قَالَ عَطَاءٌ: قَالَ لِي مُسْعِرٌ: زِدْتَنَا خَامِسَةً لَمْ تَكُنْ عِنْدَنَا، وَالخَامِسَةُ أَنْ تَبْغَضَ الْعِلْمَ وَ أَهْلَهُ(۲)

۱- حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۱۷۰ پر لکھا ہے: اسے ابن ابی عاصم اور طبرانی نے حدیث معاویہ سے وارد کیا ہے۔ اس کی سند حسن ہے کیونکہ اس میں ایک راوی مبہم ہے لیکن ایک دوسرے طریق سے یہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ بزار نے بھی ایسی ہی موقوف حدیث ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے۔ ابونعیم الاصفہانی نے مرفوعاً روایت کی ہے۔ اس باب کی احادیث ابوالدرداءؓ وغیرہ سے بھی مروی ہیں۔ اس آدمی کی بات میں نہیں آنا چاہیے جس نے اسے بخاری کے کلام کا حصہ کہا ہے۔

۲- طبرانی نے اسے اپنی تینوں معاجم میں اور بزار نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے رواۃ ثقہ ہیں جیسا کہ مجمع الزوائد جلد ۱ صفحہ ۱۲۲ پر ہے۔

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ: ''ایک عالم یا علم سیکھنے والا یا علم کی باتیں سننے والا یا علم اور اہل علم سے محبت کرنے والا بن جا۔ ان چار حالتوں کے علاوہ اگر تو پانچویں حالت میں ہوگا تو ہلاک ہو جائے گا۔'' عطا کہتے ہیں مجھے مسعرؒ نے کہا: تو نے ہمیں پانچویں چیز بتا دی جو ہمیں معلوم نہیں تھی۔ یہ پانچویں چیز یہ ہے کہ تو علم اور اہل علم سے بغض رکھے۔''

ہر مسلمان کے لیے کیا سیکھنا فرض ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے حصولِ علم کی اتنی زیادہ حث وترغیب دلائی ہے کہ اسے ایک لازمی فریضہ قرار دیا ہے، یہ بات اس زبان زدعام حدیث میں ہے جو ہر چھوٹے بڑے اور خاص وعام کو یاد ہے یعنی:

طَلَبُ العِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (۳)

''علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔''

یعنی ہر اس انسان پر جو مسلمان ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت! اسی بنا پر عام لوگ اس حدیث کے آخری الفاظ علی کل مسلم کے بعد لفظ مسلمة روایت کرتے ہیں، یہ لفظ معنیٰ ومفہوم کے اعتبار سے تو ٹھیک ہے لیکن حدیث میں نہیں آیا۔

۳- ابن ماجہ اور ابن عبد البر نے العلم میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں حدیث انس سے روایت کیا۔ طبرانی نے الکبیر میں ابن مسعود اور الاوسط میں ابن عباس اور ابی سعید وغیرہم سے روایت کیا ہے۔ ان تمام طرق میں کلام ہے۔ اسی بنا پر ابن قطان، ابن عبد البر اور نووی وغیرہم نے اسے ضعیف کہا ہے لیکن ابن عبد البر اور نووی نے کہا ہے: اس کا معنی صحیح ہے۔ مگر زرکشی ''اللآلی'' میں کہتے ہیں: یہ ایسے طرق سے مروی ہے جو حسن کے درجہ کو پہنچ جاتے ہیں۔ حافظ المزی نے بھی ایسی ہی بات کہی ہے۔ سیوطی کہتے ہیں: میں نے اس کے پچاس طرق جمع کیے ہیں اور اس پر صحیح لغیرہ کا حکم لگایا ہے۔ میں کسی ایسی حدیث کو صحیح قرار نہیں دیتا جس کی صحت کی بنا پر کسی دوسری حدیث کو صحیح قرار نہ دیا ہو۔'' سخاوی کہتے ہیں: ابن شاہین کے ہاں انس کی سند کا ایک شاہد ہے جس کے رجال ثقہ ہیں، دیکھیے: الجامع الصغیر احادیث ۵۲۶۴، ۵۲۶۷ اور فیض القدیر جلد ۴ صفحہ ۲۶۷، ۲۶۸ پر مناوی کا حاشیہ!

یہ بات تو عیاں ہوگئی کہ علم کا حصول فرض ہے مگر کون سا علم حاصل کرنا فرض ہے جسے حدیث میں ہر مسلمان پر فرض قرار دیا گیا ہے؟

اس بارے میں مختلف اقوال اور متضاد آراء ہیں جو بیس کے قریب ہیں۔

علامہ مناوی کا کہنا ہے: ہر گروہ نے اپنے نزدیک فرض علم کے دلائل قائم کر رکھے ہیں، ان میں سے ہر کوئی دوسروں کے برعکس ہے، اور کچھ تو ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں:

- متکلم، علم کلام کو ہی "علم" گردانتا ہے اور یہ دلیل دیتا ہے کہ رتبہ کے لحاظ سے ضروری علم یہی ہے کیوں کہ یہ علمِ توحید ہے، اور یہی اس عمارت کی بنیاد ہے۔
- فقیہہ علم فقہ کو علم پر محمول کرتا ہے کہ یہ حلال وحرام کا علم ہے۔ اسی کے ذریعے ایک مسلمان کو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کیسے کرنی ہے، لوگوں سے معاملات کس طرح کرنے ہیں۔ فقہ کا کہنا ہے کہ شرع میں جس چیز پر علم کا اطلاق ہوتا ہے اس میں اولین حیثیت اسی علم (فقہ) کو حاصل ہے۔
- مفسر کی رائے یہ ہے کہ جس چیز پر علم کا اطلاق ہوتا ہے اس میں اَولی وہ علم ہے جو کلامِ الٰہی کے معانی ومطالب اور مراد ومفہوم کو سمجھنے کے لیے انسانی قدرت وطاقت کے مطابق حاصل کیا جائے اور یہ علمِ تفسیر ہے۔
- ایک محدث کے نزدیک علم، سنن وآثار کی معرفت حاصل کرنا ہے کیوں کہ یہی قرآن کی وضاحت کرتی ہیں، مجمل کو مفصل اور مبہم کو مُبیَّن کرتی ہیں، عام کو خاص اور مقید کو مطلق سے جدا کرتی ہیں اور یہ قرآن کو سمجھنے کے ذرائع ہیں جو نجات کی راہ ہے۔
- نحوی، زبان عربی کی تعلیم پر زور دیتا ہے کیوں کہ شریعت کتاب وسنت سے ماخوذ ہے اور وہ دونوں عربی میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ. [ابراہیم:۴]

"ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اُس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔"

آیت کریمہ میں جس "بیان" کی طرف اشارہ ہے، اسے سمجھنے کے لیے عربی زبان میں

اہلیت پیدا کرنا ضروری ہے۔

- صوفی کے مطابق بندے اور اللہ کے درمیان حال و مقام کا علم یا آفاتِ نفس اور ان سے چھٹکارے اور شیطان کے راستوں کا علم ضروری ہے۔
- ابوطالب مکی کہتے ہیں: علم تو وہ ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے جس میں اسلام کی بنیادوں کا ذکر ہے۔ یعنی بنی الاسلام علی خمس...... الخ کیوں کہ یہی پانچ چیزیں واجب ہیں لہٰذا ان پر عمل کرنے کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور اس کا واجب ہونا ہی اس کی اہمیت کے لیے کافی ہے۔

اس طرح کی متعدد آراء اور مختلف اقوال ہیں اور ہر کسی کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہے۔ میرے نزدیک ایک مسلمان پر اس علم کا سیکھنا اور حاصل کرنا عین واجب ہے، جو اس کے دین و دنیا میں ضروری ہے۔

دین میں حسب ذیل علومِ شرعی سیکھنے اس کے لیے ضروری ہیں:

۱) اتنا علم جس کے ذریعے وہ اپنے عقیدہ کی یقینی اور صحیح معرفت حاصل کر سکے جو اسے شرکیات و خرافات سے محفوظ رکھے۔

۲) اس قدر علم جس کے مطابق وہ اپنی عبادت کو درست کر سکے کہ وہ ظاہری طور پر شرعی صورت کے مطابق ہو اور باطنی طور پر اس میں نیت کے خلوص کی فراوانی ہو۔

۳) وہ اپنا تزکیۂ نفس اور تطہیر قلب کر سکے۔ اس کے لیے فضائل (اچھے اخلاق) کا علم ہو، تاکہ ان سے آراستہ ہو سکے اور رذائل (برے اخلاق) کا علم ہو، تاکہ ان کے ارتکاب سے اجتناب کرے۔

۴) وہ علم جو اس کے اپنے نفس یا خاندان یا لوگوں خواہ وہ حکام ہوں، محکوم ہوں، مسلمان ہوں یا غیر مسلم! سے تعلق کو اعتدال و ضبط میں رکھ سکے۔ اس حوالے سے وہ حلال و حرام، ضروری و غیر ضروری اور مناسب و نامناسب کا فرق جان سکے۔

مذکورہ باتوں کو توحید، فقہ، تصوف، آدابِ شرعیہ یا زھد و ورع وغیرہ کا نام دے دیا جائے یا کچھ اور کیوں کہ یہ تو جدید اصطلاحات ہیں۔ ہم ان اصطلاحات کی بنا پر اللہ کی عبادت نہیں

کرتے بلکہ ہمارے لیے اہمیت تو مضمون کی ہے اور جب اصطلاحات مضامین و مسمیات کی وضاحت کریں تو اسماء وعنوانات استعمال کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔

بہر حال علم کی اتنی مقدار تو لازمی ہونی چاہیے کہ ہر مسلمان مرد و عورت تعلیم گاہوں میں پڑھ کر یا مساجد میں وعظ و تلقین سن کر یا دیگر ذرائع ابلاغ سے استفادہ کر کے اسے سیکھ سکے۔

ہر وہ مملکت جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتی ہو۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اہل وطن کے لیے کم از کم علم کی مذکورہ بالا مقدار کے حصول کے تمام ممکن ذرائع فراہم کرے اور یہ مواقع فراہم کرے کہ اہل وطن یہ شعور حاصل کر سکیں کہ ان پر کیا فرض عاید ہوتا ہے اور وہ کیا خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔

والدین اور سرپرستوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد اور زیر سرپرستی بچوں کو تعلیم دلوائیں۔ انھیں مدارس و مساجد یا ایسی جگہوں پر بھیجیں جہاں وہ ضروری علم حاصل کر سکیں۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ ایک زیر سرپرستی بچہ تعلیم کی خواہش کا اظہار کرے اور اس کا سرپرست اسے منع کر دے۔ سرپرست کے لیے تو یہ بھی جائز نہیں کہ وہ اس بچے کو دین کی تعلیم سے بے بہرہ رکھے اور اسے تعلیم نہ دے یا ایسے شخص کا اہتمام نہ کرے جو اس بچے کو تعلیم دے۔

حدیث شریف میں اسی بات کو بیان کیا گیا ہے:

مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ لِسَبْعٍ وَ اضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا لِعَشْرٍ [۴]

"اپنی اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس سال کی عمر میں (نماز نہ پڑھیں تو) انھیں پیٹو۔"

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب بچے عمر کے سات برس پورے کر لیں تو نماز سیکھنا اور جو طاقت رکھتے ہوں ان کے لیے روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے کیوں کہ نماز کی ادائیگی اس کے شرائط و ارکان اور کیفیت کا علم سیکھے بغیر ممکن نہیں۔ اور جس چیز کے بغیر کوئی واجب مکمل نہ ہوتا ہو وہ چیز بھی واجب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نماز واجب ہے تو اس کا علم بھی واجب ہوا۔

۴- احمد نے مسند اور ابوداؤد نے سنن میں حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کیا ہے۔ امام نووی نے "الریاض" میں حسن اور احمد شاکر نے مسند کی تخریج نمبر ۶۶۸۹ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حاکم نے بھی مستدرک ۱/ ۱۹۷ میں روایت کیا ہے۔

اگر کوئی باپ اپنی اولاد یا کوئی سرپرست اپنے زیر نگرانی بچے کو تعلیم دلانے سے قاصر ہو تو جب یہ بچہ جوان و بالغ ہو جائے اور خود جوابدہی کے لائق ہو جائے تو علم کا حصول اس پر فرض ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ بچے کو جواب دہی اور ادائیگی فرض کے اعتبار سے اس وقت تک معافی ہے جب تک وہ جوان نہیں ہو جاتا۔

امام ابن حزم نے یہ ذکر کرنے کے بعد کہ ایک مسلمان کو طہارت، نماز، روزہ، اکل و شرب میں حرام و حلال، لباس، مسائل فروج، دماء اور اقوال و اعمال میں سے کیا سیکھنا ضروری ہے۔ فرمایا: ان تمام چیزوں سے کسی ایک بھی مسلمان مرد و عورت یا آزاد و غلام کو لاعلم نہیں رہنا چاہیے۔ ان پر فرض ہے کہ اگر وہ مسلمان ہیں اور بچپن میں علم حاصل نہیں کر سکے تو جوان ہونے پر کریں۔ یا وہ غیر مسلم تھے تو مسلمان ہونے اور جوان ہونے پر علم حاصل کریں......

امام ابن حزم کہتے ہیں:

''سربراہِ مملکت عورتوں اور غلاموں میں پڑھے لکھے افراد کو مذکورہ لوگوں کی تعلیم پر مامور کرے۔ وہ انھیں براہِ راست تعلیم دلائے یا کسی استاد تک پہنچ کر تعلیم حاصل کرنے کی انھیں اجازت دے۔ ہر صورت میں تعلیم کا اہتمام ضروری ہے۔ سربراہ پر یہ فرض ہے کہ وہ اس بارے میں لوگوں کا مؤاخذہ کرے۔ اور کچھ لوگوں کو ناخواندہ لوگوں کو تعلیم دینے پر تنخواہ و معاوضہ دے۔''(۵)

علم کی یہ مقدار، ضروری ہے کہ مسلمان اپنی اس زبان میں سیکھے جسے وہ اچھی طرح جانتا ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کم از کم اس قدر سیکھ لے کہ نماز میں سورۃ فاتحہ اور دیگر آیات کی تلاوت کر سکے۔ نماز کی تکبیرات، تسبیحات اور سلام کے الفاظ سیکھ لے اور ایسے ہی اذان و اقامت کا مفہوم بھی سمجھ سیکھ لے اگر کسی شہر یا بستی میں اتنے تھوڑے سے لازمی علم کا حصول بھی ممکن نہ ہو تو آدمی پر واجب ہے کہ وہ اس علم کے حصول کے لیے سفر کرے خواہ اسے چین ہی جانا پڑے۔

۵۔ دیکھیے: الاحکام لاصول الاحکام لابن حزم، باب الحادی والثلاثون: فی صفۃ التفقہ فی الدین، وما یلزم کل امرئ ہو طلبہ من دینہ ص ۶۹۔ مطبوعہ۔ مطبعۃ الامام بالقاہرۃ

علم کی یہ تو وہ کم از کم مقدار ہے جس کا ہر حال و کیفیت میں حاصل کرنا مسلمان پر فرض ہے۔ پھر اس کے بعد حالات واسباب کے خاص و عام ہونے کے اعتبار سے اس کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ایک تنگ دست آدمی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ زکوٰۃ کے احکام سیکھے مگر یہ علم حاصل کرنا ضروری ہے کہ اس کے لیے زکوٰۃ کے مال سے کس قدر مال لینا جائز ہے۔ زکوٰۃ کے مسائل واحکام کا علم حاصل کرنا تو اس وقت واجب ہوگا جب وہ اتنے مال کا مالک ہو جائے جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

اگر وہ صاحبِ حیثیت ہو گیا ہے تو تب بھی اس کے لیے زکوٰۃ کے تمام احوال کے تمام احکام سیکھنا فرض نہیں بلکہ صرف اسی قدر علم ہونا چاہیے جس قدر مال کا وہ مالک ہے۔ ایک تاجر تجارت، کرنسی، قرض وغیرہ کی زکوٰۃ کے احکام سیکھے گا کہ کس مال میں زکوٰۃ واجب ہے، کب واجب ہوگی، کتنی واجب ہوگی، کس کے لیے واجب ہوگی۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جانوروں میں سے اونٹ، گائے، بکری کی زکوٰۃ کا علم حاصل کرے کہ کتنے اونٹوں پر بنتِ مخاض یا بنت لبون دی جائے۔ ان چیزوں کی اسے تو ضرورت ہی نہیں ہے۔

جس شخص کے پاس اتنا مال و متاع نہیں کہ وہ حج کر سکے تو اس پر حج کے احکام و مسائل سیکھنا فرض نہیں بلکہ یہ تو وہ شخص سیکھے گا جو جسمانی صحت و مالی مقدرت کا مالک ہو گیا ہو کہ آنے جانے اور ارضِ مقدسہ میں ٹھہرنے کے اخراجات اور واپسی تک اپنے اہل وعیال کے اخراجات برداشت کر سکتا ہو تب یہ شخص حج وعمرہ کی بنیادی باتیں سیکھے گا۔ خصوصاً اس وقت جب نیت باندھی جاتی ہے اور حج کے مہینوں میں داخل ہوا جاتا ہے۔ مذاہب فقہیہ میں کچھ لوگوں کے نزدیک تو حج کی ادائیگی خوشحالی کے وقت فرض ہے جب کہ اکثر فوری ادا کرنے کے قائل ہیں۔ احتیاط اسی میں ہے کہ نیکیوں کی طرف مبادرت ومسارعت ہی کی جائے۔

معلوم ہوا کہ جو شخص جس چیز سے متعلق ہے اسے اس کے احکام کا علم حاصل کرنا چاہیے ایک تاجر کو تجارت کی حلال وحرام صورتوں اور معاملات و مداینات [لین دین] کی قسموں کا علم ہونا چاہیے کیوں کہ انھی راستوں سے تجارت میں داخل ہوا جاتا ہے۔ یہ علم اس لیے ضروری ہے کہ کہیں وہ حرام کے گڑھے میں نہ گر پڑے اور اسے معلوم بھی نہ ہو۔ اس کی لاعلمی تو عذر نہیں بنے گی۔

ڈاکٹر (جسمانی معالج) کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے مشن و ڈیوٹی سے متعلق علم حاصل کرے۔ مثلاً اسے علم ہونا چاہیے کہ نشہ آور اشیاء سے علاج حرام ہے۔ اسقاطِ حمل حرام ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر شخص کو اس چیز کا علم حاصل کرنا چاہیے جس کا مطالبہ اس کا پیشہ کرتا ہے۔ مثلاً جہاز کے کپتان، طیارے کے پائلٹ اور فلائیٹ کے میزبان عملہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سفر و رخصت کے کیا احکام ہیں۔

مختصر یہ کہ ہر انسان کے لیے اس چیز کا علم حاصل کرنا لازمی ہے جو اس سے مخصوص و متعلق ہے۔ جس چیز سے اس کا تعلق نہیں اس کا علم حاصل کرنا بھی فرض نہیں۔ جس طرح کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کی عبادت و معاملات میں ایسے واقعات پیش نہ آتے ہوں جو اس کے لیے نئے نہ ہوں اور وہ ان کا شرعی حکم جانتا ہو۔ اب یہاں تو ضروری ہے کہ وہ ان مسائل سے متعلق احکام دریافت کرے بلکہ اس کے لیے زیادہ بہتر و مناسب تو یہی ہے کہ وہ اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد جس قدر جلدی ہو سکے اس کے احکام کا علم حاصل کرے۔ (۶)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَسْئَلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. [النحل: ۴۳]

''اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔''

پس ہر آدمی پر اس قدر علم کا حصول فرض ہے جو اس کے لیے لازمی ہے۔

یہ تو وہ چیزیں تھیں جو ایک مسلمان کے دین کا لازمی حصہ ہیں اور ان کا علم حاصل کرنا اس کے اوپر فرضِ عین ہے۔ اب رہی اس کی دنیا کے لحاظ سے ضروری و لازمی چیزوں کی بات تو وہ ماحول و زمانہ کے مختلف ہونے کے ساتھ مختلف ہوتی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک ہر مسلمان کے لیے کم از کم اتنی تعلیم ضروری ہے جو موجودہ دور میں ابتدائی مرحلہ میں سکھائی جانے والی کتابت و قرأت اور حساب وغیرہ پر مشتمل ہے۔ تاکہ وہ سوسائٹی کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکے اور امت مسلمہ ترقی یافتہ و تعلیم یافتہ قوموں کے مقابلے میں پسماندہ و ناخواندہ نہ رہے۔

۶۔ دیکھیے: احیاء علوم الدین للغزالی اور الاحکام لابن حزم

کس علم کا حصول فرضِ کفایہ ہے؟

کچھ علوم ایسے ہیں جن کا حصول جماعت پر فرضِ کفایہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایک آدمی یا چند آدمی یہ فریضہ انجام دے دیں تو باقی جماعت گناہ سے بچ جاتی ہے۔ ورنہ جماعت عام طور پر اور اولوالامر خاص طور پر گناہ گار ٹھہرتے ہیں۔

امام ابن حزم کہتے ہیں:

ایسا گروہ یا جماعت جو کسی بستی، شہر، گاؤں یا ڈیرہ میں اجتماعی زندگی گزار رہے ہوں ان پر فرض ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ دین کے اول سے لے کر آخر تک تمام احکام کا علم حاصل کرنے، قرآنِ حکیم کو مکمل طور پر سیکھنے، نبی کریم ﷺ سے مروی تمام احادیثِ احکام کو الفاظ کی نصوص کے ساتھ اول سے آخر تک ضبط تحریر میں لانے اور جن باتوں پر مسلمانوں کا اجماع یا اختلاف ہے انھیں سینۂ قرطاس پر محفوظ کرنے کے لیے نکلیں اور لوگوں کو قرآن، حدیث اور اجماع وغیرہ کی تعلیم و تفہیم دیں خواہ یہ لوگ کم ہوں یا زیادہ۔

مطلب یہ ہے کہ امام ابن حزم نے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے ان تمام کا علم حاصل کرنا فرض ہے خواہ طالب علم کی محنت و جہد ان سب کا احاطہ نہ کر سکے۔ ابن حزم نے اپنے اس موقف کا استدلال اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کیا ہے:

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. [التوبہ:۱۲۲]

”مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔“

یعنی تفقہ فی الدین حاصل کرنے اور قوم کو عذاب الٰہی سے ڈرانے کے لیے نکلنا پوری جماعت پر فرض ہے تا آنکہ کچھ لوگ یہ فریضہ ادا کر دیں تو دوسروں پر سے یہ ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ پھر امام ابن حزم کہتے ہیں: تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہر شہر، گاؤں یا بستی میں ایک ایسا شخص ہو جو قرآن کو مکمل حفظ کرے پھر لوگوں کو سکھائے پڑھائے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے

اس کے پڑھانے کا حکم دیا ہے۔(۷)

بظاہر یہاں فرضِ کفایہ سے مراد وہ تمام علوم ہیں جن کی ضرورت واحتیاج ایک مسلمان جماعت کو اپنے دین اور دنیا کے معاملے میں درپیش ہو کہ وہ علوم شرع میں تبحر اور علوم طبعی میں تخصص پیدا کریں۔ یعنی وہ تمام علوم جو موجودہ دور میں شہری وعسکری اعتبار سے اجتماعی انسانی زندگی کی ضرورت ہوں۔ مثلاً میڈیکل، انجینئرنگ، میتھ میٹکس، فلکیات، کیمیا، طبیعات، بیالوجی اور زوالوجی وغیرہ بلکہ ہر اس علم کا حاصل کرنا ان پر فرضِ کفایہ ہے جس کی ان کو ضرورت ہو کہ اس کے بل پر وہ دوسروں پر برتری اور قوت حاصل کرسکیں۔ اگر اس میں کوتاہی کریں گے تو ساری امت نقصان اٹھائے گی اور گناہ گار بھی ٹھہرے گی۔ اس شخص پر تو فرض کفایہ خصوصاً عاید ہو جاتا ہے جسے کوئی ذمہ دارِ حکومت اس بات کی دعوت دے کہ وہ فلاں علمی کام سرانجام دے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس علمی اہلیت وصلاحیت کا وہی مالک ہو اس کے علاوہ کوئی اور یہ علم نہ جانتا ہو یا یہ علم وفن اسی کی دریافت ہو اور اسے یہ کام کرنے میں کوئی عذر مانع ہو نہ کوئی رکاوٹ حائل ہو۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو امت کے ضعف وتنزل کا باعث ہو اس کے وقوع سے پہلے پہلے اس کا سدباب فرض ہے، اور ہر وہ چیز جو امت کی قوت واستحکام اور اندرونی وبیرونی خطرات سے حفاظت کا ذریعہ بنے، متحد ہو کر اس کو حاصل کرنا فرض ہے، کیوں کہ جس چیز کے بغیر کوئی فرض پورا نہ ہوتا ہو وہ چیز بھی فرض ہو جاتی ہے۔

امام غزالیؒ ''فرضِ کفایہ علم'' کے بیان میں کہتے ہیں:

''جان لیجیے کہ فرض اور غیر فرض کا امتیاز علوم کی اقسام بیان کیے بغیر نہیں ہوسکتا۔ وہ علوم جن کا تعلق زیر بحث مقصد سے ہے وہ شرعی اور غیر شرعی اقسام میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ شرعی سے مراد وہ علوم ہیں جو انبیاء علیہم الصلوٰت والسلام سے حاصل ہوں، ان علوم میں عقل اس طرح رہنمائی نہیں کرتی جس طرح حساب میں کرتی ہے، جس طرح تجربہ طب میں رہنما ہوتا ہے اور سماعت زبان سیکھنے میں مددگار ہوتی ہے۔ وہ علوم جو شرعی نہیں ہیں وہ قابل تعریف، قابل مذمت اور مباح میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ قابل تعریف علوم وہ ہیں جن کے ساتھ امورِ دنیا کے مصالح

۷۔ الاحکام لابن حزم صفحہ ۲۹۰-۲۹۱

وابستہ ہیں جس طرح طب اور حساب ہیں۔ ان علوم میں سے کچھ فرضِ کفایہ، کچھ فضیلت و اعزاز کے درجے میں ہیں اور کچھ فرضیت کے زمرے سے باہر ہیں۔

فرضِ کفایہ ہر وہ علم ہے جس کے بغیر امورِ دنیا کی انجام دہی سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا، جیسے طب بدن کی حفاظت کے لیے ضروری ہے اور حساب معاملات اور تقسیمِ وصایا و میراث وغیرہ میں ضروری ہے، اگر کوئی جگہ ان علوم کے جاننے والے سے خالی ہو تو وہاں کے لوگ گنہگار ہوں گے۔ اور اگر ایک آدمی بھی یہ کام انجام دے رہا ہو تو کافی ہے اور دوسروں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے لہٰذا ہمارا یہ کہنا باعث حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ: طب و حساب فرضِ کفایہ میں سے ہیں۔ اور اُصولِ صنعت و حرفت بھی فرضِ کفایہ میں شامل ہیں، جیسے زراعت، کپڑا وغیرہ بننا، سیاست کرنا بلکہ پچھنے لگانا اور سلائی کرنا بھی فرضِ کفایہ میں شامل ہیں۔ اگر کسی جگہ پر حجام (پچھنے لگانے والا) نہیں ہے تو وہاں کے لوگوں پر جلد ہلاکت آ پڑے گی اور اگر وہ ایسے ہی اپنے آپ کو اس ہلاکت میں ڈال دیں گے تو گناہ گار ہوں گے۔ کیوں کہ جس ذات نے بیماری اتاری ہے اس نے دوا بھی اتاری ہے۔ اور اس کا طریقۂ استعمال بھی انسان کو ودیعت کر دیا ہے۔ اس نے یہ اسباب تو اس بیماری کے خاتمہ کے لیے بنائے ہیں۔ لہٰذا اس ہلاکت و آفت سے بے پروائی اختیار کر کے ہلاکت میں پڑ جانا جائز نہیں ہے۔ اور وہ علوم جو فضیلت و اعزاز کے زمرے میں آتے ہیں، فرض نہیں ہیں یہ حساب کے دقائق اور طب کے حقائق میں گہرائی تک پہنچنا ہے، اس کے علاوہ ان چیزوں کا علم بھی اس زمرہ میں شامل ہے جن کے بغیر کام چل سکتا ہے لیکن اس کی ضرورت سے زاید مہارت حاصل کر لینا فائدہ مند ہے۔

قابل مذمت علوم میں جادوگری و طلسمات اور شعبدہ بازی و تلبیسات شامل ہیں۔ اور مباح میں ایسے اشعار کا علم جن میں لامعقولیت و بے ہودگی نہ ہو اور تواریخ و اخبار جیسی چیزیں شامل ہیں۔''(۸)

امام غزالیؒ نے اوپر جو کچھ ذکر کیا اس میں کچھ چیزیں محلِ نظر ہیں، آج علوم کے حدود کی وسعت اور ان علوم میں ہر ایک کی مختلف شاخوں میں تقسیم، پھر ان شاخوں کا مزید چھوٹے چھوٹے تحقیق

۸- احیاء علوم الدین جلد ا صفحہ ۱۶

دائروں میں تقسیم ہونا، اس چیز کے خلاف ہے جس کو امام غزالی نے طب کے حقائق اور حساب کے دقائق میں گہرائی تک پہنچنا کہا ہے اور اسے فرضیت نہیں فضیلت شمار کیا ہے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں گہرا عبور ہر کامیاب طب اور حساب کے لیے لازمی ہے۔ اب تو علمِ طب نہایت ترقی کر گیا ہے اور وہ علوم جو اس شعبہ کے خدمتگار و مددگار ہیں وہ تو انتہا درجے کی بلندی تک پہنچ چکے ہیں۔ یہی حال علمِ ریاضیات کا ہے اور یہی کیفیت ان علوم طبیعی کی ہے جن کا ذکر خود امام غزالی نے ایک دوسرے مقام پر کیا ہے کہ ان کی کوئی ضرورت نہیں جب کہ طب کے وہ قائل ہیں کیوں کہ یہ ان کی ضرورت تھی۔

بسا اوقات امام غزالیؒ اپنے وقت کے علوم و ریاضیات سے متعلق جو کچھ کہتے ہیں اس میں معذور ہوتے ہیں، دراصل یہ فلسفہ کا دور تھا، اور امام غزالی کا اس فلسفہ اور اس کے مسائل کے بارے میں اپنا ایک نظر ہے جو ان کی کتاب ''تہافت الفلاسفۃ'' کی صورت میں موجود ہے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی شخص فلسفہ کو سائنسی و ریاضی پہلو سے پڑھے اور اس سے اثر، الٰہی پہلو سے لے، جیسا کہ انھوں نے اس بات کی طرف اپنی کتاب ''المنقذ من الضلال'' میں اشارہ کیا ہے، اس فلسفہ میں الٰہی پہلو یونانی بت پرستی اور اس انسانی عقل کی شطحات سے خلط ملط ہو گیا تھا جس کی حقیقت وحی معصوم کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔

اسی طرح ان اشعار کا علم جن میں کوئی لامعقولیت و بے ہودگی نہ ہو اور تواریخ و اخبار وغیرہ کو مباح کی قسم میں شمار کیا ہے۔ میرے نزدیک عربی شعر و ادب کا علم عام چیز ہے جب کہ اسلامی تاریخ کا علم بالخصوص اور انسانی تاریخ کا بالعموم فرائض کفایہ میں شامل ہے۔ کوئی مسلمان جماعت ایسے فرد سے خالی نہ ہو جو اِن علوم کو بہترین طریقے سے جانتا ہو اور کما حقہ ان پر توجہ دیتا ہو، اور اس شخص کا منہ توڑ جواب دے سکتا ہو جو اِن علوم کو غلط راستے میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم دائیں بازو اور بائیں بازو کے لوگوں میں دیکھتے ہیں۔ یہ ادب تو ایک مسلمان داعی کے لیے ثقافتی ہتھیار ہے۔(۹)

میرے نزدیک تو ایک اسلامی جماعت پر یہ فرض ہے کہ اس میں کوئی ایسا شخص موجود ہو جو

۹۔ دیکھیے: ہماری کتاب: ثقافۃ الداعیۃ، فصول: الثقافۃ اللغویۃ والادبیۃ والتاریخیۃ والانسانیۃ

مختلف انسانی مطالعات وعلوم کی تمام اقسام (انفرادی واجتماعی، تربیتی واقتصادی اور سیاسی وغیر سیاسی وغیرہ) میں تخصص (Specialisation) حاصل کرے۔ تاکہ اسلامی بنیادوں پر انھیں پڑھا اور پیش کر سکے۔ کیوں کہ یہی انسانی واجتماعی علوم ہیں جو امت کی فکر اور اس کے ذوق کی سمت متعین کرتے ہیں۔ اور افرادِ امت کے کردار کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ ان علوم کے حصول کو صرف مباح خیال کر لینا درست نہیں ہے کہ ان کا حاصل کرنا یا نہ کرنا جائز ہے بلکہ یہ ان کفایہ فرائض میں سے ہیں جن کا کرنا عین فرض ہے۔

امام غزالیؒ اگر موجودہ دور میں ان علوم کے خطرات کو دیکھ لیتے کہ کس طرح نوجوان نسل کے ذہنوں پر ان کا تسلط ہے۔ اور مغرب کی جامعات اور تحقیقی مراکز پر یہودیوں نے کس قدر غلبہ حاصل کر رکھا ہے تو ان کی رائے اور اجتہاد اسی فیصلہ پر پہنچتا جس پر ہم پہنچے ہیں۔ کیوں کہ ہر زمانے کے حالات مختلف اور مخصوص ہوتے ہیں اور ان کے احکام بھی مختلف ہی ہوتے ہیں۔

نیت کو درست رکھنا

سب سے پہلی چیز جس کی ایک طالب علم سے امید رکھنی چاہیے، خصوصاً اس طالب علم سے جو علوم شرعیہ کی تحصیل میں مشغول ہو، وہ یہ ہے کہ اس کی نیت میں کسی قسم کا فساد نہیں ہونا چاہیے۔ تصحیح نیت سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو علم کے لیے وقف اور خالص کر لے۔ اور اس علم کا مقصد اللہ کی خوشنودی اور دارِ آخرت کا حصول ہو۔ وہ یہ ارادہ ونیت نہ رکھے کہ علماء سے مقابلہ بازی کرے گا، بے وقوفوں سے مناظرہ بازی کرے گا، مالداروں سے دولت بٹورے گا اور حکمرانوں کی حاشیہ برداری کرے گا۔ یا مال ودولت سمیٹے گا یا عزت وجاہ جیسی کسی اور دنیاوی چیز کو حاصل کرے گا۔ یہ تو عامۃ الناس کے رویے ہیں کہ ناپائیدار کے بدلے پائیدار فروخت کر دیتے ہیں، حقیر کے عوض عظیم شے اور انتہائی کم قیمت پر بڑی بڑی ملکیتیں بیچ ڈالتے ہیں اگر علماء بھی یہی روش اپنالیں گے تو عامۃ الناس اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا۔

علوم دنیا کے حصول کی خواہش میں اس مفاد پرستی کو جائز ٹھہرانا چاہیں تو ٹھہرالیں، علومِ آخرت کی طلب میں تو اس طرح کی خود غرضی کا کوئی وجود نہیں۔ ان علوم کے حصول میں تو سب سے پہلے نیت کی پاکیزگی وصفائی اور اللہ کے ساتھ مکمل دلی لگاؤ انتہائی ضروری ہے۔

صحیح احادیث میں ان تین آدمیوں کے لیے سخت وعید آئی ہے جن کے اعمال کو ریا کاری نے برباد کر کے رکھ دیا اور انھیں مخلصین صادقین کی صف سے نکال کر جھوٹے ریا کاروں کے زمرے میں لا کھڑا کیا۔ یہی وہ لوگ ہوں گے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جہنم کو انھی کے ایندھن سے دہکایا جائے گا۔

اِن لوگوں میں سے ایک وہ آدمی ہے جس نے علم سیکھا، اور اسے دوسروں کو سکھایا اور قرآن پڑھا۔ (قیامت کے دن) اسے لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتیں جتلائے گا تو وہ ان کا اعتراف کرے گا، اللہ تعالیٰ پوچھے گا: تُو نے ان کے حوالے سے کیا عمل کیا؟

وہ جواب دے گا: میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا اور تیری رضا کی خاطر قرآن پڑھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جھوٹ بولتا ہے، علم تُو نے اس لیے سیکھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور قرآن کی قرأت اس لیے کیا کرتا تھا کہ لوگ تجھے قاری کہیں۔" پھر اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔[۱۰]

حضرت جابرؓ سے روایت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِتُبَاهُوْا بِهِ الْعُلَمَاءَ وَلَا لِتُمَارُوا بِهِ السُّفَهَاءَ وَلَا تَخَيَّرُوْا بِهِ الْمَجَالِسَ، فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَالنَّارُ النَّارُ"[۱۱]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "علم اِس لیے حاصل نہ کرو کہ علماء پر برتری پاؤ گے یا

۱۰- مسلم اور دیگر نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔

۱۱- منذری کہتے ہیں: ابن ماجہ اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ ان سب نے یحییٰ بن ایوب غافقی عن ابن جریج عن ابی الزبیر عنہ کے طریق سے روایت کیا ہے۔ یہ یحییٰ بن ایوب ثقہ ہیں، بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر نے بھی انھیں قابل حجت مانا ہے۔ لہٰذا اسے نظر انداز کرنا چاہیے جس نے ان سے شاذ روایات لی ہیں۔ ابن ماجہ نے حدیث حذیفہ سے ایسی ہی روایت لی ہے۔ دیکھیے: ترغیب حدیث ۱۷۹۔ عراقی احیاء کی تخریج میں لکھتے ہیں کہ ابن ماجہ کی سند صحیح ہے۔ بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے: اس کی اسناد کے تمام رجال ثقہ ہیں۔ (حدیث ۲۵۴ ابن ماجہ) اسے حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے لیکن ذہبی نے اس پر کلام نہیں کیا۔ (۱/۸۵، ۸۶)

بے وقوفوں سے مناظرہ بازی کرو گے اور علم اس لیے بھی حاصل نہ کرو کہ مجلس میں ممتاز مقام پر بیٹھو گے، جو ایسا کرے گا، اس کے لیے آگ ہے، آگ ہے۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں:

أَنَّهُ قَالَ: "كَيْفَ بِكُمْ إِذَا لَبِسَتْكُمْ فِتْنَةٌ يَرْبُوا فِيهَا الصَّغِيرُ وَ يَهْرَمُ فِيهَا الْكَبِيرُ وَتُتَّخَذُ سُنَّةً فَإِنْ غُيِّرَتْ يَوْمًا قِيلَ هٰذَا مُنْكَرٌ! قِيلَ: وَمَتٰى ذٰلِكَ؟ قَالَ: إِذَا قَلَّتْ أُمَنَاءُكُمْ وَكَثُرَتْ أُمَرَاءُكُمْ وَ قَلَّتْ فُقَهَاءُكُمْ وَكَثُرَتْ قُرَّاءُكُمْ وَ تُفُقِّهَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ وَالتُمِسَتِ الدُّنْيَا بِعَمَلِ الْآخِرَةِ"(۱۲)

"آپؐ نے فرمایا: اس وقت تمھارا کیا حال ہوگا جب تم ایسے فتنے میں مبتلا ہو جاؤ گے جو چھوٹے کو بڑا اور بڑے کو بوڑھا کر دے گا۔ اور اس فتنے ہی کو سنت سمجھا جانے لگے گا۔ اور تم اگر اس کو بدل دو تو لوگ کہنے لگیں کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔ عرض کیا گیا کہ ایسا کب ہوگا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: جب دیانت دار کم اور حکمران زیادہ ہو جائیں گے، جب فقہا کم اور قراء (محض پڑھنے والے) زیادہ ہو جائیں گے، جب غیر دینی مقاصد کے لیے علم حاصل کیا جانے لگے گا اور آخرت والے عمل سے دنیا طلب کی جانے لگی گی۔"

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا، مِمَّا يُبْتَغٰى بِهِ وَجْهُ اللّٰهِ تَعَالٰى، لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيْبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا، لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ(۱۳)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس علم کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و

۱۲- عبدالرزاق نے اسے اپنی کتاب میں موقوف روایت کیا ہے۔ دیکھیے: ترغیب، ۱۸۵

۱۳- منذری نے کہا ہے (ترغیب: ۱۷۷) اس حدیث کو ابن ماجہ و ابن حبان اور حاکم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ حاکم نے کہا ہے کہ بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق یہ حدیث صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ذہبی نے بھی ان کی موافقت کی ہے (المستدرک ج۱/۸۵)

رضامندی تلاش کی جاتی ہے اگر کوئی شخص اس علم کو محض حصولِ متاعِ دنیا کی خاطر حاصل کرتا ہے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو تک نہیں پائے گا۔''

غور کیجیے۔ اگر ایک مسلمان ومؤمن جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہتا ہے تو اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہوسکتا ہے حالانکہ یہی خوشبو دور دور سے محسوس ہوگی۔

حدیث کے مفہوم سے واضح ہے کہ یہاں وعید اُس شخص کے لیے ہے جو اس علم کے حصول میں آخرت کا ذرہ بھر ارادہ نہ رکھتا ہو۔ کیوں کہ حدیث کے الفاظ میں تو یہ قطعیت وحتمیت واضح ہے کہ لَا يَتَعَلَّمُهُ اِلَّا لِيُصِيبَ بِهٖ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا 'وہ اس علم کو محض حصولِ دنیا کی خاطر ہی حاصل کرتا ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس نے اپنے علم کے ساتھ فلاحِ اُخروی کی نیت رکھی، اور ساتھ دنیا کا بھی تھوڑا بہت حصول جاری رکھا، اس کے لیے یہ وعید نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی نوعیت بالکل اس حاجی جیسی ہے جو حج کی غرض وارادہ سے جاتا ہے لیکن ساتھ کچھ تجارت بھی کر لیتا ہے۔ بعض صحابۂ کرامؓ نے حج کے ساتھ تجارت کے عمل میں حرج محسوس کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ [البقرہ:۱۹۸]

''اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اِس میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

مسئلہ کی اصل بنیاد جس پر حکم لگانا ہے وہ تو بس یہ ہے کہ حصولِ علم کا بنیادی مقصد دنیا ہے یا آخرت؟ اسی لیے علمائے کرام نے کہا ہے کہ وہ شخص جو اعمالِ آخرت کی خاطر دنیا کماتا ہے تاکہ فارغ ہوکر عبادت میں مصروف ہو اور وہ شخص جو اعمالِ آخرت محض اس بنیاد پر کرتا ہے کہ دنیا حاصل کرے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی صراطِ مستقیم سے پھسل جاتا ہے۔ لہٰذا اس فرق کو نگاہ میں رہنا چاہیے۔[۱۴]

حدیث اس شخص کی مذمت کر رہی ہے جو اپنے علم کے ذریعے دنیا حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو نہ کہ اس شخص کی مذمت جس کے پاس بغیر اس ارادہ ونیت کے دنیا آجائے۔ قرآن نے

۱۴۔ المرقاۃ، شرح المشکاۃ ج۱/۲۳۵

دنیا اور سامانِ دنیا کو ترجیح دینے کے اس عمل کی مذمت کی ہے:

- فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَ اٰثَرَ الْحَیَاۃَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی.
  [النازعات: ۳۷-۳۹]
  ''تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اُس کا ٹھکانا ہوگی۔''
- فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا.
  [النجم: ۲۹]
  ''پس اے نبیؐ! جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے، اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔''
- قرآن نے مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا. [الاسراء: ۱۹] ''اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اُس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اُس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور ہو وہ مؤمن، تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔'' کے مقابلے میں اس شخص کی مذمت کی ہے جو مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَۃَ. [الاسراء: ۱۸] ''جو جلد حاصل ہونے والے دنیاوی فائدوں کی خواہش رکھے۔''

درحقیقت دنیا اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی قابلِ مذمت چیز نہیں۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ لیث بن سعدؒ، ابوحنیفہؒ وغیرہ بڑے بڑے علماء بلکہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ، عثمان بن عفانؓ اور طلحہؓ و زبیرؓ جیسے کبار صحابہ جو عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں، بہت بڑے امیر تھے۔ اس سے آگے نظر دوڑائیں تو حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت داوٗد علیہ السلام و حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے پیغمبر نظر آتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت بھی عطا کی اور حکومت و سلطنت بھی۔ دنیا اس وقت قابلِ مذمت ٹھہرتی ہے جب اسے آخرت کے اعمال اور علم کو ذریعہ بنا کر حاصل کیا جائے۔ اسی لیے تو حدیث میں یہ کہہ کر اس بات کو مقید کر دیا گیا ہے کہ ''عِلْمٌ یُبْتَغٰی بِہٖ وَجْہُ اللّٰہِ تَعَالٰی'' وہ علم جس کے ذریعے خوشنودیِ رب تلاش کی جاتی ہے''۔ وہ علم کونسا ہے جس کے ذریعہ خوشنودیِ رب حاصل ہوتی ہے، یقیناً یہ دین کا علم ہی ہے۔

یہاں محض دنیا کی مذمت نہیں ہے دنیا مذموم کیسے ہوسکتی ہے جب کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ:

نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ (۱۵)

''وہ پاکیزہ مال کیا ہی اچھا ہے جو ایک نیک وصالح آدمی کی ملکیت ہو۔''

دنیا کیسے مذموم ہوسکتی ہے جب کہ یہ تو آخرت کی کھیتی ہے۔ اسی لیے ملا علی قاری نے شرح مشکاۃ میں کہا ہے: حدیث یہ بات واضح کر رہی ہے کہ جس آدمی نے اپنی نیت کو خالص کر کے علم حاصل کیا تو اس کے لیے اپنے اس علم کے ذریعے بغیر نیت کے حصولِ دنیا کوئی نقصان دہ عمل نہیں ہے، بلکہ علم کی حقیقی شان تو یہ ہے کہ دنیا سمٹ کر اس آدمی کے گرد جمع ہو جائے جو علم رکھتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

مَنْ كَانَ هَمُّهُ الآخِرَةُ جَمَعَ اللّٰهُ شَمْلَهُ وَجَعَلَ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهِ وَ تَأْتِيْهِ الدُّنْيَا وَ هِيَ رَاغِمَةٌ (۱۶)

''جو آدمی اپنے علم کے ذریعے اُخروی فلاح چاہتا ہو، اللہ تعالیٰ اس کے منتشر امور کو یکجا کر دیتا ہے اور اس کے دل کو دولتِ تونگری سے بھر دیتا ہے۔ اور دنیا وسامانِ دنیا کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پاس آنا پڑتا ہے۔''

یہ بات تو عام ہے کہ دورِ حاضر کے طلبائے علم کی بہت بڑی تعداد پہلے سے طے شدہ کسی نیت ومقصد اور رغبت والفت کے تحت حصولِ علم کی طرف متوجہ نہیں ہوتی بلکہ ان کو تو بچپن میں ان کے والدین اور سرپرست اس جانب متوجہ کرتے ہیں، خواہ بچے چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں۔ یہ صورتِ حال تمام کلاسوں کی سطح پر بعض مضامین کے انتخاب واختیار میں بھی ہوتی ہے اور تمام کے انتخاب میں بھی۔ یا پھر ان طلبہ کو مخصوص ماحول وحالات اس جانب متوجہ کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شہر میں تدریس کا ایک ہی طریقہ (میڈیم) ہے۔ طلبہ چاہیں یا نہ چاہیں انھیں اسی میڈیم میں تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ پھر ہوتا یوں ہے کہ جب یہ طلبہ باشعور ہو جاتے ہیں تو وہ زیادہ دیر دینی اداروں یا شرعی مدارس میں ٹھہر نہیں سکتے۔ اس سطح پر آ کر انھیں اگر اختیار دیا جائے تو وہ

۱۵- احمد نے اس حدیث کو جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے جیسا کہ عراقی نے الاحیاء کی تخریج میں کہا ہے۔

۱۶- مرقاۃ شرح مشکاۃ ص ۲۲۶۔ ایسی ہی حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے (حدیث ۴۱۰۵) ابن ماجہ نے الزوائد میں کہا ہے کہ اس کی سند صحیح اور رجال ثقہ ہیں۔

اس راہ کا انتخاب قطعاً نہیں کریں گے جس پر انھیں چلایا جا رہا تھا۔ تعلیم کی یہی صورت مقصد و ارادہ کے بغیر ہوتی ہے کیوں کہ اس شخص کو تو مجبور کیا گیا تھا اس کو اختیار کا کوئی حق حاصل نہیں تھا اور نیت تو اختیار پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر اختیار ہی نہ ہوگا تو نیت کا کیا وجود رہ جائے گا۔

ہاں! اگر دین اور علوم شریعت کے حصول کے دوران کسی شخص پر یہ اُصول منکشف ہوتے ہیں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی نیت کو صالح اور رغبت کو صادق کرنے کا عزم جدید کرے کیوں کہ وہ عنقریب اس علم کا کچھ نہ کچھ حصہ تو پا لے گا جس کے سائے میں اس نے زندگی گزارنی ہے۔ یہ علم قرآن وسنت کا علم ہے۔ اس شخص کو اہل خیر کی صحبت سے بھی مستفید ہونا چاہیے کیوں کہ یہ چیز نیت کی تصحیح اور اپنے مقصد کو اللہ کے لیے خالص کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں:

''ہم نے یہ علم حاصل کیا تو اس وقت ہمارے پیش نظر کوئی بڑا مقصد نہیں تھا۔ پھر اللہ نے ہمیں (اپنی خوشنودی حاصل کرنے کا) مقصد عنایت کر دیا۔''(۱۷)

حسنؒ کہتے ہیں:

''بہت سے لوگوں نے اللہ کی رضا اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس کو مقصود بنائے بغیر علم حاصل کیا اور اس علم نے ان کو بتدریج اس مقام پر پہنچا دیا کہ انھوں نے اس کے ذریعے رضائے الٰہی کو مقصود ٹھہرا لیا۔''(۱۸)

ثوریؒ کہتے ہیں:

''ہم نے دنیا کی خاطر علم حاصل کیا لیکن علم نے ہمیں آخرت کی راہ پر ڈال دیا۔''(۱۹)

معمرؒ کہتے ہیں:

''انسان اللہ کے علاوہ کسی اور چیز کو مقصود ٹھہرا کر علم حاصل کرتا ہے تو علم اس کے لیے ایسا ذریعہ بننے سے انکار کر دیتا ہے اور اس شخص کو بھی اللہ کی طرف ہی لے آتا ہے۔''(۲۰)

۱۷- سنن دارمی ج۱/۸۵

۱۸- سنن دارمی ج۱/۸۵

۱۹- جامع بیان العلم ج۲/۲۸

۲۰- جامع بیان العلم ج۲/۲۸

امام غزالی نے اس قول پر حاشیہ لکھا ہے کہ:

''اس بات کا انطباق فقہی اختلافات اور منطقی مناظرہ بازی پر نہیں بلکہ تفسیر وحدیث کے علم پر ہوتا ہے کیوں کہ انھی علوم کا اللہ اور یومِ آخرت سے تعلق ہے اور کلامِ الٰہی وکلامِ نبویؐ میں ہی یہ تاثیر ہے کہ ان کا حاصل کرنے والا اپنے ارادہ ونیت کو خالص کرلے۔ آخرت اور اللہ کی خوشنودی کی امید لگالے۔''(۲۱)

حصولِ علم میں تسلسل

علم ایک متحرک اور بے کنار سمندر ہے۔ اس کا طالب جوں جوں اس کی گہرائی میں جائے گا اس پر ایسے نئے نئے باب کھلتے جائیں گے اور مخفی اسرار ورموز عیاں ہوتے جائیں گے جن پر مزید غور وفکر اور تحقیق وتدقیق کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے ضروری ہے کہ طالب علم مستقلاً علمِ مزید کی خواہش وحرص میں رہے۔ ساری زندگی تحصیل علم جاری رکھے، کیوں کہ علم کو ہمیشہ تجدد ونمو کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اللہ کے اس حکم کے بعد کس چیز کی اہمیت رہ جاتی ہے جو اس نے اپنے رسولؐ کو دیا ہے کہ:

قُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا. [طٰہٰ:۱۱۴]

''اے نبیؐ! دعا کرو کہ اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر۔''

قرآنِ حکیم نے اور رسولِ حلیمؐ نے اللہ کے بندے حضرت خضر علیہ السلام کی خدمت میں حصولِ علم کی خاطر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حاضر ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اسی لیے حضرت قتادہؒ نے فرمایا ہے کہ اگر علم کا کچھ حصہ کسی شخص کے لیے کافی ہوسکتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لائق تھے کہ انھیں ان کا علم کفایت کرتا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خضر سے درخواست کی:

هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا. [الکہف:۶۶]

''کیا میں آپ کی پیروی کرسکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اُس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے۔''

۲۱- احیاء علوم الدین

حصولِ علم میں تسلسل کی اہمیت اس قدر ہے کہ دو اقوالِ حکمت تو تمام مسلمانوں میں عام ہو گئے ہیں:

۱- اُطْلُبُ الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ

''ماں کی گود سے لے کر قبر کی لحد میں پہنچنے تک علم حاصل کرتے رہو۔''

۲- لَا يَزَالُ الْمَرْءُ عَالِمًا مَا طَلَبَ الْعِلْمَ فَإِذَا ظَنَّ أَنَّهُ عَلِمَ فَقَدْ جَهِلَ.

''آدمی اس وقت تک عالم رہتا ہے جب تک حصولِ علم میں لگا رہے۔ جب وہ یہ خیال کر لے کہ اس کے پاس مکمل علم آ گیا ہے تو وہ جاہل ہو جاتا ہے۔''

یہ دونوں مقولے سفیان بن عیینہؒ کے ہیں، حدیث نہیں ہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھ رکھا۔

ابن عباسؓ کا قول ہے:

''دو حریصوں طالب علم اور طالب دنیا کی حرص ختم نہیں ہو سکتی۔''

عبداللہ بن مبارکؒ سے سوال کیا گیا کہ علم کب تک حاصل کرتے رہنا چاہیے؟

انھوں نے فرمایا: ''اگر اللہ چاہے تو مرنے تک علم حاصل کرتے رہو۔''

ابو عمرو بن علاء سے پوچھا گیا کہ آدمی کے لیے کتنا عرصہ علم حاصل کرنا بہتر ہوتا ہے؟

انھوں نے جواب دیا: جب تک اس کی زندگی (صحت) بہتر رہے۔''

سفیان بن عیینہؒ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں سے کس شخص کو علم حاصل کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے؟

انھوں نے جواب دیا: ''جو سب سے بڑا عالم ہو، کیوں کہ اگر اس سے خطا سرزد ہو جائے تو تمام لوگوں کی نسبت اس کے لیے یہ بہت برا عمل ہو گا۔''

مامون سے پوچھا گیا کہ کیا بوڑھے آدمی کے لیے علم حاصل کرنا بہتر ہے؟

انھوں نے جواب میں فرمایا: ''اگر جہالت والاعلمی اس کے لیے عیب اور تکلیف کا باعث ہے تو علم ہی وہ چیز ہے جو اس خوبی کا باعث بنے گا۔''

مالک بن انسؒ فرماتے ہیں:

''جس شخص کے پاس علم ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ علم حاصل کرنا چھوڑ دے۔''

امام مسلم کا بھی یہی مسلک ہے کہ ''آدمی کو زیادہ سے زیادہ علم و معرفت حاصل کرنے کی حرص اور حصولِ علم میں تسلسل قائم رکھنا چاہیے، کسی شخص کا بڑھاپا یا کوئی بڑا مقام مرنے تک اس راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔''

اسلافِ امت کے اشتیاق و رغبتِ علم کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی دن ایسا گزر جاتا جس میں وہ کوئی چھوٹی بڑی علمی بات نہ لکھ پاتے تو اس دن کو اپنی زندگی کا ضائع و بے کار دن خیال کرتے۔

اس بارے میں ایک اثر بھی مروی ہے:

''جب کوئی دن ایسا گزرتا ہے کہ میں علم کی کوئی ایسی بات حاصل نہ کر سکوں جو مجھے اللہ کے قریب کرنے والی ہو تو اس روز کے طلوعِ شمس میں میرے لیے کوئی برکت نہیں ہے۔''

ابن قیم کہتے ہیں کہ اس اثر کا (رسول اللہ ﷺ تک) مرفوع ہونا بھی بیان کیا گیا ہے لیکن اس کا مرفوع ہونا درست نہیں۔ بہر حال اگر یہ اثر کسی ایک تابعیؒ یا صحابیؓ تک بھی پہنچ جاتا ہے تب بھی اس کی اہمیت کافی ہے۔

اس بارے میں کسی کا شعر ہے:

اِذَا مَرَّ بِیْ یَوْمٌ وَلَمْ أَسْتَفِدْ هُدًی
وَلَمْ أَكْتَسِبْ عِلْمًا فَمَا هُوَ مِنْ عُمْرِیْ

''اگر میری زندگی کا کوئی روز ایسا گزر گیا جس میں نہ میں نے ہدایت سے کچھ پایا نہ علم حاصل کیا تو یہ دن میری عمر میں سے نہیں۔''

حضرت علی المرتضیٰؓ نے ایک بار خطبہ ارشاد فرمایا:

''انسان اسی وقت تک اچھا ہوتا ہے جب تک اچھائی سے کام لیتا ہے، ہر آدمی کی قیمت کا اندازہ اس کی بھلائی سے ہو سکتا ہے۔ علم کے بارے میں تبادلۂ خیال کرو تمھیں اپنی حیثیت و وقعت کا علم ہو جائے گا۔''

امام ابن عبدالبر کہتے ہیں: حضرت علیؓ کے اس قول کو کوئی اور نہیں پا سکا۔

علماء کا کہنا ہے کہ حصولِ علم کی ترغیب میں اس سے بڑھ کر کوئی قول نہیں ہو سکتا۔ علماء کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''اگر پہلے لوگوں نے دوسروں کے لیے علمی کارنامہ نہیں چھوڑا'' تو علم اور علماء و متعلمین کے لیے اس سے بڑھ کر نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہے۔

حصولِ علم کی مشکلات پر صبر کرنا

اسلام میں حصولِ علم کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ طالب علم اپنے نفس کو مشقت جھیلنے کا خوگر بنائے، دن کو سخت جہد کے بعد راتوں کو بیداری کا عادی بنے۔ اور حصولِ علم کی خاطر کیے جانے والے سفر کی سختیاں بھی برداشت کرے۔

قرآنِ حکیم اور رسولِ عظیم ﷺ نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا حصولِ علم کی خاطر اللہ کے ایک بندے حضرت خضر علیہ السلام کی طرف جانے کا جو واقعہ بیان کیا ہے یہ کسی طالب علم سے مخفی نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِفَتٰهُ لَا أَبْرَحُ حَتّٰى أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا. [الکہف:٦٠]

''اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ ''میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے نوکر نے کتنا سفر کیا یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ البتہ اس کی طوالت کے آثار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے معلوم ہوتے ہیں جو انھوں نے اپنے نوکر سے کہا: آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا. (الکہف:٦٢) ''لاؤ ہمارا ناشتہ، آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں۔''

اور وہ مسافت الگ ہے جو انھوں نے اپنے مطلوبہ مقام سے آگے نکل جانے کے باعث واپس دوبارہ طے کی۔

ابن عباس فرماتے ہیں:

میں علم کی جستجو میں نکلا تو اس کا بیشتر حصہ انصار میں پایا۔ میں آدمی کے پاس آتا تو اس کے اہل خانہ سے اس کے بارے میں پوچھتا، جواب ملتا کہ وہ سو رہے ہیں، میں بھی اپنی چادر کا تکیہ بناتا اور لیٹ جاتا حتیٰ کہ ظہر تک انتظار میں رہتا۔ وہ آدمی باہر نکلتا تو پوچھتا: اے رسولؐ کے عم زاد! آپ کتنی دیر سے یہاں منتظر ہیں؟ میں جواب دیتا کہ کافی دیر سے۔ وہ آدمی کہتا: تو نے اچھا

نہیں کیا، مجھے بتایا کیوں نہیں؟ میں کہتا: میں چاہتا تھا کہ آپ میرے پاس آئیں تو اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر آئیں۔"(۲۲)

ابن عباسؓ کا ہی یہ بھی قول ہے:

"میں علم حاصل کرنے کے دوران خوار ہوا لیکن علم پا لینے کے بعد باوقار ہو گیا۔"

ابن عبدالبر وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ ابو ایوب انصاریؓ نے عقبہ بن عامرؓ سے ستر مسلم علی المسلم سے متعلق ایک حدیث سننے کے لیے مدینے سے مصر کا سفر کیا۔ حدیث سن چکے تو اپنی سواری پر سوار ہو کر واپس مدینہ کی جانب چل پڑے اور وہاں قیام بھی نہ کیا۔(۲۳)

جابر بن عبداللہ انصاری کے بارے میں ایسی ہی بات بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے عبداللہ بن انیس سے ایک حدیث حاصل کرنے کی خاطر ایک ماہ کا طویل سفر کیا۔(۲۴)

سعید بن مسیبؒ کا کہنا ہے کہ "میں ایک حدیث کے حصول کی خاطر کئی کئی راتیں اور کئی کئی دن سفر میں رہا ہوں۔"

امام عامر بن شراحبیل شعبی نے ایک آدمی سے حدیث بیان کی پھر اس سے کہا: آپ کو یہ حدیث کوئی مشقت اٹھائے اور مال خرچ کیے بغیر مل رہی ہے اسے لے لو۔ بندہ (خود شعبی) تو حدیث کی خاطر مدینہ کا سفر کیا کرتا تھا۔ (ان دنوں شعبی عراق میں کوفہ شہر میں ہوتے تھے)

شعبی کا ایک قول یہ بھی ہے:

"اگر کوئی شخص حکمت کا ایک جملہ سننے کے لیے شام کے اِس پار سے یمن کے اُس پار تک کا سفر کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سفر ضائع نہیں گیا۔"(۲۵)

۲۲- سنن دارمی ج۱/۱۱۴

۲۳- ابن عبدالبر نے اسے کتاب العلم میں روایت کیا ہے۔

۲۴- امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی صحیح کے باب الخروج فی طلب العلم میں معلق مجزوم بہ روایت کیا ہے، فتح الباری (۱/۱۸۳) میں مذکور ہے کہ امام احمد، ابویعلیٰ اور طبرانی کی مسند الشامیین میں اس حدیث کے اور طرق بھی ہیں لیکن جرح سے خالی نہیں ہیں۔ ان سب کے ہاں اس کے فوائد میں ایک طریق ہے جس کی سند درست ہے۔

۲۵- جامع بیان العلم "باب الرحلة فی طلب العلم"

علم کے حصول میں سفر خصوصاً علمائے حدیث کے حصولِ علم حدیث کی خاطر کیے گئے سفروں کی مثالیں تاریخ میں موجود نہیں۔ جس شخص نے ان ائمہ حدیث مثلاً امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے اسفار کا مطالعہ کیا ہے وہ ان لوگوں کی ان مشکلات سے بخوبی واقف ہوگا جو انھوں نے طلب علم میں اٹھائیں۔ ان لوگوں نے علم کے حصول کی خاطر رات کی نیند اور دن کا سکون تج دیا، اس راہ میں پیش آنے والی تنگی و فقیری کو ماتھے پر شکن ڈالے اور دل میں ملال لائے بغیر برداشت کیا۔ انھوں نے اپنے اساتذہ سے یہ حکیمانہ قول اخذ کر رکھا تھا کہ ''جسم کو سکون پہنچا کر یا آرام میں رکھ کر علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

امام مالکؒ کہا کرتے تھے:

''علم ایسی چیز ہے کہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے حصول کی راہ میں فقیری کا مزہ نہ چکھ لیا جائے۔ امام حصولِ علم کی راہ میں ربیعہ کو پیش آنے والی تنگ دستی کا تذکرہ کرتے کہ انھوں نے علم کی خاطر مکان کی چھت کے بالے تک بیچ ڈالے، حتیٰ کہ خود مدینہ کے کھلیانوں میں گری پڑی کھجوریں اور منقہ کے دانے چن کر کھاتے رہے۔''

شعبہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میری یہ بات اُن تک بھی پہنچا دو جو یہاں نہیں کہ ''جو شخص علم یا حدیث کے حصول میں لگا رہے، اس کی وراثت فقر ہی ہوتا ہے۔''

سحنون کہتے ہیں:

''جو شخص شکم سیر ہو کر کھاتا ہے وہ علم کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ (۲۶)

حصولِ علم میں محض جسمانی مشقت ہی اہم نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت تو مادی دنیا کے شواغل اور معاشرتی زندگی کی مصروفیات سے دل کو فارغ کر لینے کی ہے۔ کیوں کہ ان چیزوں سے تعلقات دل کو انھی کے بارے میں غور و فکر میں مصروف و مشغول رکھتے ہیں۔ اور انسان کے اندر دو دل تو ہوتے نہیں کہ وہ ایک دل سے دنیا اور دوسرے سے علم کے بارے میں سوچتا رہے۔ یہ بات تو اللہ تعالیٰ نے بھی واضح کر دی ہے کہ:

۲۶- یہ تمام آثار ابن عبدالبر نے جامع العلم کے ''باب الحض علی استدامۃ الطلب والصبر علی الاذی والنصب'' میں بیان کیے ہیں۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ. [الاحزاب:۴]

''اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے۔''

انسان کی سوچ جس قدر پراگندہ ہوگی حقائق کے ادراک سے اسی قدر قاصر رہے گی۔ اسی لیے علماء نے کہا ہے: ''علم تجھے اپنا تھوڑا سا حصہ دے گا جب تو اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دے گا۔ اور وہ قلیل مقدار جو تجھے اپنا سب کچھ صرف کر کے حاصل ہوگی وہ بھی خطرات سے خالی نہیں ہے۔''

امام غزالیؒ کہتے ہیں:

''بہت سے امور میں الجھی ہوئی فکر کی مثال اس ندی نالے کی سی ہے جس کا پانی بہت سی جگہوں پر پھیلا ہوا ہے۔ کچھ کو تو زمین جذب کر رہی ہے اور کچھ کو ہوا اُچک کر لے جا رہی ہے۔ جو باقی رہ جاتا ہے وہ اس قدر نہیں ہوتا کہ کھیتی تک پہنچ سکے۔''

یہ تھا اسلافِ اُمتِ مسلمہ کا علم کے بارے میں نظریہ اور یہ تھی حصولِ علم میں صرف ہونے والی ان کی زندگی! انھیں تو علم میں آنکھوں کی ٹھنڈک ملتی تھی۔ کیوں کہ حقیقت کی معرفت کی لذت حصولِ علم کی مشکلات کو بھلا ڈالتی ہے۔ کسی عالم دین سے پوچھا گیا کہ آپ کو کس چیز میں لذت ملتی ہے تو انھوں نے جواب دیا: ایسی حجت و دلیل پیش کرنے اور سننے سے جو پوری شان سے واضح ہو جائے اور ایسے شبہے میں جو وضاحت کے اعتبار سے کمزور ہو کر زائل ہو جائے۔''

طالب علم سے جس قابلِ تحسین صبر کا مطالبہ ہے اس میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ اپنے استاذ کے رویے کو بھی برداشت کرے، اگر استاذ سخت ہے تو اس کی سختی اور اگر غصیلہ ہے تو اس کا غصہ برداشت کرے۔ اگر کسی معاملہ میں استاذ گفتگو کرنے میں خاموش رہتا ہے تو شاگرد اس خاموشی کا احترام کرے۔ اس ضمن میں بہترین مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ جب وہ حصولِ علم کی خاطر حضرت خضر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے:

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا؟ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا. وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا؟ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِىْ لَكَ اَمْرًا. قَالَ فَاِنِ

اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّى أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا.
[الکھف:٦٦-٧٠]

''کیا میں آپ کی پیروی کر سکتا ہوں تا کہ آپ مجھے بھی اُس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟ اُس نے جواب دیا: آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے، اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخر آپ اُس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔ اُس نے کہا: اچھا اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں۔''

صبر کی یہ قسم فقیری اور مشکلات سفر سے بھی سخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طویل سفر کی مشکلات پر تو صبر کر لیا لیکن استاذ کی خاموشی اور رویے پر صبر نہ کر سکے۔ جس کی بنا پر بالآخر خضر علیہ السلام کو کہنا پڑا:

هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَ بَيْنِكَ سَأُنَبِّئُكَ بِتَاوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا. [الکھف:٧٨]

''اُس نے کہا بس میرا تمھارا ساتھ ختم ہوا اَب میں تمھیں اُن باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔''

استاد کا عزت واحترام

سنت نبویؐ میں وارد ہونے والے آدابِ متعلّم میں استاذ کی عزت و توقیر اور اس کے شایانِ شان اعزاز و اِکرام دینا بھی شامل ہے، کیوں کہ استاذ، شاگرد کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے۔ بلکہ یحییٰ بن معاذ کہتے ہیں کہ ''امت محمدیہؐ کے لیے تو علماء ان کے ماں باپ سے زیادہ رحیم ہیں۔ پوچھا گیا کہ کیسے؟ انھوں نے کہا: ماں باپ تو انھیں دنیا کی آگ سے بچاتے ہیں جب کہ علماء انھیں آخرت سے بچانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

بقول امام غزالیؒ: اس طرح اساتذہ کا حق والدین کے حق پر فوقیت رکھتا ہے۔ باپ تو

انسان کے ظاہری وجود کی اس فانی زندگی کا باعث ہوتا ہے جب کہ حقیقی اور باقی رہنے والی زندگی کا باعث استاذ ہوگا۔ اگر استاذ نہ ہوتا تو انسان جو کچھ باپ سے پاتا ہے وہ اسے دائمی ہلاکت میں ڈال دے۔ مزید یہ کہ استاذ ہی اس کی اُخروی زندگی کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔ یعنی ایسا معلّم جو اسے علومِ آخرت سکھاتا اور پڑھاتا ہے یا آخرت کی نیت رکھتے ہوئے دنیاوی علوم کی تعلیم دیتا ہے۔ (۲۷)

باپ کے مقابل استاذ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ایک شاعر کہتا ہے:

هٰذَا مُرَبِّی الرُّوْحِ وَالرُّوْحُ جَوهَرٌ
وَ ذَاکَ مُرَبِّی الجِسْمِ وَالجِسْمُ کَالصَّدَفِ

''استاذ میری روح کا مربی ہے اور روح ہی تو اصل چیز ہے، جب کہ باپ میرے بدن کا مربی ہے اور بدن کی مثال صدف جیسی ہے (کیوں کہ جس کیڑے کے پیٹ میں گوہر بنتا ہے وہ کیڑا صدف کے اندر ہوتا ہے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کی اہمیت وفضیلت واضح ہے)

حضرت حسنؓ کہتے ہیں:

''اگر علماء (اساتذہ) نہ ہوتے تو انسان جانوروں کی طرح ہوتے۔''

مطلب یہ ہے کہ علماء انھیں بہیمیت کی پستی سے اٹھا کر انسانیت کی رفعت پر فائز کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ احادیث میں علماء کی موت کے بعد بھی ان کی عزت وتوقیر کی رغبت و تاکید آئی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے دن نبی کریم ﷺ دو دو شہداء کو اکٹھا کرتے اور پھر پوچھتے کہ ان میں سے قرآن کا زیادہ علم رکھنے والا کون تھا۔ جب ان میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا تو پہلے اسے قبر میں اتارتے۔ یہ قرآن کا زیادہ علم رکھنے والے کی عزت وتوقیر کی جانب اشارہ ہے۔

حضرت ابوموسیٰؓ روایت کرتے ہیں:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللّٰهِ اِكْرَامُ ذِیْ الشَّیْبَةِ

۲۷۔ احیاء علوم الدین ج ۱/ ۵۵

الْمُسْلِمِ وَ حَامِلِ الْقُرْآنِ غَيْرِ الْغَالِي فِيهِ وَلَا الْجَافِي عَنْهُ وَ إِكْرَامُ ذِي السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ(۲۸)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بوڑھے مسلمان اور غلو وغفلت نہ کرنے والے عالم قرآن اور انصاف پسند حکمران کی عزت وتوقیر اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی علامت ہے۔''

حضرت عبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں:

أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَيْسَ مِنْ أُمَّتِي مَنْ لَمْ يُجِلَّ كَبِيرَنَا وَ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَ يَعْرِفْ لِعَالِمِنَا

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص میری امت سے نہیں جو ہمارے بزرگوں (عمر رسیدہ لوگوں) کا احترام اور ہمارے بچوں پر شفقت نہ کرے اور ہمارے عالم کو (اس کا مقام جانتے ہوئے) عزت نہ دے۔''

مناسب ہوگا کہ یہاں اللہ کے نبی، اس کے چنیدہ وبرگزیدہ اوراس سے ہم کلامی کا شرف پانے والے حضرت موسیٰ بن عمران کا قصہ بیان کردیا جائے، حضرت موسیٰ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے ساتھ ہم کلامی اور عنایت رسالت کے لیے چن لیا تھا۔ اور انھیں توراۃ عطا کی تھی جس میں اس زمانے کے مطابق ہر چیز کی تفصیل موجود تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا کہ جو علم خضر علیہ السلام کے پاس ہے وہ آپ کے پاس نہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے ملاقات اور علمی استفادہ کی خاطر مشکلات جھیل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حاضر ہو کر ایک شاگرد کے سے انکسار وتواضع اور ادب واحترام کے ساتھ عرض کیا: هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَى أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا؟ (الکہف: ٦٦) ''کیا میں آپ کی پیروی کرسکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اُس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے۔''

ذرا غور کیجیے! جملہ ہے هَلْ أَتَّبِعُكَ ''کیا میں آپ کا اتباع کرسکتا ہوں؟'' کتنا دوٹوک اور واضح جملہ ہے، اتباع کا ذکر ہے نہ کہ رفاقت ومصاحبت کا مطالبہ وتقاضا۔ کیونکہ کسی

۲۸- ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے: دیکھیے ترغیب ۱۶۵

طلب و اُجرت سے بے نیاز استاذ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی طالب علم کو قبول کرے یا نہ کرے۔اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔

دیکھیے حضرت خضر علیہ السلام کے مقابلے میں حضرت موسیٰ کی تمام تر فضیلت و برتری کے باوجود یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم رسول کی موجودگی میں خضر علیہ السلام کی نبوت پر اختلاف ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت شان کا ذکر قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے یوں کیا ہے:

يَا مُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي[الاعراف:۱۴۴]

''اے موسیٰ علیہ السلام! میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔''

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں انصار میں سے کسی کو ملنے کے لیے آتا تو اس کے اہل خانہ کہتے کہ سو رہے ہیں، اگر آپ کہیں تو اٹھا دیا جائے۔لیکن میں انھیں اٹھانا پسند نہ کرتا اور اس کے باہر آنے تک منتظر رہتا، میں اس کی گفتگو کو پرسکون ماحول میں سننے کے لیے ایسا کرتا۔''(۲۹)

عامر بن شراحیل الشعبیؒ کہتے ہیں:

''حضرت زید بن ثابت نے ایک میت کی نماز جنازہ پڑھائی، فارغ ہوئے تو ان کا خچر قریب کر دیا گیا تاکہ سوار ہو جائیں، ابن عباسؓ نے آ کر ان کے علم وفضل کی تعظیم میں سواری کی لگام تھام لی، انھوں نے کہا: اے ابن عم رسولؐ ایسا نہ کرو! ابن عباسؓ نے کہا: ہم علماء وفضلاء کے ساتھ ایسے ہی مؤدبانہ انداز میں پیش آتے ہیں۔''(۳۰)

امام ابن شہاب زہری کہتے ہیں:

''میں علم کے حصول کی خاطر عروہ بن زبیر کے پاس آتا، اور دروازے پر ہی بیٹھ جاتا۔ میں اندر جا سکتا تھا لیکن ان کی عزت و بزرگی کے پیشِ نظر میں باہر ہی بیٹھا رہتا۔''(۳۱)

۲۹- دارمی ج۱/۱۱۵

۳۰- جامع بیان العلم ج۱/۱۵۵۔عراقی نے الاحیاء کی تخریج میں کہا ہے کہ اسے طبرانی، حاکم اور بیہقی نے ''مدخل'' میں روایت کیا ہے۔حاکم کا کہنا ہے کہ مسلم کی شرط پر اس کی سند صحیح ہے۔

۳۱- دارمی ج۱/۱۱۵

حضرت علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں:

''عالم کا تمھارے اوپر یہ حق ہے کہ تم اس پر سوالات کی بارش کر کے اسے جواب دینے کی مشکلات میں ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ اور جب وہ طبیعت کی ناسازی کے باعث ست ہو تو تم اس سے اصرار نہ کرو۔ جب جا رہا ہو تو اپنا مسئلہ پوچھنے کی خاطر پیچھے سے اس کے کپڑے نہ کھینچتے پھرو۔ اس کی مخفی زندگی کا سراغ نہ لگاتے پھرو۔ اس کے پاس کسی کی غیبت نہ کرو۔ اس کے رازوں کو جاننے کا مطالبہ نہ کرو۔ اگر وہ کہیں خطا کر جائے تو اس کی معذرت قبول کر لی جائے۔ اللہ کی خاطر اس کی عزت و تعظیم کرنا آپ پر واجب ہے۔ جب تک کہ وہ امورِ الٰہی کا پابند و محافظ رہے۔ اس کی طرف پیٹھ کر کے نہ بیٹھو۔ اگر اسے کوئی ضرورت درپیش ہو تو قوم اس کی خدمت گزاری کے لیے سبقت کرے۔''

استاذ کی عزت و تکریم میں یہ بات بھی ہے کہ شاگرد جس طرح اس کے سامنے سوال کرنے میں بہترین طریقہ اختیار کرتا ہے، اسی طرح خاموشی بھی بہترین انداز میں اختیار کرے۔

حسنؓ بن علی اپنے بیٹے سے کہتے ہیں:

''بیٹا! جب تو علماء کی مجلس میں بیٹھا ہو تو خود کچھ کہنے کی بجائے سننے کی حرص زیادہ رکھو۔ جس طرح خاموشی اختیار کرتے وقت اچھا رویہ اپناتے ہو سنتے وقت بھی بہترین تاثر کے ساتھ سنو اور اگر کوئی عالم بات طویل کر دے تو اس کے بات ختم کرنے تک سنتے رہو، اس کی بات کو درمیان میں کاٹ نہ دو۔''

شعبہ کہتے ہیں:

''ہر وہ شخص جس سے میں نے حدیث سنی ہے، میں اس کا غلام ہوں۔''

یہی وہ کلمہ ہے جو اس قدر معروف و مشہور ہوا کہ ضربُ المثل بن گیا یعنی: مَنْ عَلَّمَنِي حَرْفًا صِرْتُ لَهُ عَبْدًا ''جس نے مجھے ایک حرف سکھایا، میں اس کا غلام ہو گیا۔'' یہ تو علماء کی عزت و تکریم کی وہ انتہا ہے جہاں تک دنیا کی کوئی قوم نہیں پہنچ سکی۔ ہمارے اس دور میں کوئی شعر اس قدر مشہور نہیں ہوا جس قدر معلّم کی تکریم میں کہے گئے شوقی بک کے اشعار عام ہوئے ہیں:

قُمْ لِلْمُعَلِّمِ وَفِّهِ التَّبْجِيْلَا كَادَ الْمُعَلِّمُ أَنْ يَكُوْنَ رَسُوْلًا!

اَرَأَیْتَ أَعْظَمَ اَوْ أَجَلَّ مِنَ الَّذِیْ یَبْنِیْ وَ یُنْشِیءُ أَنْفُسًا وَ عُقُوْلًا؟

''معلّم کو پورا احترام دیتے ہوئے اس کی تعظیم میں کھڑے ہو جاؤ۔ (معلّم کی شان تو یہ ہے کہ) قریب تھا کہ معلّم رسول ہوتا۔ آپ کے خیال میں اس شخص سے عظیم الرتبت اور جلیل القدر کوئی ہو سکتا ہے جو عقل و شعور اور جسم و روح کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔''

اچھے انداز میں سوال کرنا

کسی استاد کی یہ عزت نہیں، نہ شاگرد کے با ادب ہونے کی یہ دلیل ہے کہ شاگرد حل طلب مسائل سے متعلق استاد سے سوال ہی نہ کرے کہ اسے حیا آتی ہے، ان شرعی مسائل پوچھنے میں شرم محسوس کرنا کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے جن کا تعلق ایمان سے ہے۔ اور پھر ان کا پوچھنا بھی باعث خیر و برکت ہی ہو۔ یہ تو بڑی کمزوری ہے۔ اسی لیے مجاہد کہتے ہیں: ''وہ شخص علم حاصل نہیں کر سکتا جو شرم اور استاذ کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی سوال ہی نہ پوچھے۔''(۳۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''بہترین عورتیں انصار کی عورتیں ہیں کہ دین کا فہم و فراست حاصل کرنے میں ان کی حیا آڑے نہیں آتی۔''(۳۳)

اُم سلیم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! حق بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ شرماتا نہیں ہے، لہٰذا مجھے بتایئے کہ جب عورت کو خواب میں احتلام ہو جائے تو اس پر غسل واجب ہے؟ (یعنی وہ خواب میں اپنے شوہر سے مجامعت کرے) رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا: اگر وہ پانی (منی) دیکھ لے تو غسل واجب ہے۔''

اس کھلی وضاحت کے باوجود اگر کسی شخص کی مجبوری کی بنا پر حیا اس کے آڑے آتی ہے تو وہ

۳۲- بخاری نے اپنی صحیح میں اس کو معلق روایت کیا ہے۔ دیکھیے: کتاب العلم، باب الحیاء فی العلم، جبکہ ابونعیم نے حلیہ میں صحیح سند کے ساتھ موصول بیان کیا ہے، جیسا کہ فتح الباری ج ۱/ ۲۲۹ میں ہے۔

۳۳- بخاری نے اسے بھی معلق روایت کیا ہے جبکہ مسلم نے موصول روایت کیا ہے دیکھیے: فتح الباری حوالہ مذکورہ بالا۔

اپنے کسی ساتھی کے ذریعے سوال پوچھ لے، جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالب نے کیا تھا جب انھوں نے مذی کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے مسئلہ معلوم کروایا تھا کیوں کہ انھوں نے نبی ﷺ کے داماد ہونے کی بنا پر آپؐ سے براہِ راست مسئلہ پوچھنے میں شرم محسوس کی تو حضرت مقدادؓ اور حضرت عامرؓ کو سوال کرنے کے لیے کہا۔ ان دونوں نے جا کر رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ پوچھا۔(۳۴)

امام ابن شہاب زہری کہتے ہیں:

''علم خزانے اور سوالات ان کی چابیاں ہیں۔'' مطلب یہ کہ علماء کے سینے سے جو چیز علم کو باہر کھینچتی ہے وہ ان سے سوال کرنا ہے۔ اس میں تو خود عالم کے لیے بھی فائدہ ہوتا ہے کہ دل میں بند اس کا علم باہر نکلتا ہے اور لوگوں میں پھیل کر حیات پاتا ہے۔ طالب علم کے لیے فائدہ یہ ہے کہ اسے وہ چیز معلوم ہو جائے گی جو وہ نہیں جانتا اور وہ چیز زیادہ پختہ ہو جائے گی جو وہ جانتا ہے جب کہ جس بات میں اسے شک ہو اس کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔

بیدار مغز طالب علم کی شان یہ ہے کہ وہ کچھ سنتا ہے یا پڑھتا ہے تو اس لیے کہ اسے لوحِ دماغ میں محفوظ کر لے۔ دل میں اس کا فہم ڈال لے۔ اگر اسے کوئی شک و تردد ہو تو دوبارہ دیکھے یا کسی سے پوچھ لے۔ امام بخاری ابن ابی ملیکہ سے روایت کرتے ہیں کہ ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب کوئی بات ایسی سنتیں جو انھیں معلوم نہ ہوتی تو کہنے والے سے دوبارہ سنتیں حتیٰ کہ اچھی طرح سمجھ لیتیں۔''

صحابہ کرامؓ نے بے شمار ایسے مسائل پوچھے ہیں جن کا مفہوم ان پر واضح نہ ہو سکا تھا اور انھیں جواب بھی دیا گیا۔ مثلاً صحابہ کرامؓ نے آیت اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ. (الانعام:۸۲) ''حقیقت میں تو امن انھی کے لیے ہے اور راہِ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔'' کے بارے میں پوچھا کہ ''ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے اوپر ظلم نہیں کر رکھا؟ تو انھیں جواب دیا گیا کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان:۱۳) ''بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔''

۳۴- بخاری، باب من استحیا فامر غیرہ بالسؤال۔

ایسی مثالیں تو بہت سی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ جو شخص سوال نہیں کرتا وہ بہت سے علم سے محروم رہ جاتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے:

اِذَا کُنْتَ لَا تَدْرِیْ وَلَمْ تَکُ بِالَّذِیْ
یُسَائِلُ مَنْ یَدْرِیْ فَکَیْفَ اِذَنْ تَدْرِیْ؟

''اگر آپ کسی چیز کے بارے میں نہیں جانتے اور کسی جاننے والے کے پاس بھی نہیں جاتے تا کہ اس سے پوچھ لیں تو پھر آپ کیسے کسی چیز کے بارے میں جان سکتے ہیں؟''۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

''جو علم سیکھے، وہ دوسروں کو بھی سکھائے اور جو علم نہ رکھتا ہو وہ علماء سے پوچھ لیا کرے۔''

---○○---

تعلیم کی اقدار و مبادیات

سنت رسولؐ نے جس طرح حصولِ علم کی فضیلت اور اس کے آداب وحدود کو بیان کیا ہے اسی طرح تعلیم کی فضیلت و مقام اور اس کے آداب و شرائط کھول کھول کر بیان کیے ہیں اور معلّم کو تو انتہائی بلند مقام پر فائز کر دیا ہے کہ رسولِ کریم ﷺ کا فرمان ہے: خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهٗ (بخاری) ''تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور پھر دوسروں کو سکھائے۔'' اسی طرح ان اصلی و حقیقی اقدار کی بھی بڑی اہمیت بیان کی ہے، جن کو لوگ عصر حاضر کی دین سمجھتے ہیں یا یورپ و امریکہ سے درآمد ہونے والے مادی سامان کی طرح اسے بھی درآمد شدہ خیال کرتے ہیں۔

ہم اس فصل میں انھی اہم اقدار و مبادیات پر گفتگو کریں گے جنھیں سنت نے کھول کر بیان کیا ہے اور اصحابِ رسولؐ و اسلافِ امت نے ان کو بہت اہمیت دی ہے۔ ممکن ہے آئندہ نسلوں کا اپنے دین تہذیب پر اعتماد بحال ہو جائے اور انھیں اپنی زندگی سے متعلق معلوم ہو جائے کہ کیا چیز اصل ہے اور کس چیز کو اس میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ علمی بیداری اور رضائے الٰہی و تقوائے ربانی کی بنیادوں پر ہونے والی تربیت کی عمارت کو اٹھانے کے لیے اسی راہ پر چل پڑیں جس پر ان سے پہلے لوگ چلے تھے۔ شاعر کے الفاظ میں:

نَبْنِی کَمَا کَانَتْ اَوَائِلُنَا تَبْنِیْ   وَ نَفْعَلُ مِثْلَمَا فَعَلُوْا

''ہم بھی اپنے سے پہلے گزرنے والوں کی طرز پر عمارت تعمیر کریں گے۔ اور وہی کچھ کریں گے جو وہ کرتے رہے۔''

۱۔ معلّم کی شان اور قدر و منزلت کو بلند جاننا

ان حقیقی اقدار میں سب سے پہلی قدر استاد کو شایانِ شان مقام دینا اور اس کی قدر و منزلت کو بلند جاننا ہے کیوں کہ وہ لوگوں کو حق کی طرف رہنمائی کرنے اور اس چیز کی تعلیم دینے کے

اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام ہے جو چیز ان سے پہلے گزرے لوگوں کے لیے بھی فائدہ مند رہی اور آئندہ آنے والوں کے لیے بھی سود مند ہوگی۔ ہم گزشتہ باب ''حصول علم کے آداب'' میں ''استاد کے عزت و احترام'' کے وجوب پر گفتگو کر آئے ہیں۔

درحقیقت عملِ تعلیم میں استاد ہی ایک فعال عنصر ہوتا ہے۔ طلبہ میں اس کی کامیابی و اثرات کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ علم و فکر کا کس قدر ذخیرہ اپنے دماغ میں محفوظ کیے ہوئے ہے، رسالت محمدیہ پر ایمان اور اپنے شاگردوں کے لیے کتنی متاع اپنے دل میں رکھتا ہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور مہارتوں کو طریقۂ تعلیم میں کس حسن و خوبی سے استعمال کرتا ہے۔

بعض اوقات استاد طریقۂ تعلیم اور کتاب کی خامیوں کا بدل ہوتا ہے اور بسا اوقات استاد ہی طریقۂ تعلیم اور استاد ہی کتاب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کے نزدیک استاد کی بڑی اہمیت ہے۔ آپؐ نے اللہ اور تمام مخلوقات کے نزدیک اس کے مقام و مرتبہ کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے کہ اِدھر استاد اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے، اُدھر مخلوقاتِ ارضی و سماوی اس کی مغفرت کے لیے دعا میں مصروف ہوتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> إِنَّ اللّٰهَ وَ مَلَائِكَتَهُ، وَ أَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةِ فِي جُحْرِهَا وَ حَتَّى الْحُوْتِ، لَيُصَلُّوْنَ عَلَى مُعَلِّمِي النَّاسِ الْخَيْرَ.[۱]
>
> ''بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور زمین و آسمان کی ہر چیز حتیٰ کہ چیونٹی اپنے بل میں اور مچھلی (پانی میں) اس شخص کے لیے دعائے رحمت کرتی ہیں جو لوگوں کو خیر و بھلائی کی تعلیم دیتا ہے۔''

اس اعزاز و فضیلت سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو خیر و فلاح کی تعلیم دینے والے کے لیے زمین و آسمان کی گناہوں سے مبرا مخلوقات صلوٰۃ و دعا میں مشغول رہیں!

نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

> لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي

۱- ترمذی نے اسے حدیثِ ابوامامہ سے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔

الْحَقِّ. وَ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَ يُعَلِّمُهَا. (۲)

"حسد کرنا جائز نہیں مگر دو آدمیوں سے (کیا جا سکتا ہے) ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور اس کو یہ مال حق کی راہ میں صرف کرنے کی قدرت و توفیق دی، دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا تو وہ اپنے اس علم و حکمت کے ساتھ فیصلے کرتا ہے اور لوگوں کو بھی یہ علم سکھاتا ہے۔"

یہاں حسد سے مراد رشک ہے۔ اور ایک شکرگزار مالدار اور اہل علم استاد کی زندگی و کردار پر رشک کیوں نہ کیا جائے؟ بلکہ حدیث میں تو آتا ہے، کسی کو مفت تعلیم کا صدقہ دینا مال کا صدقہ دینے سے بہتر ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں:

اَنَّ النَّبِيَّ قَالَ: أَفْضَلُ الصَّدَقَةِ أَنْ يَتَعَلَّمَ الْمَرْءُ عِلْمًا ثُمَّ يُعَلِّمَهُ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ. (۳)

"نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بہترین صدقہ یہ ہے کہ آدمی علم سیکھے، پھر اپنے کسی مسلمان بھائی کو سکھائے۔"

نبی کریم ﷺ سے ایک اور حدیث بھی مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ تَعَلَّمَ كَلِمَةً أَوْ كَلِمَتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا أَوْ أَرْبَعًا أَوْ خَمْسًا مِمَّا فَرَضَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ، فَيَتَعَلَّمُهُنَّ وَ يُعَلِّمُهُنَّ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ. (۴)

"جس کسی مسلمان نے ان باتوں میں سے جن کا سیکھنا اللہ نے فرض قرار دیا ہے، کوئی ایک بات سیکھی، یا دو باتیں سیکھیں یا تین یا چار یا پانچ! (پھر) وہ ان کو مزید سیکھتا رہا اور دوسروں کو سکھاتا رہا تو وہ جنت میں داخل ہوئے بغیر نہ رہے گا۔"

۲- بخاری و مسلم نے حدیثِ ابن مسعود سے روایت کیا ہے جیسا کہ ترغیب ۱۲۱ میں ہے۔

۳- ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ حسن طریق سے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ (الترغیب ۱۲۰)

۴- اسے ابونعیم نے روایت کیا ہے۔ ابوہریرہؓ سے حسن کا سماع صحیح ہو تو اس کی سند حسن ہے۔ (ترغیب)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ سے حدیث سننے کے بعد کبھی اسے بھولا نہیں، معلم کے لیے تو یہ فضیلت ہی کافی ہے کہ اس کو اسی مقدار سے اجر ملے گا جس مقدار میں لوگ اس کے علم سے مستفید ہوں گے اور راہِ راست پر گامزن ہوں گے۔ یہ لوگ خواہ معلم کے قریب ہوں یا بعید، کم ہوں یا زیادہ سب استاد کے اجر کا باعث بنیں گے۔

آپؐ نے فرمایا ہے:

مَنْ دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ.(۵)

"جس نے بھلائی کی طرف رہنمائی کی اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس بھلائی کے کرنے والے کو ملے گا۔"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے:

مَنْ دَعَا اِلٰی هُدًی كَانَ لَهُ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ اُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَ مَنْ دَلَّ اِلٰی ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلَ اٰثَامِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا.(۶)

"جو شخص دوسروں کو ہدایت کی دعوت دے، اس کے لیے اتنا ہی اجر ہے جتنا اس کی بات مان کر اس پر عمل کرنے والوں کے لیے ہے، یہ (اس شخص کو ملنے والا اجر) ان عمل کرنے والوں کے اجر سے کچھ بھی کمی نہیں کرے گا۔ اور جس کسی نے دوسروں کو گمراہی کی طرف دعوت دی اس کے اوپر اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس کے کرنے والوں کو ہوگا۔ (اس شخص کا گناہ) ان برائی کرنے والوں کے گناہوں میں کچھ بھی کمی نہیں کرے گا۔"

جب کہ ادھر نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے:

لَأَنْ يَهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ.(۷)

۵- مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے حدیثِ ابومسعود البدری سے روایت کیا ہے۔ (ترغیب ۱۹۴)

۶- مسلم وغیرہ نے ابوہریرہؓ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

۷- بخاری و مسلم نے حدیثِ علی سے روایت کیا ہے۔

''اگر اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے ایک شخص کو بھی ہدایت عطا کر دے تو تیرے لیے یہ (اجر وثواب) سرخ اونٹوں سے زیادہ بہتر ہے۔''

اب یہ کتنے ہی افراد اور جماعتیں ہوں گی جن کو اللہ ہدایت دے گا تو جب تک ان کو اجر ملتا رہے گا اس شخص کو بھی ملتا رہے گا۔

حضرت ابوموسیٰؓ آپؐ سے روایت کرتے ہیں:

قَالَ: مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللّٰهُ بِهِ مِنَ الهُدٰي وَ العِلْمِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَصَابَ اَرْضًا، فَكَانَ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ المَاءَ، فَاَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالعُشْبَ الكَثِيْرَ. وَكَانَ مِنْهَا أَجَادِبُ اَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا مِنْهَا وَ سَقَوْا وَ زَرَعُوْا وَاَصَابَ طَائِفَةً اُخْرٰى اِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ، لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً. فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقِهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ وَ نَفَعَهُ مَا بَعَثَنِي اللّٰهُ بِهِ فَعَلِمَ وَ عَلَّمَ، وَ مَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِي اُرْسِلْتُ بِهِ.(۸)

''آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ہدایت وعلم دے کر بھیجا ہے اس کی مثال اس بارش جیسی ہے جو زمین پر برستی ہے۔ اب زمین کا ایک حصہ اتنا عمدہ ہوتا ہے کہ پانی کو جذب کر لیتا ہے اور گھاس و دیگر بہت سی جڑی بوٹیاں اُگا ڈالتا ہے اور ایک حصۂ زمین بنجر ہوتا ہے لیکن پانی کو روک لیتا ہے۔ اللہ اس پانی کے ذریعے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے کہ وہ اس سے پیتے بھی ہیں اور اپنے مویشیوں وکھیتوں کو سیراب بھی کرتے ہیں جب کہ ایک حصۂ زمین وہ ہے جو ناہموار ہے۔ پانی کو روکتا ہے نہ کوئی سبزہ اُگانے کے قابل ہے۔ پہلی اس شخص کی مثال ہے جو اللہ کے دین میں فقہ وفراست حاصل کر لیتا ہے اور اللہ نے مجھے جو کچھ دے کر بھیجا ہے اسے سیکھ کر اور دوسروں کو سکھا کر اس سے منافع حاصل کر رہا ہے، آخری مثال اس شخص کی ہے جس نے سر اُٹھا کر اس

۸۔ بخاری ومسلم نے حدیث ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے۔

خزینہ بے بہا کی طرف نہ دیکھا اور نہ اس ہدایت الٰہی کو ہی قبول کیا جو مجھے
دے کر بھیجا گیا ہے۔"

اس حدیث میں علم نبوت کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس لیے کہ علم و ہدایت اور بارش دونوں حیات آفریں ہیں، بارش مردہ زمین کی زندگی کا سبب بنتی ہے اور علم دل و دماغ کو جہالت کے باعث مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔

اور علم و ہدایت کے ساتھ لوگوں کا رویہ وہی ہے جو زمین کا بارش کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک زمین عمدہ ہے پانی کو پی لیتی ہے اور زندہ ہو جاتی ہے۔ گھاس پھونس اور جڑی بوٹیاں کثیر سبزہ کی صورت میں اگا دیتی ہے۔ اس زمین کے ٹکڑے کے ساتھ ان لوگوں کو تشبیہ دی گئی ہے جو معلمین و داعیین اہل علم ہیں، وہ روایت و درایت دونوں کا علم رکھتے ہیں۔ وہ اس علم سے خود بھی مستفید ہوتے ہیں اور دوسروں کی فلاح کا باعث بھی بنتے ہیں۔

ایک وہ زمین ہے جو پانی محفوظ کر لیتی ہے گویا کہ پانی جمع کرنے کے لیے بنائے گئے بڑے بڑے تالاب ہوتے ہیں جہاں سے پانی بہہ کر ضائع نہیں ہو سکتا۔ یہ زمین پانی کو اس لیے محفوظ رکھتی ہے تاکہ لوگ اس سے اپنی پیاس بھی بجھا سکیں اور اپنے کھیتوں اور مویشیوں کو بھی پلائیں۔ اس قطعۂ زمین سے ان حفاظ و ناقلین اہل علم کو تشبیہ دی گئی ہے جو دوسروں کے علم کو ازبر کیے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اس علم میں کوئی بڑا فہم یا استنباط کی قوت نہیں رکھتے۔

زمین کی تیسری قسم ردی اور شورزدہ زمین ہے کہ نہ یہ خود بارش سے فائدہ اٹھاتی ہے نہ دوسروں کے لیے روک رکھتی ہے۔ اس زمین سے ان لوگوں کو تشبیہ دی گئی ہے جنھوں نے علم سے اعراض کیا نہ خود اس سے مستفید ہوئے نہ کسی دوسرے کے لیے استفادہ کا باعث بنے۔ کچھ حفظ کیا نہ کسی چیز کا فہم حاصل کیا۔ ان کا شمار نہ اہل روایت میں ہوتا ہے نہ اہل درایت میں۔ (۹)

دراصل ایک باعمل اہل علم استاد ہی نبوت کا حقیقی وارث ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے مروی ہے کہ "جس نے علم سیکھا، اس پر عمل کیا، پھر دوسروں کو سکھایا، اس شخص کو ملکوت السمٰوٰت کے درمیان عظیم نام سے پکارا جاتا ہے۔"

۹- ابن قیم نے اس بارے میں مفتاح السعادہ میں بہت خوب صورت بحث کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے ج ۱/ ۶۰

اسلاف تو کسی شخص کو ''ربانی'' کا نام اس وقت دیتے تھے جب وہ علم حاصل کر لیتا، اس پر عمل پیرا ہو جاتا اور پھر دوسروں کو بھی سکھاتا۔ یہ اشارہ ہے کلام الٰہی کے اس فرمانِ الٰہی کی طرف جس میں فرمایا گیا ہے:

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰانِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. (آلِ عمران:۷۹) ''سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔''

معلّم کے شرف و فضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ خیر خلق اللہ، جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ نے خود کو ''معلّم'' کہا ہے۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِيْ مَسْجِدِهٖ. اَحَدُ الْمَجْلِسَيْنِ يَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَ يَرْغَبُوْنَ اِلَيْهِ. وَالْاٰخَرُ يَتَعَلَّمُوْنَ الفِقْهَ وَ يُعَلِّمُوْنَهٗ قَالَ: كِلَا الْمَجْلِسَيْنِ عَلٰى خَيْرٍ وَ اَحَدُهُمَا أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ أَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَ يَرْغَبُوْنَ اِلَيْهِ فَاِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ. وَأَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَتَعَلَّمُوْنَ الفِقْهَ وَالعِلْمَ وَيُعَلِّمُوْنَ الجَاهِلَ، فَهٰؤُلَاءِ أَفْضَلُ وَ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا. ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ. (۱۰)

''رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں دو مجلسوں کے قریب سے گزرے۔ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ اللہ کے ذکر و اذکار اور دعا و مناجات میں مصروف تھے، جب کہ دوسرے گروہ کے لوگ مسائل کی فقہ سیکھ اور سکھا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: دونوں مجلسیں خیر کے کام میں مشغول ہیں لیکن ایک افضل ہے۔ یہ جو لوگ اللہ سے دعا و مناجات کر رہے ہیں اور اس کے ذکر میں مصروف ہیں اگر اللہ چاہے تو انھیں وہ کچھ عطا کر دے جو یہ مانگ رہے ہیں

۱۰- دارمی نے اسے روایت کیا ہے۔ دیکھیے سید عبداللہ ہاشم یمانی کی تحقیق جلد۱/۴/۷ اور ابوداؤد طیالسی ج۱/۳۶، بغوی ج۱/۴/۲۷۴-۲۷۵۔ اس کی سند میں عبدالرحمٰن ابن زیاد بن انعم افریقی ہے جو ضعیف ہے۔

اور اگر چاہے تو روک لے۔ جب کہ دوسری مجلس کے لوگ دین کی فقہ اور علم حاصل کر رہے ہیں اور جاہل کو (بھی یہ علم) سکھا رہے ہیں۔ یہ لوگ افضل ہیں اور مجھے تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کے بعد آپؐ دوسری مجلس میں بیٹھ گئے۔"

اگرچہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے لیکن امام مسلم کی روایت کردہ یہ صحیح حدیث اس کا شاہد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَبْعَثْنِي مُعَنِّتًا وَلَا مُتَعَنِّتًا وَ لٰكِنْ بَعَثَنِي مُعَلِّمًا مُيَسِّرًا.[11]

"اللہ نے مجھے سختی میں ڈالنے والا اور سختی میں پڑنے والا بنا کر نہیں بھیجا بلکہ مجھے تعلیم دینے والا اور آسانیاں پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

اس موقف کی شہادت تو خود قرآنِ مجید سے بھی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کا یہ وصف قرآنِ مجید میں چار آیات میں بیان کیا ہے کہ امت کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا آپؐ کی بنیادی ذمہ داری میں شامل ہے۔ یہ چار آیات درج ذیل ہیں:

۱- رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ، اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. [البقرہ:۱۲۹]

"اے رب ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک رسول مبعوث فرما جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تُو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

۲- كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ. [البقرہ:۱۵۱]

"ہم نے تمھارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمھیں ہماری آیات سناتا ہے، تمھاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔"

۱۱- مسلم نے اپنی صحیح کتاب الطلاق حدیث ۱۴۷۸ میں روایت کیا ہے۔ احمد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے جیسا کہ تفسیر ابن کثیر ج ۳/۸۴۱ میں درج ہے۔

۳- لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ط وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ[اٰل عمران:۱۶۴]

''درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے تھے۔''

۴- هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ.[الجمعۃ:۲]

''وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انھی میں سے اٹھایا، جو انھیں اُس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اِس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

۲- ابنائے قوم کو تعلیم دلانے میں معاشرہ کا باہمی ذمہ دار ہونا

جو شخص بھی علم حاصل کرے اس کو چاہیے کہ وہ دوسروں کو یہ علم سکھانے کا آغاز اپنے قریب ترین لوگوں سے کرے، پھر ان کے بعد کے لوگ! اسی ترتیب سے وہ تعلیمی عمل میں آگے بڑھتا جائے، جس طرح مال خرچ کرنے کے بارے میں ہے کہ اِبْدَاْ بِمَنْ تَعُوْلُ[۱۲] ''سب سے پہلے اس آدمی کو صدقہ دو جو تمھاری عیالداری میں آتا ہے۔''

حضرت علیؓ نے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا.[التحریم:۶] کی تفسیر میں فرمایا کہ عَلِّمُوْا اَهْلِيْكُمُ الْخَيْرَ[۱۳] اپنے اہل کو خیر کی تعلیم دو۔''

۱۲- طبرانی نے اسے حکیم بن حزام سے روایت کیا ہے اور سیوطی نے الجامع الصغیر میں اس کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۱۳- حاکم نے اس کو موقوف روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صحیح علی شرطھا ہے۔ ذہبی نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔ دیکھیے جلد ۲/۴۹۴

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ. [طٰہٰ:۱۳۲]

"اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے۔ رزق تو ہم ہی تمھیں دیتے ہیں اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔"

حدیث رسولؐ میں آتا ہے:

مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهُ نَحْلًا أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ. (۱۴)

"کوئی باپ اپنے بیٹے کو 'اچھا اخلاق' سکھانے سے بہتر کوئی تحفہ نہیں دے سکتا۔"

ہاں! بیوی، اولاد اور اقارب کے بعد ہمسایوں کا حق ہے کہ انھیں بھی تربیت کے اس عمل میں شریک کیا جائے۔ کیوں کہ اسلام میں ہمسایہ کے حقوق کی بڑی تاکید آئی ہے۔ حتیٰ کہ جبریل نے نبی اکرمؐ اور آپؐ نے اپنے اصحابؓ کو اس کی تاکید کی اور اس قدر مسلسل تاکید کرتے رہے کہ صحابہؓ کو یقین ہونے لگا کہ آپؐ ہمسایہ کو بھی وراثت میں شریک ٹھہرا دیں گے۔

بیوی بچوں کے بعد خادمین کا بھی حق ہے کہ ان کو بھی علم سے آراستہ کیا جائے۔ گھر کا مالک ان کی تعلیم وتربیت میں بخل کا مظاہرہ نہ کرے کیوں کہ یہ لوگ بھی تو اس کے خاندان کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ اگر وہ بھلائی کی راہ پر چلیں گے تو اُن کے لیے بھی اس میں بہتری ہے اور خاندان کے لیے بھی اور اگر برائی اختیار کرلیں گے تو اس کا گناہ ان کو بھی ہوگا اور خاندان بھی اس کا ذمہ دار ہوگا۔

امام بخاریؒ نے "بَابُ تَعْلِيمِ الرَّجُلِ أَمَتَهُ وَأَهْلَهُ" میں حضرت ابوموسیٰؓ کی حدیث روایت کی ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ

۱۴- ترمذی نے حدیث عمرو بن شعیب سے اس کو روایت کیا ہے اور حسن غریب مرسل کہا ہے مگر حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے اس کی تردید کی ہے۔ دیکھیے جلد۴/۵۰۳

بِمُحَمَّدٍ (ﷺ)، وَالعَبْدُ الْمَمْلُوکُ اِذَا أَدّٰی حَقَّ اللّٰهِ وَ حَقَّ مَوَالِیْهِ، وَ رَجُلٌ کَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ فَاَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَادِیْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِیْمَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ"

"تین آدمی ایسے ہیں جن کو دو اجر ملیں گے:

۱- وہ آدمی جو اہل کتاب ہے مگر محمدؐ پر ایمان لے آیا۔

۲- وہ غلام جو اللہ اور اپنے مالکوں کے حقوق (ایمانداری سے) پورے کرتا ہے۔

۳- وہ آدمی جس کے پاس ایک کنیز (لونڈی) ہو وہ اس کی بہترین تربیت کرے اور اسے بہترین تعلیم دے۔ پھر اس کو آزاد کر دے اور اس کے بعد اس سے نکاح بھی کر لے۔ اس کے لیے بھی دو اجر ہیں۔"

لونڈی کے مالک کے لیے ایک اجر لونڈی کو بہترین تربیت دینے اور بہترین علم سکھانے پر ہے اور دوسرا اجر اُسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لینے پر ہے۔

کوئی انسانی اجتماعیت خواہ کسی بستی میں رہتی ہو یا محلہ میں سنت کی ان تاکیدی وصیتوں نے آیات قرآنی کو ساتھ ملا کر اس اجتماعیت کو خوشی غمی کے ہر مادی و معنوی موقع پر ایک دوسرے کے شریک و کفیل بنا دیا ہے۔

مادی اور اقتصادی لحاظ سے تو نبی کریمؐ نے اس شخص کو اہل ایمان کے دائرے میں قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے جو نعمت و خوشحالی سے خود تو لطف اندوز ہو لیکن اپنے ہمسایہ کے معاشی مسائل سے بے خبر رہے۔ آپؐ نے فرمایا:

لَیْسَ بِمُؤْمِنٍ (فی روایة: لَیْسَ مِنَّا) مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهٗ اِلٰی جَنْبِهٖ جَائِعٌ وَ هُوَ یَعْلَمُ"(۱۵)

"وہ شخص مؤمن نہیں ہے (ایک روایت میں ہے کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے) جو شکم سیر ہو کر رات گزارے اور اسے یہ معلوم ہو کہ اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا ہے۔"

۱۵- بزار اور طبرانی نے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ الفیض ج ۵/ ۳۰۷

عقلی و معنوی اعتبار سے ان لوگوں پر فرض ہے کہ جن کو علم کی دولت سے کچھ حصہ ملا ہو وہ اپنے ہمسایوں کو نورِ علم سے مستنیر کیے بغیر نہ رہنے دیں۔ وہ انھیں سمجھا بجھا کر اور علم سکھا کر اپنے علم کی زکوٰۃ اسی طرح ان کو دیں جس طرح وہ اپنی دولت کی زکوٰۃ انھیں دیتے ہیں۔ اس بارے میں ایک مشہور واقعہ روایت کیا گیا ہے:

خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ، ذَاتَ يَوْمٍ فَأَثْنٰى عَلٰى طَوَائِفَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا، ثُمَّ قَالَ: مَا بَالُ أَقْوَامٍ لَا يُفَقِّهُوْنَ جِيْرَانَهُمْ، وَلَا يُعَلِّمُوْنَهُمْ، وَلَا يَعِظُوْنَهُمْ، وَلَا يَأمُرُوْنَهُمْ، وَلَا يَنْهَوْنَهُمْ؟ وَمَا بَالُ أَقْوَامٍ لَا يَتَعَلَّمُوْنَ مِنْ جِيْرَانِهِمْ، وَلَا يَتَفَقَّهُوْنَ وَلَا يَتَّعِظُوْنَ، وَ اللّٰهِ لَيُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِيْرَانَهُمْ، وَ يُفَقِّهُوْنَهُمْ، وَ يَعِظُوْنَهُمْ، وَ يَأْمُرُوْنَهُمْ وَ يَنْهَوْنَهُمْ، وَ لِيَتَعَلَّمَنَّ قَوْمٌ مِنْ جِيْرَانِهِمْ، وَيَتَفَقَّهُوْنَ، وَيَتَّعِظُوْنَ، أَوْ لَأُعَاجِلَنَّهُمُ الْعُقُوبَةَ، ثُمَّ نَزَلَ، فَقَالَ قَوْمٌ: مَنْ تَرَوْنَهُ عَنٰى بِهٰؤُلَاءِ؟ قَالَ: اَلْأَشْعَرِيِّيْنَ هُمْ قَوْمٌ فُقَهَاءُ، وَلَهُمْ جِيْرَانٌ جُفَاةٌ مِنْ أَهْلِ الْمِيَاهِ وَالْأَعْرَابِ، فَبَلَغَ ذٰلِکَ الْاَشْعَرِيِّيْنَ، فَأَتَوا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، ذَكَرْتَ قَوْمًا بِخَيْرٍ، وَذَكَرْتَنَا بِشَرٍّ فَمَا بَالُنَا؟ فَقَالَ: لِيُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِيْرَانَهُمْ، وَلِيَعِظَنَّهُمْ، وَلِيَأْمُرَنَّهُمْ، وَلِيَنْهَوَنَّهُمْ، وَ لِيَتَعَلَّمَنَّ قَوْمٌ مِنْ جِيْرَانِهِمْ، وَ يَتَّعِظُوْنَ. وَيَتَفَقَّهُوْنَ أَوْ لَأُعَاجِلَنَّهُمُ الْعُقُوبَةَ فِي الدُّنْيَا، فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَنُفَطِنُ غَيْرَنَا؟ فَأَعَادَ قَوْلَهُ عَلَيْهِمْ، فَأَعَادُوْا قَوْلَهُمْ: أَنُفَطِنُ غَيْرَنَا؟ فَقَالَ ذٰلِکَ أَيْضًا، فَقَالُوْا: أَمْهِلْنَا سَنَةً فَأَمْهَلَهُمْ سَنَةً لِيُفَقِّهُوْهُمْ، وَيُعَلِّمُوْهُمْ، وَيَعِظُوْهُمْ (فی نسخة: يفقهونهم، وَ يعلمونهم و يعظونهم) ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هٰذِهِ الْأيَةَ: (لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ......) [الآیۃ ۷۸ وما بعدھا من سورۃ المائدہ] (۱۶)

"علقمہ بن سعد بن عبدالرحمٰن بن ابزٰی اپنے باپ اور دادا سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے ایک روز لوگوں سے خطاب کیا تو مسلمانوں کے کچھ گروہوں کا اچھا تذکرہ کر کے ان کی تعریف کی۔ پھر فرمایا: "کچھ قبیلوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کو دین کا فہم نہیں سکھاتے۔ انھیں تعلیم نہیں دیتے، انھیں وعظ ونصیحت نہیں کرتے، نہ انھیں بھلائی کا حکم دیتے ہیں نہ برائی سے روکتے ہیں؟...... اور ان لوگوں کو بھی کیا ہو گیا ہے جو اپنے (اہل علم) ہمسایوں سے تعلیم حاصل نہیں کرتے، ان سے مسائل نہیں سیکھتے، ان سے کوئی پند ونصائح نہیں لیتے؟ اللہ کی قسم! سنو! (اہل علم) قوم اپنے ہمسایوں کو تعلیم لازماً دے، انھیں مسائل سکھائے، انھیں وعظ ونصیحت کرے، بھلائی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے۔ اور سنو! کہ (بے علم) قوم لازماً اپنے ہمسایوں سے علم سیکھے، ان سے مسائل کا فہم حاصل کرے۔ ان کا وعظ ونصیحت سنے! (اگر ایسا نہیں کرو گے تو) میں ضرور جلد ہی ان لوگوں کو سزا دوں گا۔" یہ فرمانے کے بعد آپ منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ لوگوں نے آپس میں پوچھنا شروع کر دیا کہ جن لوگوں کا آپؐ نے ذکر کیا ہے ان سے مراد کون لوگ ہیں۔ کسی نے کہا اشعری لوگ اس سے مراد ہیں کیوں کہ وہ فقہاء لوگ ہیں اور ان کے ہمسایے اہل میاہ خشک اعرابی ہیں۔" یہ بات اشعری لوگوں تک پہنچی تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہؐ! آپ نے ایک قوم کا اچھا تذکرہ کیا اور ہمارا ذکر برا ہوا ہے۔ ہم میں کیا خامی ہے؟ آپؐ نے فرمایا "چاہیے کہ لازماً ایک (اہل علم) قوم اپنے ہمسایوں کو تعلیم دے۔ انھیں وعظ کرے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور ایک (جاہل) قوم لازماً اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کرے۔ ان سے وعظ ونصیحت سنے،

۱۶- طبرانی نے اس کو اپنی کبیر میں بکیر بن معروف عن علقمہ سے روایت کیا ہے۔

مسائل کا فہم حاصل کرے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو میں دنیا میں ہی جلد ان کو ضرور سزا دوں گا۔'' ان لوگوں نے کہا یا رسول اللہؐ! کیا ہم دوسرے لوگوں کو سمجھانے کا کام کریں؟ اس پر آپؐ نے پھر وہی کلمات دہرائے (جو اوپر مذکور ہیں) تو ان لوگوں نے بھی دوبارہ وہی سوال دہرایا کہ کیا ہم اپنے علاوہ دوسروں کو تعلیم دینے کا کام کریں؟ آپؐ نے اس بار بھی وہی کلمات جواب میں ارشاد فرمائے۔ آپؐ کا یہ جواب سن کر ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں ایک سال کی مہلت دیجیے! تو آپؐ نے انھیں ایک سال کی مہلت دے دی کہ ان لوگوں کو مسائل سکھائیں، انھیں تعلیم دیں۔ وعظ ونصیحت کریں (ایک نسخے میں الفاظ کی ترتیب یفقهونهم و یعلمونهم و یعظونهم ہے) پھر آپؐ نے قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھی:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ. [المائدہ:۷۸-۷۹]

''بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داوٗد علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیوں کہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا، برا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا۔''

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم نے اس حدیث پر حاشیہ لکھا ہے کہ اس حدیث میں آپ کو کچھ قابل توجہ امور ملیں گے:

۱- رسول اللہ ﷺ کسی تعلیم یافتہ گروہ کے پہلو میں کسی ایسے گروہ کو پسند نہیں فرماتے جو علم سے بیگانہ رہتے ہوئے جہالت میں رہے۔

۲- جاہلوں کا اپنی جہالت پر اڑے رہنا اور تعلیم کے حاجت مندوں کے تعلیم حاصل نہ کرنے کو آپؐ نے اللہ اور شریعت کے احکام کی نافرمانی سے تعبیر کیا ہے۔

۳- اسے ''عدوان'' اور ''منکر'' بھی قرار دیا ہے جو دونوں لعنت وعذاب کے لائق ہیں۔

۴- اور دونوں فریقوں (نہ سکھانے والوں اور نہ سیکھنے والوں) سے جنگ اور سزا کا اعلان کیا ہے تا آنکہ وہ سیکھنا سکھانا شروع کر دیں۔

۵- ان کے اندر موجود جہالت کے دیرپا اثرات کو زائل کرنے کے لیے ایک سال کی مہلت دی۔

۶- اگرچہ یہ واقعہ اشعری قبیلے اور ان کے جاہل ہمسایوں سے متعلق ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے جس قانون کا اعلان کیا ہے وہ عام ہے۔ اس میں اشعری لوگوں کو ہی خاص نہیں کیا گیا کیوں کہ جب اشعری آپؐ کے پاس آئے اور اپنے بارے میں اس خاص حکم واعلان کا راز پوچھا تو آپؐ نے ان سے یہ نہیں کہا کہ اس سے مراد تمہی لوگ ہو۔ بلکہ آپؐ نے وہ عام قول دہرایا جو اوپر تین بار ذکر ہوا ہے اور اشعریوں کا ذکر کیے بغیر یہ قول آپؐ نے دہرایا۔ آپؐ دراصل لوگوں کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ یہ ایک عام مسئلہ ہے کسی گروہ اور کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

۳- طالب علم کے ساتھ خندہ روئی سے پیش آنا اور حوصلہ افزائی کرنا

ان اہم تربیتی اقدار میں سے ایک قدر وہ بھی ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے جاری فرما کر استاد کے لیے طالب علم کے ساتھ رویے کو متعین کر دیا ہے۔ معلم کے آداب تعلیم میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ وہ متعلم کا ہمہ پہلو خیال رکھے تاکہ تعلیم بہترین ثمرات دے سکے۔

استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے طالب علم کو حصولِ تعلیم کے لیے ابھارے، اس کے ساتھ ہنس مکھی اور بشاشت روئی سے پیش آئے۔ اس کی آمد کو اچھے الفاظ میں سراہے۔ تاکہ طالب علم کے اندر استاد کا جو خوف اور تعلیم سے فرار کا جو رجحان موجود ہے اس کا خاتمہ ہو سکے۔

نبی کریم ﷺ یہی کیا کرتے تھے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ نے یہ عمل جاری رکھا۔ قیس بن کثیر بیان کرتے ہیں کہ مدینہ سے ایک آدمی دمشق میں حضرت ابوالدرداؓ سے ملنے کے لیے آیا۔ حضرت ابوالدرداؓ نے اس سے پوچھا: میرے بھائی! آپ کس غرض سے آئے ہیں؟ آدمی نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کی کوئی حدیث بیان کرتے ہیں۔ حضرت بوالدرداؓ

نے استفسار کیا: کیا آپ تجارت کی غرض سے نہیں آئے؟ آدمی نے کہا نہیں! حضرت ابوالدرداءؓ نے پوچھا آپ صرف حدیث کی طلب میں آئے ہیں؟ آدمی نے کہا ہاں!

اب ابوالدرداءؓ حدیث بیان کرتے ہیں:

"سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ سَلَکَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَلَکَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ. وَ اِنَّ الْمَلٰئِکَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ" (۱۷)

"ابوالدرداءؓ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ "جو آدمی طلب علم کی راہ پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی راہ پر چلا دے گا اور فرشتے اس آدمی (طالب علم) سے خوش ہو کر اپنے پر اس کے لیے بچھا دیتے ہیں۔"

حضرت صفوان بن عسال المرادیؓ سے روایت ہے:

"قَالَ: اَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ فِي الْمَسْجِد مُتَّکِیٌٔ عَلٰى بُرْدٍ لَهٗ اَحْمَرَ، فَقُلْتُ لَهٗ. يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِنِّي جِئْتُ اَطْلُبُ الْعِلْمَ فَقَالَ مَرْحَبًا بِطَالِبِ الْعِلْمِ! اِنَّ طَالِبَ الْعِلْمِ تَحُفُّهُ الْمَلٰئِکَةُ بَاَجْنِحَتِهَا ثُمَّ يَرْکَبُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حَتّٰى يَبْلُغُوْا السَّمَاءَ الدُّنْيَا مِنْ مَحَبَّتِهِمْ لِمَا يَطْلُبُ. (۱۸)

"میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ مسجد میں اپنی سرخ چادر پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں علم حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں! آپؐ نے جواب میں فرمایا: ہم طالب علم کو خوش

۱۷- یہ حدیث گزشتہ صفحات میں آ گئی ہے۔ یہاں یہ روایت مسند احمد کی ہے۔ دیکھیے فتح الربانی جلد ۱/ ۱۴۹ حدیث ۱۳ کتاب العلم

۱۸- احمد اور طبرانی نے جید سند کے ساتھ روایت کیا۔ یہ الفاظ طبرانی کے ہیں۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور صحیح الاسناد کہا ہے۔ ابن ماجہ نے بھی اسی اختصار کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے۔ ترغیب حدیث ۱۰۸

آمدید کہتے ہیں۔ طالب علم کی شان تو یہ ہے کہ فرشتے اس پر اپنے پروں کا سایہ کر دیتے ہیں۔ بعض تو بعض کے اوپر پَر پھیلا رکھتے ہیں یہاں تک کہ علم سے محبت کے باعث یہ آسمانِ دنیا تک اتر آتے ہیں اور یہ طالب علم کی جستجوئے علم کے باعث ہوتا ہے۔"

خود حضرت صفوانؓ کا بھی یہی دستور رہا کہ جو بھی ان کے پاس علم حاصل کرنے یا حدیث سننے کے لیے آتا وہ اس کی بڑی پذیرائی کرتے اور خندہ پیشانی سے پیش آتے اور وہی بشارت سناتے جو نبی کریم ﷺ نے اُن کو سنائی تھی۔

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: سَيَأْتِيكُمْ أَقْوَامٌ يَطْلُبُونَ الْعِلْمَ. فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمْ فَقُولُوا لَهُمْ: مَرْحَبًا بِوَصِيَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَ اَفْتُوهُمْ[۱۹]

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عنقریب تمھارے پاس لوگ حصولِ علم کے لیے آیا کریں گے تو جب تم انھیں دیکھو تو ان سے کہو: وصیتِ رسول کے مطابق تمھیں خوش آمدید! اور پھر ان کو فتویٰ دو (علم سکھاؤ)"

ایک روایت میں افتوھم کی جگہ اقنوھم آیا ہے۔ یعنی ان کو خوش رکھو اور حصول علم میں ان کی معاونت کرو۔

چنانچہ حضرت ابوسعیدؓ کا یہ معمول تھا کہ طلبہ ان کے پاس آتے تو وہ انھیں کہتے: وصیت رسولؐ کے مطابق تمھیں خوش آمدید۔[۲۰]

صحابہ کرام اور ان کے متبعین عظام نے بھی طلبائے علم کی حوصلہ افزائی، ان کی عزت و تکریم اور ادبی و مالی معاونت کرنے میں رسولِ کریم ﷺ کی اس وصیت پر عمل کیا تاکہ علم کے حصول میں نکلنے والے تحصیل علم کی تکمیل بآسانی کر سکیں۔

۱۹- ابن ماجہ، دیلمی اور طیالسی نے روایت کیا ہے۔ سیوطی نے الجامع الصغیر میں اس کے حسن ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دیکھیے فیض القدیر ج ۱ حدیث ۴۷۴۳

۲۰- حاکم نے اس کو مستدرک ج ۱/۱۸۰ میں روایت کیا ہے اور علم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ جب کسی نوجوان کو حصولِ علم میں مصروف دیکھتے تو کہتے:

"ان حکمت کے چشموں، تاریکی کے چراغوں، پوشاکیں بوسیدہ مگر نئے دل رکھنے والوں، گھروں میں بند رہ کر اپنے قبیلوں تک علم کی خوشبو پھیلانے والوں کو ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ خوش آمدید کہتے ہیں!"(۲۱)

امام ابوحنیفہؒ اکثر اپنے طلبہ کی مجلس میں رہتے تھے اور انھیں خصوصی اکرام و تکریم دیتے تھے۔ بویطیؒ اپنے شاگردوں کو اپنے انتہائی قریب رکھتے، انھیں حصولِ علم میں مشغول رہنے پر ابھارتے اور ان کے ساتھ بہترین سلوک سے پیش آتے۔(۲۲)

۴- طالب علم کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرنا

اسلام میں استاد کے آداب میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ ہمیشہ معلم اول، رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے طالب علم کے ساتھ نرمی کرے، اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے ایک باپ جیسا سلوک کرے جو وہ اپنی اولاد سے کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی صفت تو قرآنِ حکیم نے یوں بیان کی ہے:

لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. [التوبہ:۱۲۸]

"دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے شفیق اور رحیم ہے۔"

اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی یہ صفت خود یوں بیان فرمائی ہے:

اِنَّمَا اَنَا لَكُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهٖ(۲۳)

۲۱- جامع بیان العلم ج ۱/۱۲

۲۲- فیض القدیر ج ۴/۱۱۷

۲۳- احیاء علوم الدین کی تخریج میں کہا گیا ہے کہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حدیث ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔

"میں تمھارے لیے اس طرح ہوں جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کے لیے ہوتا ہے۔"

بیٹوں کے ساتھ باپ کے تعلق کو جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ رحمت و شفقت اور دلی مودت ہے۔ ایک شاگرد کو اپنے استاد سے یہی چیز محسوس ہونی چاہیے تاکہ شاگرد کو احساس ہو کہ استاد اس کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور اس کی دنیاوی و اخروی کامیابی کا شدید متمنی ہے۔ ایک استاد اپنے طلبہ کے درمیان باہمی محبت و اخوت کو یوں پروان چڑھائے جیسے ایک باپ اپنے بیٹوں کے درمیان محبت کا گہرا تعلق قائم رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سب ایک دوسرے سے محبت کرنے لگیں اور باہمی تعاون و قلبی مودت بھی اپنالیں اور ایک دوسرے سے بغض و حسد کے مرض میں مبتلا نہ ہوں۔ علمائے سلف تو اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسا ہی محبت و شفقت بھرا تعلق رکھتے تھے۔

علم حدیث میں امیر المؤمنین امام سفیان ثوری کہتے ہیں:

"اللہ کی قسم! اگر حصول علم حدیث کے لیے لوگ میرے پاس نہ آتے تو میں ان کے گھروں میں جا کر انھیں حدیث کی تعلیم دیتا۔"(۲۴)

ربیع بن سلیمان کہتے ہیں کہ مجھ سے امام شافعیؒ نے کہا:

"اگر ممکن ہوتا تو میں علم گھول کر تمھیں پلا دیتا۔"(۲۵)

ربیع کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ صحن مسجد میں ہمیں درس دے رہے ہوتے اور درس طویل ہو جانے کے باعث اس دوران ان پر دھوپ آ جاتی، قریب سے کوئی گزرنے والا کہتا: اے ابو عبداللہ! دھوپ میں بیٹھے پڑھائے جا رہے ہو؟ امام اس کا جواب شعر میں دیتے:

أُهِيْنُ لَهُمْ نَفْسِي لِأُكْرِمَهُمْ بِهَا
وَلَنْ تُكْرَمُ النَّفْسُ الَّتِيْ لَا تُهِيْنُهَا

"میں انھیں عزت دلانے کی خاطر اپنے نفس کو سختی سے دوچار کرتا ہوں۔ اور وہ نفس کبھی عزت نہیں پا سکتا جو سختی برداشت نہیں کر سکتا۔"(۲۶)

۲۴- یہ آثار ابن عبدالبر نے کتاب العلم ج ۱/۱۴۲ میں روایت کیے ہیں۔

۲۵- ایضاً

۲۶- ایضاً

نرمی و شفقت کے یہ دلائل پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ معاملات میں تنگی و تکلیف اور فرار کا رجحان پیدا کرنے کے بجائے آسانی و سہولت اور بشارت و رغبت کا ماحول پیدا کیا جائے۔ نبی کریم ﷺ جب اپنے اصحاب کو معلّمین اور رہنما و قضاۃ بنا کر دوسرے علاقوں میں بھیجتے تو اسی چیز کی تلقین کرتے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کو یمن کی طرف بھیجتے وقت فرمایا:

يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا۔ [27]

"(لوگوں کے لیے) آسانیاں پیدا کرنا، دشواریوں کا باعث نہ بننا، خوشخبریاں دینا (سختی کرکے) انھیں متنفر نہ کرنا۔"

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

اس حدیث میں عام لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنے، رعایا کے ساتھ نرمی برتنے، ان کے لیے ایمان کو محبوب و مرغوب بنانے، ان کے ساتھ سختی نہ برتنے کا حکم ہے تاکہ ان کے دل (دین) سے متنفر نہ ہو جائیں اور یہ سلوک خصوصاً ان کے ساتھ روا رکھنا ضروری ہے جنھیں اسلام قبول کیے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو۔ یا وہ بچے جو ابھی بالغ نہ ہوئے ہوں بلکہ بلوغت کے قریب ہوں (یعنی ان پر احکامِ شریعت کا نفاذ قانونی طور پر نہ ہو سکتا ہو) یہ رویہ اختیار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہو جائے اور وہ اس عقیدہ و نظریہ پر پختہ ہو جائیں۔

اس طرح انسان جب اپنے نفس کو عمل کا پابند کرنے کا عزم صمیم کر لیتا ہے تو اس کو اپنے اوپر سختی نہیں کرنا چاہیے بلکہ بتدریج نفس کو عمل کا خوگر بنانا چاہیے۔ یہاں تک کہ اس کا نفس عمل سے مانوس ہو جائے اور اس پر مداومت اختیار کرنا شروع کر دے۔ اس کے بعد انسان اس کو اگلے مرحلے میں داخل کرے اور عمل کا پہلے سے زیادہ بوجھ اس پر ڈالے، یہاں تک کہ وہ اس قدر اس پر عمل کا بار ڈال سکتا ہے جس قدر اس میں برداشت کی ہمت و طاقت ہے لیکن یاد رہے کہ آدمی اپنے آپ کو ایسے کام کا پابند نہ بنائے جس کو ادا کرنے سے وہ عاجز ہو یعنی یہ اس کے بس میں نہ ہو۔" [28]

۲۷- متفق علیہ

۲۸- فتح الباری ج ۱۶ ص ۲۸۶ ط حلبی

ایک دوسری حدیث میں ہے:

عَلِّمُوا وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَ بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا وَإِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ (۲۹)

''لوگوں کو علم سکھاؤ (لیکن) آسانی پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو، (لوگوں کو) خوش رکھو انھیں متنفر نہ کرو اور جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وہ خاموش رہے۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

عَلِّمُوا وَلَا تُعَنِّفُوا فَإِنَّ الْمُعَلِّمَ خَيْرٌ مِنَ الْمُعَنِّفِ (۳۰)

''لوگوں کو تعلیم دو اور سختی نہ کرو کیوں کہ تعلیم دینے والا سختی کرنے والے سے بہت بہتر ہے۔''

کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی نہیں۔ اللہ تو ہر کام میں نرمی ہی کو پسند فرماتا ہے اور جو بدلہ و جزا اللہ ایک نرم رویہ شخص کو دے گا وہ سخت و درشت خو کو نہیں ملے گا۔ اور آسانی اور نرمی کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی کام میں آ جاتی ہے تو اسے چار چاند لگا دیتی ہے اور شدت و سختی کا معاملہ یہ ہے کہ جونہی کسی کام میں در آئی اس کو بدنما و بدصورت بنا ڈالتی ہے اور تعلیم کا عمل تو سب کاموں میں اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس میں نرمی اختیار کی جائے۔ علماء پر واجب ہے جیسا امام ماوردی نے کہا ہے کہ وہ طالب علم کے ساتھ سختی نہ کریں، اس کو جوانی

۲۹- احمد نے اس کو روایت کیا ہے۔ بخاری نے الادب المفرد میں حدیث ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ سیوطی نے اس کی صحت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن مناوی نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں لیث بن ابو سلیم مدلس ہے۔ مسلم نے اس سے روایت نہیں کی الّا یہ کہ مقرون لغیرہ ہو۔ دیکھیے: فیض القدیر ج ۴/ ۳۲۸ حدیث ۵۴۸۰

۳۰- اس حدیث کو حارث بن ابو اسامہ نے اپنی مسند میں تحریر کیا ہے، ابن عدی اور بیہقی نے بھی شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ اس میں ایک راوی منکر حدیث ہے لیکن زرکشی نے حدیث ابوموسیٰ ''یسرا ولا تعسرا'' کو اس کے شواہد میں ذکر کیا ہے۔

میں پہنچ کر تعلیم حاصل کرنے پر حقیر نہ جانیں، کسی نو آموز کو کمتر نہ سمجھیں، کیوں کہ یہی طالب علم سب سے بڑھ کر ان کی طرف آنے اور مائل ہونے والا ہے، اور اسی طالب علم کو اس چیز میں رغبت ہے جو اُن کے پاس ہے۔"(۳۱)

نبی اکرم ﷺ علم سیکھنے والوں کے ساتھ سب سے زیادہ نرمی برتنے والے اور ان پر درشتی و سختی کرنے میں سب سے زیادہ دور رہنے والے تھے۔ یہی چیز ہے جس کو قرآنِ حکیم نے آپؐ کے اخلاقِ عالیہ میں بیان فرمایا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔[آلِ عمران:۱۵۹]

"(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے۔ ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ اِن کے قصور معاف کردو، اِن کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔"

دورِ رسالت مآب میں دیہات سے کوئی آدمی آتا ہے اور دور سے ہی درشت الفاظ میں محض آپ کا اسم گرامی پکارتا ہے، بسا اوقات تو یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کو راہ چلتے ہوئے وہ ٹھہرا لیتا ہے لیکن آپؐ اس سب کچھ کو اپنے حلم اور اخلاقِ حسنہ سے برداشت کرتے ہیں اور اسے اس کے سوال کا جواب دیتے ہیں۔ بلکہ اس کے اکثر سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ اس پر آپؐ کے صحابہؓ اس شخص کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس کو آداب کے دائرے میں رکھیں لیکن آپؐ صحابہؓ کو روک دیتے ہیں اور اس شخص کو سکون و اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ روایت کرتے ہیں:

اِنَّ اَعْرَابِيًّا عَرَضَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ هُوَ فِيْ سَفَرِهٖ فَاَخَذَ بِخِطَامِ نَاقَتِهٖ اَوْ بِزِمَامِهَا ثُمَّ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْ يَا مُحَمَّدُ! اَخْبِرْنِيْ بِمَا

۳۱- فیض القدیر ج ۱/ ۳۲۸

يُقَرِّبُنِي مِنَ الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُنِي عَنِ النَّارِ قَالَ: فَكَفَّ النَّبِيُّ ﷺ ثُمَّ قَالَ: لَقَدْ هُدِيَ قَالَ: كَيْفَ قُلْتَ؟ فَأَعَادَهَا: فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا، وَ تُقِيمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصِلَ الرَّحِمَ. دَعِ النَّاقَةَ"(۳۲)

''رسول اللہ ﷺ سفر میں تھے کہ ایک اعرابی راستے میں آ کھڑا ہوا، آپ کی اونٹنی کی مہار پکڑ لی اور یا رسول اللہ یا یا محمد کہہ کر مخاطب کیا: مجھے وہ بات بتاؤ جو مجھے جنت کے قریب اور جہنم سے دور کر دے۔ راوی کہتے ہیں۔ آپؐ خاموش رہے، پھر صحابہؓ کی طرف دیکھا اور کہا: یہ شخص ہدایت پا گیا۔ اس شخص نے کہا: آپ نے یہ بات کیسے کہہ دی (کہ یہ ہدایت پا گیا ہے)؟ آپؐ نے دوبارہ وہی الفاظ کہے۔ پھر فرمایا: ''اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رشتہ داری گانٹھ کے رکھو۔ جاؤ! اب اونٹنی کو چھوڑ دو۔''

نرمی کی مزید مثالیں ''غلطی کرنے والے پر خصوصی شفقت کرنا'' کے زیر عنوان آگے آ رہی ہیں۔

یہاں دورانِ تعلیم میں بچے کو پیٹنے اور اس پر چھڑی استعمال کرنے کا مسئلہ خصوصاً چھوٹے بچوں کو پیٹنے کا مسئلہ تو بہت اہم ہے۔ دورِ حاضر میں عمل تربیت کے ماہرین تو بچے کو پیٹنے کے قطعاً خلاف ہیں۔

درحقیقت ''مار پیٹ'' کو ممنوع ہی ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ تو اس رفق و نرمی کے منافی ہے جس کو ہم بیان کر رہے ہیں۔

اس ضمن میں معلّم اول رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے منارۂ نور ہیں۔ آپؐ کے خادم حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ''آپؐ نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی (زندہ) چیز کو ضرب نہیں لگائی۔ نہ کسی عورت کو، نہ خادم کو اور نہ کسی جانور کو۔''(۳۳)

۳۲- بخاری اور مسلم نے اس کو روایت کیا ہے اور یہ لفظ مسلم کے ہیں: دیکھیے: ترغیب حدیث ۳۶۳۵

۳۳- بخاری اور دیگر نے روایت کیا ہے۔

اسلام نے ایک مقام کے علاوہ کہیں بچوں کو پیٹنے کی اجازت نہیں دی، جس کے بارے میں حدیث آئی ہے کہ بلوغت سے قبل بچوں کو نماز کا عادی بنایا جائے تاکہ وہ اس کی ادائیگی و حفاظت پر سختی سے کاربند رہیں۔ حدیث ہے:

مُرُوْهُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِيْنَ۔ (34)

"انھیں (بچوں کو) نماز پڑھنے کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور انھیں (نماز نہ پڑھنے پر) پیٹو جب وہ دس سال کے ہو جائیں۔"

دیکھیے حدیث سن طفولیت میں مار پیٹ کی اجازت نہیں دے رہی بلکہ دس سال کی عمر میں اس کی اجازت دی جا رہی ہے۔ اور حدیث میں مارنے پیٹنے کی اجازت بھی تب ہے جب تین برس تک بچوں کو نماز پڑھنے کی دعوت و ترغیب اور حکم دیا جا چکا ہو۔

اس اجازت کا مقصد بچے کو معاملے کی اہمیت کا احساس دلانا اور باپ کو اس کا حریص بنانا مطلوب و مقصود ہے یعنی نماز کی اس قدر اہمیت بتاتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی غفلت نہ در آئے۔

ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے، باپ بیٹے کو عام انداز میں کہتا ہے "بیٹا نماز پڑھ لو" لیکن بعد میں پوچھتا نہیں کہ بیٹے نماز پڑھی ہے یا نہیں۔ باپ کا حکم مانا ہے یا سنی ان سنی کر دی ہے! جس طرح ایک سمجھدار باپ یہ بات پسند نہیں کرتا کہ اس کا بیٹا دنیاوی معاملات میں اس کی حکم عدولی کرے، دینی معاملات میں بھی اس کا یہی موقف ہونا چاہیے۔

چونکہ استاد باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا جس طرح بعض معاملات و امور میں سختی باپ کے لیے جائز ہوتی ہے ایک استاد کے لیے بھی ہو سکتی ہے لیکن یاد رہے کہ یہ بنیادی اُصول میں ایک استثنائی صورت ہے کوئی عام حکم و اجازت نہیں اور ایسا بوقت ضرورت معاملہ کی نوعیت کے مطابق ہی کیا جا سکتا ہے۔

نبی اکرمؐ نے جس طرح خاوندوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

34۔ احمد، ابوداؤد اور حاکم نے اس کو حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کیا ہے اور امام نووی نے ریاض الصالحین میں اسے حسن کہا ہے۔ دیکھیے: فیض القدیر ج 5/521

لَنْ يَضْرِبَ خِيَارُكُمْ "تم میں سب سے بہترین آدمی تو ہرگز (بیوی کو) نہیں پیٹتا۔"

ہم کہتے ہیں کہ والدین و اساتذہ کے لیے بھی یہی حکم ہونا چاہیے کہ

لَنْ يَضْرِبَ خِيَارُكُمْ. "تم میں سے اچھا (استاد) مار پیٹ سے کام نہیں لیتا۔"

۵- غلطی کرنے والے پر خصوصی شفقت کرنا

شاگرد کے ساتھ نرمی کا یہ سلوک "غلطی کرنے والے پر خصوصی شفقت" کے زیر عنوان تو اور زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ کسی سے غلطی ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ سختی و درشتی اور تشنیع و تضحیک کا رویہ واجب ہو گیا ہے۔ یہ چیز تو اس کی خودی کی تذلیل کرنے اور اس کی شخصیت کو کچل ڈالنے کی جانب لے جاتی ہے اور یہ چیز دینی و اخلاقی اعتبار سے قتل جیسے مذموم فعل کی ایک قسم ہے۔ اس طرح کے رویے کے ردعمل میں وہ دفاع نفس کی خاطر غلط کو جائز سمجھتے ہوئے اپنی غلطی پر اصرار کرتا ہے، باطل میں ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے اور حق کو چیلنج کرنے کی جسارت سے بھی باز نہیں آتا۔ بہرحال جو بھی کیفیت ہو دونوں صورتوں میں خطر و ضرر کا اندیشہ بہت شدید ہے۔

متعلمین جب غلطی کرتے ہیں تو ان کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ عظیم نمونہ ہیں اور آپؐ ہی وہ شخصیت ہیں جو ظروف و احوال کی رعایت کرتے ہیں اور آپ کا یہ سلوک کسی ایک شخص یا قبیلہ و قوم سے مخصوص نہیں بلکہ وہ اجڈ بدو بھی آپؐ کے اس حسن سلوک اور کریمانہ و مشفقانہ رویے کا حقدار ٹھہرتا ہے جس نے تمام لوگوں کے سامنے مسجد کے صحن میں پیشاب کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی تھی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے:

"بَيْنَمَا نَحْنُ فِي الْمَسْجِدِ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، إِذْ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ، فَقَامَ يَبُولُ فِي الْمَسْجِدِ، فَقَالَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مَهْ مَهْ. قَالَ: رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ "لَا تُزْرِمُوهُ دَعُوهُ" فَتَرَكُوهُ حَتّٰى بَالَ، ثُمَّ إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لَهُ إِنَّ هٰذِهِ الْمَسَاجِدَ لَا تَصْلُحُ لِشَيْءٍ مِنْ

هٰذَا الْبَوْلِ وَلَا الْقَذْرِ اِنَّمَا هِیَ لِذِکْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ أَوِالصَّلٰوۃِ، وَقِرَاءَ ۃِ الْقُرْاٰنِ" اَوْکَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فَاَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَجُلًا مِنَ الْقَوْمِ، فَجَاءَ بِدَلْوٍ مِنْ مَاءٍ فَشَنَّهُ عَلَيْهِ"(۳۵)

''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اعرابی آیا اور مسجد میں پیشاب کرنا شروع ہو گیا، اصحابِ رسولؐ نے (اس کی یہ جرأت دیکھ کر) کہا: شرم کر، شرم کر (حضرت انسؓ کہتے ہیں) اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کو کچھ نہ کہو، تو صحابہؓ نے اسے چھوڑ دیا حتیٰ کہ وہ پیشاب سے فارغ ہو گیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کو مخاطب کر کے فرمایا: یہ مساجد ہیں یہ پیشاب پاخانہ کے لیے نہیں ہوتیں، یہاں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، یا نماز پڑھی جاتی ہے، یا قرأتِ قرآن کی جاتی ہے۔'' او کما قالؐ، حضرت انسؓ کہتے ہیں پھر رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو حکم دیا تو وہ پانی کا ایک ڈول لایا اور اس (پیشاب) کے اوپر بہا دیا۔''

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں:

دَخَلَ أَعْرَابِیٌّ الْمَسْجِدَ وَ النَّبِیُّ ﷺ جَالِسٌ، فَصَلّٰی، فَلَمَّا فَرِغَ قَالَ: اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَ مُحَمَّدًا، وَلَا تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا، فَالْتَفَتَ اِلَیْهِ النَّبِیُّ ﷺ فَقَالَ: "لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا" فَلَمْ یَلْبَثْ أَنْ بَالَ فِی الْمَسْجِدِ فَأَسْرَعَ النَّاسُ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: "أَهْرِقُوا عَلَیْهِ سَجْلًا مِنْ مَاءٍ. أَوْ دَلْوًا مِنْ مَاءٍ. ثُمَّ قَالَ: اِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ، وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ"(۳۶)

''ایک اعرابی مسجد میں داخل ہوا اور نبیؐ بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ اعرابی نے نماز پڑھی جب فارغ ہوا تو دعا کرنے لگا: اللہ میرے اور محمد ﷺ کے

۳۵- مسلم حدیث ۲۸۵ باب ۳۔ کتاب الطہارۃ ج ا تحقیق محمد فواد عبدالباقی

۳۶- اسے ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور کہا ہے: حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھیے: سنن ترمذی ج ا باب ۱۱۲

علاوہ کسی پر رحم نہ فرما۔ یہ سن کر نبیؐ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا: تو نے اللہ کی وسیع رحمت کو محدود اور تنگ بنا دیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مسجد میں پیشاب کرنا شروع کر دیا تو لوگ جلدی سے اس کی جانب لپکے لیکن نبیؐ نے فرمایا (اس کو چھوڑ دو) اس پیشاب پر پانی کا ایک مٹکا یا ڈول بہا دو، پھر فرمایا: تم آسانیاں پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو تنگیاں پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔"

نبی اکرمؐ نے اس آدمی کے دیہاتی پن، بود و باش اور رہن سہن کے طور و اطوار کو مدنظر رکھا اور صحابہؓ کو اس پر ٹوٹ پڑنے اور حملہ آور ہونے کی اجازت نہیں دی، بلکہ صحابہؓ کو یہ سکھایا کہ اس کا علاج تو بہت سہل ہے، چونکہ مسجد میں کنکریوں کا فرش ہے لہٰذا پانی کا ایک ڈول بہا دیا جائے نجاست دور ہو جائے گی، پھر آپؐ نے لوگوں کو اُن کی اس ذمہ داری کی نوعیت اور کیفیت بھی بتائی کہ تمھاری دعوت کا تقاضا آسانی پیدا کرنا ہے، مشکل و دشواری کھڑا کرنا نہیں۔

حضرت ابوامامہ روایت کرتے ہیں کہ:

أَنَّ فَتًى مِنْ قُرَيْشٍ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ائْذَنْ لِي فِي الزِّنٰى؟ فَأَقْبَلَ الْقَوْمُ عَلَيْهِ وَ زَجَرُوْهُ فَقَالَ: ﷺ اُدْنُهْ: فَدَنَا فَقَالَ: أَتُحِبُّهُ لِأُمِّكَ؟ قَالَ: لَا وَ اللّٰهِ، جَعَلَنِي اللّٰهُ فِدَاكَ: قَالَ وَلَا النَّاسُ يُحِبُّوْنَهُ لِأُمَّهَاتِهِمْ. ثُمَّ قَالَ لَهُ مِثْلَ ذٰلِكَ فِي اِبْنَتِهِ وَأُخْتِهِ وَعَمَّتِهِ، وَ خَالَتِهِ. وَ فِي كُلِّ ذٰلِكَ يَقُوْلُ: أَتُحِبُّهُ هٰكَذَا؟ فَيَقُوْلُ: لَا وَ اللّٰهِ، جَعَلَنِي اللّٰهُ فِدَاكَ! فَيَقُوْلُ ﷺ: وَلَا النَّاسُ يُحِبُّوْنَهُ: ثُمَّ وَضَعَ يَدَهُ عَلَيْهِ وَ قَالَ: "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ ذَنْبَهُ، وَ طَهِّرْ قَلْبَهُ، وَ حَصِّنْ فَرْجَهُ" فَلَمْ يَكُنْ بَعْدَ ذٰلِكَ يَلْتَفِتُ إِلٰى شَيْءٍ[۳۷]

"قریش کا ایک جوان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یارسول اللہ ﷺ مجھے زنا کی اجازت دے دیجیے! یہ سن کر سارے لوگ اس

۳۷- احمد اور طبرانی نے کبیر میں روایت کیا ہے۔ جیسا کہ جمع الفوائد و اعذب الموارد حدیث ۲۴۰ میں ہے۔

کی جانب متوجہ ہو گئے اور اسے زجر و توبیخ کرنے لگے۔ (مگر) نبیؐ نے اس سے فرمایا: قریب ہو جاؤ! وہ آپؐ کے قریب ہو گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''کیا تو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ تیری ماں کے ساتھ یہ فعل ہو؟'' اس نے کہا اللہ مجھے آپؐ پر قربان کرے۔ اللہ کی قسم! میں تو یہ پسند نہیں کرتا! تو آپؐ نے فرمایا: ''لوگوں کو بھی یہ پسند نہیں ہے کہ ان کی ماؤں کے ساتھ ایسا ہو'' پھر آپؐ نے یہی بات اس کی بیٹی، بہن، پھوپھی اور خالہ کے بارے میں بھی دریافت کی اور ہر ایک کے ساتھ آپؐ اسے پوچھتے رہے کہ کیا تجھے ایسا پسند ہے؟ تو وہ کہتا رہا: اللہ مجھے آپؐ پر قربان کرے، اللہ کی قسم! یہ تو مجھے ہرگز پسند نہیں، پھر آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کو بھی یہ بات پسند نہیں ہے۔'' اس کے بعد آپؐ نے اس کے اوپر اپنا دست مبارک رکھا اور اس کے لیے دعا فرمائی: اے اللہ! اس کا گناہ معاف فرما! اس کا دل پاک کر دے اور اس کی شرم گاہ (زنا سے) محفوظ کر دے!۔'' اس واقعہ کے بعد اس جوان نے کبھی کسی کی طرف ایسی نظر سے نہیں دیکھا۔''

یہ ایک ایسا جوان تھا جس کی شہوت بڑی شدید اور قوتِ باہ جوش مار رہی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے عورت کی حیران کن حد تک ضرورت تھی اور اس کی اس حیران کن طلب ہی نے تو حاضرین کو اس کے اوپر کود پڑنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن رسول اللہؐ اس کو بڑی عجیب و غریب رفق و نرمی سے ملتے ہیں اور اس سے ایسی پرسکون اور دھیمی گفتگو فرماتے ہیں جس کے اندر مطمئن کر دینے والی منطق اور شیریں روح بھری ہوئی تھی۔ پھر دیکھیے کہ آپؐ اس گفتگو کا اختتام اس کے بھڑکتے ہوئے دل پر اپنے دست مبارک کے محبت بھرے لمس کے ساتھ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ اللہ نوجوان کے گناہ معاف فرما دے اور اس کو پاک و محفوظ بنا دے۔ پھر جب یہ نوجوان مجلس رسولؐ سے باہر نکلتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ ملاقات شہوت کی آگ کے لیے ٹھنڈک و سلامتی بن گئی ہے۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس نوجوان کے دل پر نبی کریمؐ کے رویہ و سلوک کا جو اثر ہوا ہے وہ کوئی معجزہ تھا جو نبیؐ ہی سے ظاہر ہو سکتا تھا اور آپؐ کے بعد کرامات و خوارق عادت کے طور

پر ہی ان کا ظہور ہو سکتا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہر وہ استاد جو خدا شناس و خدا خوف ہو، سنت رسولؐ پر عمل پیرا ہو۔ آپؐ کے عادات وشمائل قولی، عملی اور باطنی طور پر آپ کی اقتدا کرتا ہو۔ وہ اللہ کی توفیق سے ایسا ہی اثر یا اس کے قریب قریب تاثیر پا سکتا ہے۔

غلطی کرنے والوں میں نرمی کے سب سے زیادہ مستحق وہ افراد ہوتے ہیں جو جہالت و غفلت یا کسی کمزوری کے باعث غلطی کے مرتکب ہو بیٹھیں، یا پھر وہ شخص نرمی کا زیادہ حقدار ہے جس سے پہلی دفعہ غلطی سرزد ہو۔ جیسا کہ اوپر بدو اور قریشی نوجوان کی مثال ذکر ہوئی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا حلم و رفق ان لوگوں پر بھی بدستور ہے جن سے ارادہ و نیت کے ضعف یا عادت سے مجبور ہونے کی بنا پر بار بار غلطی کا ارتکاب ہوتا ہے۔ آپؐ ان غلط کاروں کو ایمان و مؤمنین کے دائرے سے خارج نہیں کرتے بلکہ ان کے برے فعل پر ان کے ساتھ بہترین سلوک کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے ان کا ضمیر بیدار ہو جائے اور وہ اپنی اس گمراہی سے باز آ جائیں اور جس گراوٹ میں گر پڑے ہیں اس سے اوپر اُٹھ جائیں۔

شفقت و نرمی کے حوالے سے ہمیں اس صحابیِ رسول کے واقعہ سے زیادہ بہتر مثال کس کی ملے گی جو شراب کا مبالغہ آمیز حد تک دلدادہ تھا۔ اس کو کئی بار کوڑے بھی لگائے گئے لیکن وہ اس فعل سے باز نہ آیا۔ حتیٰ کہ صحابہؓ میں سے کسی نے ایک دن کہہ دیا۔ اس گناہ کی کثرت سے اس کا سینہ تنگ ہو گیا ہے۔ اس کثرتِ گناہ کے باعث ہو سکتا ہے اللہ نے اس کو ملعون قرار دے دیا ہو؟ صحابیؓ کی بات سن کر رحمت محمدیؐ یوں جوش مارتی اور شفقت نبویؐ یوں بلند ہوتی ہے: ''لَا تَكُنْ عَوْنًا لِلشَّيْطَانِ عَلٰى اَخِيْكَ'' اپنے بھائی کے خلاف بات کر کے شیطان کی معاونت نہ کر یا فرمایا ''لَا تَكُوْنُوْا عَوْنًا لِلشَّيْطَانِ عَلٰى اَخِيْكُمْ'' اپنے بھائی کے خلاف بات کر کے شیطان کی معاونت نہ کرو۔ ایک روایت میں ہے ''لَا تَلْعَنْهُ فَاِنَّهُ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ'' اس پر لعنت نہ بھیج وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کا دم بھرتا ہے۔ (۳۸)

۶۔ غلطی کے مرتکب کو غلطی پر متنبہ کرنا

یہاں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ غلطی کرنے والے کے ساتھ ایسی نرمی اختیار کرنا کہ اس

۳۸۔ دیکھیے: فتح الباری، کتاب الحدود

کو بالکل کچھ نہ کہا جائے یا اسے نظر انداز کیا جائے۔ یہ رویہ تو اسے غلطی پر پکا کرنے اور دوبارہ اس کا مرتکب ہونے اور پھیلانے کا باعث ہوگا۔ خطا کار کو اس کی خطا پر تنبیہ کرنا شفقت و نرمی کے ہرگز منافی نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ غلط کار کے حالات کی نوعیت کیا ہے، کتنی دیر سے یہ غلطی کا بار بار مرتکب ہو رہا ہے اور کتنی بار اسے اس سے روکا جا چکا ہے، ان تمام چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کو ڈانٹنا بھی چاہیے اور بہترین اسلوب کے ساتھ درست کام کی طرف اس کی رہنمائی بھی کرنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعرابی کو پیشاب کرنے کے دوران اٹھایا نہیں بلکہ بعد میں پانی کی بالٹی بہا دینے کا حکم فرمایا اور اپنے صحابہؓ سے فرمایا: إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ ''تم آسانیاں پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو۔'' اور اعرابی کو بلا کر فرمایا: إِنَّ هٰذِهِ الْمَسَاجِدَ لَا تَصْلُحُ لِشَيْءٍ مِنْ هٰذَا الْبَوْلِ وَلَا الْقَذَرِ، إِنَّمَا هِيَ لِذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالصَّلَاةِ وَ قِرَاءَةِ الْقُرانِ ''یہ مساجد ہیں، یہاں پیشاب پاخانہ نہیں کیا جاتا یہ تو اللہ کا ذکر کرنے، نماز پڑھنے اور قرآن کی قرأت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔''

اس ارشادِ رسولؐ میں جیسا کہ امام نووی نے کہا ہے: ایک جاہل آدمی کے ساتھ نرمی برتنے اور اس کو کوئی سزا دیے بغیر ضروری تعلیم دینے کا اشارہ ہے۔

جب اعرابی نے دعا کرتے ہوئے کہا کہ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِي وَ مُحَمَّدًا وَلَا تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا ''اے اللہ! میرے اور محمد کے اوپر رحمت نازل فرما، ہمارے علاوہ کسی اور پر رحمت نہ بھیج۔'' تو اس پر بھی نبی کریمؐ نے نرمی و شفقت کے ساتھ اس کو متنبہ کیا کہ اس نے ایک وسیع چیز کو تنگ کرنے کی کوشش کی ہے کہ رحمت کی دعا صرف اپنے لیے اور رسولؐ کے لیے ہی مانگی ہے اور دوسروں کو اس سے محروم رکھنے کی دعا کی ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہر چیز پر محیط ہے، اسی لیے تو آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے: لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا ''تو نے ایک وسیع چیز کو محدود کر کے رکھ دیا ہے۔''

بعض اوقات یہ تنبیہ یا رہنمائی یا ڈانٹ اشارے کنائے میں ہوتی ہے، واضح نہیں ہوتی اور عام انداز میں ہوتی ہے کسی کو مخصوص کر کے مخاطب نہیں کیا جاتا لیکن غلطی کرنے والا جب یہ عام الفاظ بھی سنتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ مخاطب وہی ہے۔ مثلاً نبیؐ نے فرمایا تھا: مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَفْعَلُوْنَ كَذَا وَكَذَا ''کچھ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کرتے ہیں۔ اگرچہ یہاں کسی کا

نام نہیں لیا گیا لیکن جن لوگوں کو سنانا مقصود تھا وہ آپ کا مدعا سمجھ گئے تھے۔ یا اس آدمی کی مثال لے لیجیے جس نے ایک عورت سے محبت کی بنا پر مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی۔ بعض صحابہؓ نے تو اس کو ''مہاجرام قیس'' کہہ دیا تھا۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ مشہور حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ اِنَّمَا لِكُلِّ امْرِيءٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى الدُّنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِمْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ[۳۹] کے وارد ہونے کا سبب یہی شخص بنا تھا۔

ہاں! غلطی پر تنبیہ میں نرمی کا پہلو بھی ہونا چاہیے اور غلطی کرنے والے کی سمجھ بوجھ کا خیال بھی رہنا چاہیے۔ جیسا کہ ابو بکرہؓ کے واقعہ میں آتا ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے تو رسول اکرمؐ رکوع میں تھے۔ ابو بکرہ نے بھی مسجد میں داخل ہوتے ہی اللہ اکبر کہا اور رکوع میں چلے گئے اور حالت رکوع میں ہی چلتے چلتے صف تک پہنچ گئے، حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسجد میں داخل ہوتے ہی اللہ اکبر کہہ کر نماز میں نہ چلے جاتے بلکہ صف تک پہنچتے اور پھر نماز میں داخل ہوتے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصًا وَلَا تَعُدْ[۴۰] ''اللہ تیری اس حرص میں اضافہ فرمائے مگر آئندہ ایسا نہ کرنا۔''

رسول اللہ ﷺ کا یہ مختصر جملہ دعا اور ممانعت دونوں پر مشتمل ہے۔ دعا کے اندر اس فضیلت و کمال کی طرف اشارہ ہے جس نے صحابیؓ کو ایسا کرنے پر اکسایا۔ یہ فضیلت و کمال صحابیؓ کی حرص ہے کہ نبیؐ کے ساتھ جماعت میں اس کی رکعت فوت نہ ہو جائے اور ممانعت میں یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ یہ اس کا غلط فعل ہے دوبارہ اس کا اعادہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں لَا تَعُدْ (دوبارہ ایسا نہ کرنا) فرمایا ہے أَخْطَأْتَ (تم نے غلط کیا ہے) نہیں فرمایا۔

حضرت معاویہ بن حکم سلمیؓ روایت کرتے ہیں:

بَيْنَمَا اَنَا اُصَلِّي مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِذْ عَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ، فَقُلْتُ: يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، فَرَمَانِي الْقَوْمُ بِاَبْصَارِهِمْ! فَقُلْتُ: وَاثُكْل

۳۹- فتح الباری میں بخاری کی پہلی حدیث ملاحظہ کیجیے!

۴۰- احمد، بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے نماز کے ذکر میں اس کو بیان کیا ہے۔ جیسا کہ جامع الصغیر حدیث ۴۵۵۱ میں ہے۔

أُمَّاهُ مَا شَأْنُكُمْ تَنْظُرُوْنَ إِلَيَّ؟ فَجَعَلُوْا يَضْرِبُوْنَ بِأَيْدِيْهِمْ عَلٰى أَفْخَاذِهِمْ فَلَمَّا رَأَيْتُهُمْ يُصَمِّتُوْنَنِي، لٰكِنِّي سَكَتُّ فَلَمَّا صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ. فَبِأَبِي هُوَ وَ أُمِّي! مَا رَأَيْتُ مُعَلِّمًا قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ أَحْسَنَ تَعْلِيْمًا مِنْهُ، فَوَ اللّٰهِ مَا كَهَرَنِي، وَلَا ضَرَبَنِي وَلَا شَتَمَنِي قَالَ: إِنَّ هٰذِهِ الصَّلَاةَ لَا يَصْلُحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ إِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيْحُ وَ التَّكْبِيْرُ، وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ. أَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ، قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ: إِنِّي حَدِيْثُ عَهْدٍ بِهٖ وَقَدْ جَاءَ اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ. وَإِنَّ مِنَّا رِجَالًا يَأْتُوْنَ الْكُهَّانَ؟ قَالَ: فَلَا تَأْتِهِمْ. قُلْتُ: وَ مِنَّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُوْنَ قَالَ: ذٰلِكَ شَيْءٌ يَجِدُوْنَهُ فِي صُدُوْرِهِمْ، فَلَا يَصُدَّنَّهُمْ (۴۱)

''میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (قریب) نماز ادا کر رہا تھا کہ کسی آدمی نے چھینک دی، اس پر میں نے یرحمک اللہ کہا تو لوگوں نے (منع کرنے کے انداز میں) مجھ پر نظریں ڈالیں، میں نے ان سے کہا اس کی ماں گم ہو تمھیں کیا ہو گیا کہ میری طرف دیکھے جا رہے ہو؟ اس کے بعد لوگ (مجھے متوجہ کرنے کے لیے) اپنی رانوں پر ہاتھ مارنے لگے، جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ مجھے خاموش کرا رہے تھے لیکن میں پہلے ہی خاموش ہو چکا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز مکمل کر چکے۔ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں میں نے آپ سے قبل اور بعد ایسا بہترین معلم نہیں دیکھا جو اس قدر عمدہ طریق سے تعلیم دیتا ہو۔ اللہ کی قسم نہ آپؐ نے مجھے ڈانٹا، نہ مارا اور نہ برا ہی کہا بلکہ فرمایا: یہ نماز ہے اس میں لوگوں سے کلام کرنا درست نہیں۔ یہ تو تسبیح و تکبیر اور قرأت ہے۔ او کما قالؐ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں نیا نیا اسلام لایا ہوں، ہم میں سے کچھ لوگ کاہنوں کے پاس جاتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ''تم اُن کے پاس نہ جاؤ'' میں نے عرض کیا: ہم میں سے کچھ لوگ بدشگونی لیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: یہ ان کے دلوں کا خیال ہے، یہ چیز ان کی راہ کی رکاوٹ نہیں بن سکتی!۔''

۴۱- مسلم نے اسے روایت کیا ہے، حدیث ۵۳۷

اسلام کی زیادہ معلومات نہ رکھنے والا یہ اعرابی ابھی ابھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ وہ نماز میں بھی ایسا ہی شغل کر رہا تھا جو عام مجلسوں میں ہوتا ہے۔ وہ چھینک لینے والے کو جواب دیتا ہے، اپنے آس پاس لوگوں سے محو گفتگو ہے، جو اس گفتگو کو ناپسند کرتے ہیں ان کو بھی تعجب سے دیکھتا ہے، جب کہ صحابہؓ اس کے اس سارے عمل کو دیکھ رہے ہیں اور وہ آنکھوں کے اشاروں اور ہاتھوں کی حرکات سے اس کو متنبہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ اپنی غلطی پر متنبہ نہیں ہو رہا۔ حتیٰ کہ وہ نماز سے فارغ ہو جاتا ہے اور صحابہؓ رسول اللہ ﷺ سے اس کے اس طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہیں، اب یہاں خطا کار کو متنبہ کرنے، اس کی خطا کا علاج کرنے اور مبتدئین کو تعلیم دینے کے لیے معلم کی حقیقی روح اور رفیق و رقیق اسلوب واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو ایک اَن پڑھ آدمی نے اپنی فطری بصیرت کے ساتھ محسوس کیا اور بڑے زور دار و بلیغ الفاظ میں یوں بیان کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں۔ میں نے آپؐ سے پہلے اور آپؐ کے بعد آپؐ سے بہتر تعلیم دینے والا کوئی معلم نہیں دیکھا۔ اللہ کی قسم! نہ آپ نے مجھے ڈانٹا، نہ مارا اور نہ برا کہا۔

رسول اکرمؐ نے اس آدمی کے ساتھ جو کچھ کیا گویا آپؐ نے اس کو اس کی غلطی پر متنبہ کر دیا لیکن یہ نہ کہا کہ تو نے غلطی کی ہے یا برا کام کیا ہے اور نہ نماز کے کوئی آداب واقدار بیان کیے اور نہ ایسے ہی کوئی اور سخت جملے بولے۔ آپؐ نے نماز کی حقیقت اس کے سامنے بیان کر دی اور بتایا کہ نماز میں گفتگو نہیں کی جاتی۔

دراصل حقیقی اساتذہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

معلمین کے لیے اُس واقعہ میں بھی سبق ہے جس میں نبی اکرمؐ نے اپنی ازواج کو اختیار دیا تھا کہ وہ چاہیں تو دنیا کی زندگی پسند کر لیں اور چاہیں تو اس خشک و خشن زندگی کو اپنا لیں۔ قرآنِ حکیم نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَ زِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ، أُمَتِّعْكُنَّ وَ أُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا. وَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ، فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا. [الاحزاب:۲۸-۲۹]

”اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہوں تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“

نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کے حوالے سے جو حقِ تخییر دیا تھا آپؐ نے ان کے سامنے پیش کر دیا اور اس کا آغاز حضرت عائشہؓ سے فرمایا، ان کے سامنے دو صورتیں رکھ دیں کہ ایک کو اختیار کر لیں، یا اللہ و رسول اور آخرت کو منتخب کر لیں جس کا مطلب روکھی سوکھی پر گزارا اور زہد و تقشف کی زندگی کو برداشت کیے رہنا ہے۔ یا دنیا اور اس کی زیب و زینت ہے جس کا مطلب ہے کہ اچھے طریقے سے نبیؐ کے عقد سے آزاد ہو جانے اور طلاق حاصل کر لینے کا حق دیا جا رہا ہے۔ مگر آپؐ نے اس کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے یہ بھی فرمایا کہ اس بارے میں تنہا فیصلہ نہ کرنا اپنے والدین سے مشاورت کر لینا، لیکن حضرت عائشہؓ پورے یقین کے ساتھ اپنا اٹل فیصلہ سناتی ہیں کہ ”یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپؐ کے بارے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟ (یہ کیسے ہو سکتا ہے؟) بلکہ میں تو اللہ، اس کے رسول اور دارِ آخرت کو ترجیح دیتی ہوں اور اسی کو پسند و منتخب کرتی ہوں۔ اس ایمان بھری گفتگو کے بعد حضرت عائشہؓ پر بحیثیتِ انسان نسوانی فطرت غالب آگئی اور انھوں نے مطالبہ کیا کہ آپؐ ان کے اس فیصلہ کے بارے میں دوسری کسی عورت کو نہ بتائیں تاکہ وہ بھی اسی موقف کو نہ اپنا لے۔ گویا حضرت عائشہؓ یہ چاہتی تھیں کہ باقی سب ازواج دنیا و زینت دنیا کا انتخاب کر لیں اور وہ تنہا اس خوبی سے متصف ہوں اور آپؐ کی ساری توجہ بھی وہی حاصل کر لیں...... لیکن یہاں پر نبیؐ کے موقف و کردار میں عظیم تربیتی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ جب آپؐ فرماتے ہیں:

يَا عَائِشَةُ إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَبْعَثْنِي مُعَنِّتًا وَلَا مُتَعَنِّتًا وَلٰكِنْ بَعَثَنِي مُعَلِّمًا مُيَسِّرًا.[۴۲]

”اے عائشہؓ! اللہ نے مجھے تنگی اور دشواری پیدا کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا بلکہ تعلیم دینے والا اور آسانیاں پیدا کرنے والا بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔“

۴۲- مسلم نے روایت کیا ہے۔

آپؐ نے صدیقہ بنت صدیق کی اس لغزش کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان پر اپنی اس ذمہ داری کو کھول کر بیان کر دیا جس سے نہ آپؐ پہلو تہی کر سکتے تھے اور نہ وہ ذمہ داری آپؐ سے چھوٹ سکتی تھی۔ وہ ذمہ داری یہ تھی کہ آپؐ معلّم ہیں، مگر آسانی پیدا کرنے والے معلّم ہیں، سختی و ترشی کا رویہ اپنانے والے معلّم نہیں۔

علامہ مناوی کہتے ہیں: آپؐ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل تعلیم کے دقائق میں یہ بات شامل ہے کہ معلّم لطیف اور عام انداز میں غیر محسوس طریقے اور ڈانٹ ڈپٹ پلائے بغیر رحمت و شفقت کے ساتھ متعلّم کے برے اخلاق پر اس کو متنبہ کر سکتا ہے کیوں کہ بالکل سیدھا اور واضح انداز خوف کے حجاب کو پاٹ دیتا ہے اور اس کا نتیجہ مخالفت پر جرأت مندی اور غلطی پر اصرار کی صورت میں نکلتا ہے۔[۴۳]

لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے موقع پر نبی اکرمؐ حضرت عائشہؓ کو ان کی ایک خطا پر یوں زجر کرتے ہیں کہ اس ڈانٹ میں شدت کا ایسا پہلو ہے جو مذکورہ بالا صورتِ حال سے بالکل مختلف ہے۔ ہوا یوں کہ حضرت عائشہؓ نے دیگر اُمہات المؤمنین میں سے اپنی ایک سوتن حضرت صفیہؓ کے حق پر دست درازی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے کہا: آپؐ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت صفیہؓ ایسی ایسی ہے۔ بعض راوی کہتے ہیں: حضرت عائشہؓ کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کا قد چھوٹا ہے۔ بہرحال نبی اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ کے ان الفاظ پر فرمایا:

"يَا عَائِشَةُ لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ الْبَحْرِ لَمَزَجَتْهُ"[۴۴]

"عائشہ! تو نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ اگر اسے سمندر میں ملا دیا جائے تو اس کا رنگ بدل دے۔"

یعنی یہ بات یا یہ اشارہ جو مکمل طور پر صریح بھی نہیں ہے ایسا ہے کہ سمندر کی وسعت و گہرائی کے باوجود اس کے پانی کا رنگ بدل ڈالے۔ اس کے باوجود کہ حضرت عائشہؓ آپؐ کی محبوب ترین بیوی ہیں۔ آپؐ ان کو بھی غلطی پر ایسی سختی سے تنبیہ کر رہے ہیں۔

۴۳- مناوی نے اس کو فیض القدیر میں نقل کیا ہے۔

۴۴- ابوداؤد اور ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے۔ دیکھیے ترغیب حدیث ۴۰۹۲

بعض اوقات کسی رو رعایت کے بغیر اس ناپسندیدگی میں شدت آ جاتی ہے اور بڑی سخت آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی فرد کی خطا محض اس کا ذاتی اور جزئی مسئلہ نہ ہو بلکہ محمدی منہج وطریقہ سے انحراف کا آغاز ہو رہا ہو۔ جیسا کہ آپؐ نے جب حضرت عمرؓ کے پاس کوئی تحریف شدہ کتاب دیکھی تو فرمایا:

أَمُتَهَوِّكُوْنَ فِيْهَا يَابْنَ الْخَطَّابِ وَ اللّٰهِ لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ اِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي۔(۴۵)

''اے ابن خطاب کیا اب بھی اس میں کھوئے ہوئے ہو؟ اللہ کی قسم! اگر موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔''

یہی کیفیت اس وقت پیدا ہوئی جب کسی صحابیؓ نے شکایت کی کہ وہ نماز میں تاخیر کے ساتھ جماعت میں اس لیے پہنچا ہے کہ امام نماز بڑی لمبی پڑھاتا ہے۔ اتنی لمبی کہ وہ با جماعت نماز پڑھنے سے ہی بھاگ گیا ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں میں نے نبیؐ کو وعظ کے دوران اس قدر شدید غصے میں کبھی نہیں دیکھا، آپؐ نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ مُنَفِّرُوْنَ! فَمَنْ صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ. فَاِنَّ فِيْهِمُ الْمَرِيْضَ وَالضَّعِيْفَ وَ ذَا الْحَاجَةِ(۴۶)

''لوگو! تم تو (لوگوں کو دین سے) متنفر کر رہے ہو۔ جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے، اس کو چاہیے کہ وہ مختصر نماز پڑھائے۔ کیوں کہ ان میں مریض بھی ہو سکتا ہے۔ ضعیف بھی ہو سکتا ہے اور حاجت مند بھی ہو سکتا ہے۔'' (لہٰذا ان کا خیال رکھا جائے)

ناپسندیدگی کے اظہار کا لہجہ اس وقت تو اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے جب یہ انحراف کسی جماعت یا گروہ میں پیدا ہو رہا ہو۔ جیسا کہ اوس و خزرج کے جھگڑے کے موقع پر اوس نے اپنے قبیلے کو پکارا اور خزرج نے اپنے قبیلے کو، تو آپؐ نے فرمایا:

۴۵- اس کی تخریج فصل میں گزر چکی ہے۔

۴۶- بخاری نے اس کو باب الغضب فی الموعظة و التعليم إذا رأى ما يكره میں روایت کیا ہے۔

أَبِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ؟(۴۷)

کیا یہ جاہلیت کی پکار ابھی لگنا شروع ہوگئی ہے جب کہ میں تمھارے اندر موجود ہوں۔"

ان تمام مثالوں کے ساتھ آپؐ کا وہ قول بھی ملاحظہ کیجیے جو آپؐ نے تین آدمیوں سے فرمایا تھا جن میں سے ایک نے ساری رات قیام کرنے، دوسرے نے ہمیشہ روزہ رکھنے اور تیسرے نے ہمیشہ کے لیے عورت سے الگ رہنے کا عہد کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

أَمَا إِنِّي أَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَ أَتْقَاكُمْ لَهُ وَلٰكِنِّي أَقُومُ وَ أَنَامُ وَ أَصُومُ وَ أُفْطِرُ، وَ أَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي (۴۸)

(ایسا نہ کہو) میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا تقویٰ رکھنے والا ہوں، مگر اس کے باوجود قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، (نفلی) روزہ بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں اور عورتوں (بیویوں) کے حقوق بھی پورے کرتا ہوں۔ لہٰذا جو شخص میرے اس طریقۂ کار سے ہٹ کر کوئی راہ اپنائے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

ایسا ہی ایک واقعہ عمرو بن شعیب نے روایت کیا ہے وہ اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ:

"أَنَّهُ سَمِعَ قَوْمًا يَتَمَارَوْنَ فِي الْقُرْاٰنِ فَقَالَ "إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهٰذَا، ضَرَبُوْا كِتَابَ اللّٰهِ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ وَ إِنَّمَا نَزَلَ كِتَابُ اللّٰهِ يُصَدِّقُ بَعْضُهُ بَعْضًا، فَلَا تُكَذِّبُوْا بَعْضَهُ بِبَعْضٍ، فَمَا عَلِمْتُمْ مِنْهُ فَقُوْلُوْا وَمَا جَهِلْتُمْ فَكِلُوْهُ إِلٰى عَالِمِهِ."(۴۹)

"آپؐ نے ایک گروہ کو قرآن (کی بعض آیات) کے بارے میں جھگڑتے سنا تو فرمایا: تم سے پہلے لوگ اسی طرح برباد ہوئے ہیں۔ انھوں نے اللہ کی

۴۷- ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ابن اسحٰق سے ذکر کیا ہے۔
۴۸- بخاری نے روایت کیا ہے۔
۴۹- احمد نے اپنی مسند اور ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔

کتاب کے بعض حصوں کو بعض کے خلاف قرار دیا۔ جب کہ کتابُ اللہ تو اس حال میں نازل ہوئی تھی کہ اس کی ایک آیت دوسری کی تصدیق کرتی تھی۔ (خبردار!) قرآن کی ایک آیت کی بنا پر دوسری آیت کی تکذیب نہ کرو، قرآن کا جتنا علم تمھارے پاس ہے اتنی ہی بات کرو جس بارے میں علم نہیں رکھتے اس کو علماء پر چھوڑ دو" (کہ اس کی تفہیم و توضیح وہ کریں)

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ لوگ قضا و قدر کے مسئلہ پر جھگڑ رہے تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آپؐ ان کے پاس اس قدر غصے کی حالت میں گئے کہ گویا آپؐ کے چہرۂ مبارک پر انار نچوڑ دیا گیا ہو۔(۵۰) یعنی غصے کی شدت سے چہرۂ مبارک اس قدر سرخ ہو گیا تھا۔ اور جس چیز نے آپؐ کو غضبناک کیا وہ ان لوگوں کا قرآن کی آیات کو بنیاد بنا کر مناظرہ بازی میں ایک دوسرے کو لتاڑنے اور قرآن کی آیات کو ایک دوسری کے خلاف ثابت کرنے کا فعل تھا۔ یہ تو کھلم کھلا فکر و عقیدے کا فساد ہے جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کیوں کہ قرآنِ حکیم کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے اور انھیں ایک کلمہ کے تحت جمع کرنے کے لیے نازل کیا ہے اور جب یہی قرآن اختلاف و تنازع اور جھگڑوں کا میدان بن جائے تو پھر اسے بھی ایسے ثالث کی ضرورت ہوگی جو اس میں پیدا ہونے والے نزاع و اختلاف کا تصفیہ و فیصلہ کرے۔ اور جب قومیں اس مقام پر پہنچ جاتی ہیں کہ ان کے درمیان یہ کچھ ہونا شروع ہو جائے تو وہ پارہ پارہ ہو جاتی ہیں اور انحرافات و بدعات اور ذاتی خواہشات کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اسی چیز نے پہلوں کو تباہ کیا ہے اور یہی چیز اس امت کو بھی تباہ کر سکتی ہے۔ یہ تھی وجہ رسول اللہ ﷺ کے غضبناک ہونے اور لوگوں کو سختی سے ڈانٹ پلانے کی!

۷۔ حسن کارکردگی پر حوصلہ افزائی کرنا

جہاں غلطی کرنے والے کو روکنا اور نرمی و شفقت کے ساتھ اس کی رہنمائی کرنا تعلیم و تربیت کی سودمند اساسیات میں شامل ہے وہاں درست جواب دینے اور اچھی کارکردگی دکھانے والے کی حوصلہ افزائی اور تعریف و توصیف کرنا بھی ان مبادیات و اساسیات میں شامل ہے۔

۵۰۔ دیکھیے فتح الربانی جلد ۱/۱۴۲ کتاب القدر حدیث ۴۲، اس میں لکھا ہے کہ بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں کہا ہے: اس کی اسناد صحیح اور رجال ثقہ ہیں۔

تا کہ طالب علم اپنی کارکردگی میں مزید بہتری کے لیے سرگرمی دکھائے اور علم وعمل پر مزید توجہ دے اور اچھی کارکردگی کا مسلسل مظاہرہ کرے۔ نبی اکرم ﷺ کا معمول یہی تھا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ قرآنِ کریم کی بہت اچھی تلاوت کرتے تھے۔ نبیؐ نے ان سے فرمایا:

لَقَدْ اُوْتِيْتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيْرِ آلِ دَاوُدَ[51] "(اے ابوموسیٰ!) تمھیں داوُد علیہ السلام جیسی سُر عطا ہوئی ہے۔" ایک روز آپؐ نے ان سے فرمایا: لَوْ رَأَيْتَنِي وَأَنَا أَسْتَمِعُ لِقِرَاءَتِكَ الْبَارِحَةَ فَقَالَ اَبُوْمُوْسٰى: يَا رَسُوْلَ اللهِ لَوْ أَعْلَمُ أَنَّكَ تَسْمَعُهُ لَحَبَّرْتُهُ لَكَ تَحْبِيْرًا[52] "(ابوموسیٰ!) کاش تجھے معلوم ہو جاتا کہ میں گزشتہ رات تیری قرأت قرآن سن رہا تھا۔" ابوموسیٰ نے جواب میں کہا: یارسول اللہ ﷺ اگر مجھے علم ہو جاتا کہ آپؐ میری قرأت سن رہے ہیں تو میں اسے اور زیادہ خوب صورت بناتا۔"

حضرت ابی بن کعبؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (مجھ سے) پوچھا:

يَا اَبَا الْمُنْذِرِ اَتَدْرِیْ اَیُّ اٰيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللهِ مَعَكَ اَعْظَمُ؟ قُلْتُ "اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" فَضَرَبَ فِیْ صَدْرِیْ وَ قَالَ "لِيَهْنِكَ الْعِلْمُ اَبَا الْمُنْذِرِ"[53]

"اے ابوالمنذر! کیا تمھیں معلوم ہے کہ کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے زیادہ عظمت والی ہے؟" میں نے عرض کیا: "اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" (یعنی آیت الکرسی) یہ جواب سن کر آپؐ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ابومنذر! تجھے علم مبارک ہو۔"

جو شخص بھی صحیح بخاری و صحیح مسلم یا دیگر کتب حدیث کی کتاب المناقب یا کتاب الفضائل مطالعہ کرے گا۔ وہ ایسی واضح حدیثیں پائے گا جن میں نبی اکرمؐ کبھی ایک شخص کی کسی اچھی خصلت و کارکردگی کی تعریف کر رہے ہیں اور کبھی کسی گروہ یا جماعت کے اچھے کام پر ان کی تحسین فرما

۵۱- متفق علیہ: حدیث ابوموسیٰ۔ دیکھیے: ریاض الصالحین (۱۰۰۳)
۵۲- مسلم نے روایت کیا ہے۔
۵۳- دیکھیے: بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہ

رہے ہیں۔ تحسین کے یہ کلمات جو آپؐ ان لوگوں کے سامنے فرماتے تھے بناوٹی اور جعلی نہیں ہوتے تھے بلکہ احترام کے مستحق ہر شخص کے احترام و تکریم کی خاطر فرماتے تھے۔ جیسا کہ آپؐ نے ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم وغیرہ کی مختلف مواقع پر تعریف و توصیف فرمائی۔

آپؐ نے غزوۂ اُحد کے روز حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے فرمایا: اِرْمِ...... فِدَاکَ اَبِیْ وَ اُمِّیْ (۵۴) آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ تیر اندازی کرتے جائیں۔"

یمن کے لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے ساتھ ایک ایسا آدمی بھیج دیجیے جو ہمیں آپؐ کی سنت اور اسلام کا طریقہ سکھائے، آپؐ نے حضرت ابوعبیدہ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: هٰذَا اَمِیْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ(۵۵) "یہ اس امت کے امین ہیں، (انھیں ساتھ لے جائیں)۔"

آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے:

خُذُوْا الْقُرْآنَ مِنْ اَرْبَعَةٍ: مِنْ اِبْنِ اُمِّ عَبْدٍ وَ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ وَ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ وَ سَالِمٍ مَوْلٰی اَبِیْ حُذَیْفَةَ(۵۶)

"قرآن کا علم چار آدمیوں سے سیکھو: ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود)، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ۔"

جب حضرت ابوہریرہؓ نے آپؐ سے سوال کیا تھا کہ قیامت کے روز آپؐ کی شفاعت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہوگا؟ تو آپؐ نے حضرت ابوہریرہؓ کی تعریف فرمائی۔ مشہور حدیث ہے کہ جس میں آپؐ نے متعدد صحابہ کا ذکر فرمایا کہ ہر ایک کو اس کے فضائل کے ساتھ ممتاز کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا: أَرْحَمُ اُمَّتِی بِاُمَّتِیْ اَبُوْ بَکْرٍ وَ اَشَدُّهُمْ فِی اللّٰهِ عُمَرُ. "میری امت پر سب سے زیادہ رحیم ابوبکر ہیں اور اللہ کے معاملے میں سب سے سخت عمر فاروق ہیں" اسی حدیث میں ہے: اَنَّ اَقْضَاهُمْ عَلِیٌّ وَاَفْرَضُهُمْ زَیْدٌ وَ اَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ...... (۵۷) الخ "علی ان سب سے زیادہ قضا کا علم رکھتے ہیں اور زید سب سے زیادہ

۵۴- بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہؓ

۵۵، ۵۶- بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہؓ

۵۷- ترمذی نے روایت کیا ہے۔

وراثت کے مسائل جانتے ہیں اور معاذ بن جبلؓ سب سے زیادہ حلال وحرام کا علم رکھتے ہیں۔"

اسی طرح رسول اللہ ﷺ اہل علم وفضل اور امتیازی صلاحیتیں عطا کیے گئے صحابہ کی قدرو حیثیت کو بڑھا کر بیان کرتے تھے تاکہ لوگ ان کی خصوصیات سے آگاہ ہو کر ان سے مستفید ہوں اور وہ چیز حاصل کرلیں جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کر رکھی ہے۔

نبی اکرمؐ نے جس طرح حدیث میں رؤسا و امراء کے بارے میں فرمایا ہے: اَلَّذِیْ اِنْ اُحْسِنَتْ لَمْ یَشْکُرْ وَ اِنْ اُسَاْتَ لَمْ یَغْفِر[۵۸] "(اس شخص کی حالت یہ ہوتی ہے کہ) اگر تو کام اچھا کرے گا تو تیرا شکریہ ادا نہیں کرتا اور اگر تو کوئی غلط کام کر جاتا ہے تو وہ معاف نہیں کرتا۔" اب اگر رؤسا کے لیے یہ کردار ناپسندیدہ ہے تو معلمین کے لیے بھی ناپسندیدہ ہی ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہر سمجھ دار معلّم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی اچھی کارکردگی کے مواقع پر داد دے۔ ان میں سے جس کو کوئی صلاحیت یا خصوصیت عطا ہوئی ہے اس کا اچھا تذکرہ کرے، حق وانصاف کے ساتھ ان کی تعریف کرے اور دوسروں کو ان کے فضل سے آگاہ کرے تاکہ اگر ان کے بس میں ہو تو وہ بھی ایسی ہی بہتر کارکردگی کے لیے رشک کرتے ہوئے محنت و جہد سے کام لیں اور اگر ایسا نہ کرسکتے ہوں تو کم از کم اپنے ساتھیوں کی اس فضیلت وفوقیت کے تو معترف ہوں۔ ایک استاد کے منہ سے نکلا ہوا احترام وتکریم کا ایک جملہ بھی اس کے کسی شاگرد کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، ممکن ہے اللہ کی توفیق سے یہی جملہ اس کو مایہ ناز اہل علم کی صف میں پہنچا دے۔

ایسے طلبہ جن کو قدرتی صلاحیت وذہانت، بات کو سمجھنے کا ملکہ اور مشکل مسائل کو حل کر لینے اور بات کی حقیقت تک پہنچ جانے کی قدرت تو حاصل ہو لیکن وہ اپنے مستقبل کے لیے پُر امید و بااعتماد نہ ہوں تو ان کے لیے استاد کے ایک ایسے جملے کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کو مایوسی سے نکال کر بلندی کی طرف سفر کرنے کا عزم وحوصلہ دے۔

یوسف بن یعقوب بن ماجشون کہتے ہیں کہ وہ اپنے ایک حقیقی اور ایک چچازاد بھائی کے ہمراہ ابن شہاب زہری کے پاس تعلیم حاصل کرتے تھے، امام زہری نے ان سے کہا: کم عمری کے باعث

۵۸۔ طبرانی نے فضالہ بن عبید سے ٹھیک سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ دیکھیے ترغیب ۳/۲۰۵

اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھو۔ حضرت عمرؓ بن خطاب جب کسی مشکل مسئلہ میں پھنس جاتے تو نوجوانوں کو اکٹھا کر کے ان سے رائے لیتے۔ دراصل وہ ان کے تازہ و تیز دماغوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ (۵۹)

۸۔ عمل تعلیم میں تدریج کو ملحوظ رکھنا

اسلام نے ہر میدان خصوصاً تربیت کے ضمن میں جن مبادیات کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے اور جن کے اوپر سنت کی قولی و عملی شہادت موجود ہے، ان میں سے ایک تدریج فی التعلیم ہے۔

احکام کے اجرا اور قانون سازی کے ضمن میں تو یہ اُصول بڑا واضح ہے، مکی دور میں یہ اُصول عقیدہ کے احکام اور مکارم اخلاق تک ہی محدود تھا، پھر ہجرت سے کچھ دیر پہلے نماز فرض ہوئی، نماز میں بھی پہلے حکم میں دو رکعات فرض ہوئیں۔ بعد میں سفر میں تو ان دو رکعات کو برقرار رکھا گیا لیکن حضر میں بڑھا دیا گیا۔ جب کہ بقیہ فرائض مدینہ میں فرض کیے گئے۔ جیسا کہ شراب اور سود وغیرہ کی حرمت مدینہ میں ہی ہوئی۔ یہ سب کچھ ایک حکیمانہ تدریج کے ساتھ ہوا تا کہ لوگوں کے لیے امر کی اطاعت اور نہی سے اجتناب کرنا کسی تنگی تکلیف کے بغیر آسان ہو سکے۔

نبی اکرم ﷺ بھی اپنے اصحاب کو یہ اُصول سکھایا کرتے تھے کہ وہ تدریج کی اس سنت کو اپنائیں جو حیات و کائنات میں اللہ تعالیٰ نے ہر کہیں جاری و ساری کر رکھی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا بَعَثَ مُعَاذًا اِلَى الْيَمَنِ قَالَ: "اِنَّکَ تَأْتِي قَوْمًا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، فَادْعُهُمْ اِلٰى شَهَادَةِ أَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَ أَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ. فَاِنْ هُمْ أَطَاعُوكَ لِذٰلِكَ، فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ. فَاِنْ أَطَاعُوكَ لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ، فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ. (۶۰)

"رسول اللہ ﷺ نے جب معاذؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا: آپ اہل کتاب

۵۹- جامع بیان العلم ج۱/۱۰۲

۶۰- اس حدیث کو ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ منتقی اور اس کی شرح جلد۴/۱۷۰ میں ہے۔

کی ایک قوم میں جا رہے ہیں، لہٰذا (سب سے پہلے) ان کو یہ دعوت دینا کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، اگر وہ آپ کی یہ بات مان لیں تو پھر ان کو یہ بتانا کہ اللہ نے دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ آپ کی یہ بات بھی مان لیں تو اس کے بعد یہ بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو مالدار لوگوں سے وصول کر کے فقراء میں تقسیم کر دی جائے گی۔"

آپؐ کا یہ فرمانا تھا کہ تم ایک ایسی قوم میں جا رہے ہو جو اہل کتاب ہے۔ گویا یہ نصیحت کی تمہید ہے تا کہ جناب معاذؓ اس مقصد کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو مجتمع کر لیں کیوں کہ ان کے مخاطبین اہل کتاب ہونے کی بنا پر اہل علم تھے۔ لہٰذا ان سے گفتگو کا انداز ویسا نہیں ہو سکتا تھا جیسا بت پرست جاہلوں سے ہوتا ہے۔[۶۱]

پھر آپؐ نے حضرت معاذؓ کو حکم دیا کہ وہ اپنی دعوت کا آغاز عقیدہ سے کریں۔ وہ انھیں شہادتین (اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ) کی دعوت دیں، کیوں کہ اسلام میں داخل ہونے کا دروازہ یہی ہے اور یہی اصل اور مکمل دین ہے۔ ان دونوں چیزوں کا اقرار واذعان کیے بغیر کوئی عبادت قبول ہو گی نہ کوئی عمل مقبول ہو گا۔

اگر وہ یہ اقرار کر لیں اور اللہ کے رب ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہو جائیں تو پھر انھیں روزانہ کے اولین فریضہ کے بارے میں بتائیے جو بندے اور اس کے رب کے درمیان دائمی رابطہ ہے اور مسلم و کافر کے درمیان فیصل و فارق ہے، یہ عمودِ اسلام یعنی نماز ہے۔

اگر وہ اس بات کو بھی سمجھ جائیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو پھر انھیں بتائیے کہ ایک دوسرا عملی فرض ہے جس کا ذکر قرآن و سنت میں پہلے فریضے کے ساتھ اکٹھے آیا ہے اور یہ بعض مسلمانوں کے آپس میں اجتماعی و اقتصادی رابطے کا ذریعہ ہے۔ یہ اسلام کی چوٹی زکوٰۃ ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ دعوت اور تعلیم کا عمل اسی منہج پر ہو۔

تدریج کی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق کمیت (مقدار) سے ہے اور دوسری کا کیفیت (حالت) سے۔

۶۱- مذکورہ بالا حوالہ دیکھیے۔

۱- کمیت: کمیت یہ ہے کہ متعلّم کو علم کی مناسب مقدار دی جائے اور استاد اس پر زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ اگر وہ اس کی حیثیت سے بڑھ کر اس کو تعلیم دے گا تو وہ اس کو جذب کرنے سے قاصر رہے گا۔ اس طرح معلّم اپنی ساری محنت کو ضائع کر بیٹھے گا۔ اس طرح کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے معلّم چاہتا ہے کہ وہ ایک ہی دفعہ بہت سی چیزیں متعلّم کو بتا دے لیکن معلّم اپنے اس عمل کے ذریعے تھوڑے اور بہت دونوں کو ضائع کر دیتا ہے، طالب علم کے پلے نہ تھوڑا علم پڑتا ہے نہ زیادہ۔ علم تو دین کی مانند ایک متعین چیز ہے، اور اس میں داخلے کے لیے نرمی اختیار کرنا ضروری ہے۔

امام زہری نے اس سلسلے میں اپنے شاگرد یونس بن زید کو یہ نصیحت کی کہ: اے یونس! علم کے سامنے بڑا بننے کی کوشش نہ کرنا، علم تو وسیع و عریض وادیوں کی مانند ہے، تم جس وادی سے بھی سفر کا آغاز کرو گے وہ تمھیں منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر ڈالے گی۔ ہاں! علم کو دن رات حاصل کرتے رہو مگر ایک ہی بار سب کچھ سیکھنے کی کوشش مت کرنا۔ کیوں کہ جو شخص ایک ہی بار سب کچھ سیکھ لیتا ہے وہ اس سے چھن بھی ایک ہی بار جاتا ہے۔ اس لیے تھوڑا تھوڑا کر کے دن رات علم حاصل کرو۔ (۶۲)

۲- کیفیت: کیفیت سے مراد یہ ہے کہ استاد طلبہ کو ظاہر سے پوشیدہ، بسیط سے مرکب، خفیف سے ثقیل، واحد سے جمع اور عمل سے نظریہ کی طرف لیجانے کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے تعلیم دے۔

حکیمانہ اقوال میں یہ قول منقول ہے کہ ربانی اس شخص کو کہتے ہیں جو علم کی موٹی باتوں سے قبل علم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی لوگوں کو تربیت دے۔ علم کی موٹی باتوں سے مراد وہ مسائل ہیں جو دقیق نوعیت کے ہوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے مراد وہ مسائل ہیں جو واضح ہوں۔ یہ بھی کہا گیا ہے ربانی وہ شخص ہے جو لوگوں کو کلیات سے قبل جزئیات کی تعلیم دے، اُصول سے قبل فروع سکھائے اور مقاصد سے قبل مبادیات پڑھائے۔ (۶۳)

سب سے اہم بات یہ ہے کہ استاد شاگردوں کو علم کے دقائق اور مشکل مسائل کی تعلیم سے عمل تعلیم کا آغاز نہ کرے اس طرح تو وہ ان کو ایک بحرِ عمیق میں ڈبو دے گا جہاں سے وہ نکل

۶۲- جامع بیان العلم جلد۱/ ۱۲۵

۶۳- فتح الباری ۱/ ۱۷۱

نہیں سکیں گے۔ استاد کو چاہیے کہ وہ اپنے شاگردوں کی تعلیم کا آغاز آسان اور سہل چیزوں سے کرے کیوں کہ جب آغاز میں چیز آسان ہوگی تو حاصل کرنے والے کے لیے رغبت کا باعث بنے گی اور وہ خوشی خوشی اس کے حصول میں لگ جائے گا اور آخر کار وہ مشکل مسائل کی تعلیم بھی حاصل کر لے گا۔ جب کہ اس کے برعکس اختیار کیے گئے طریقہ کے نتائج یہ نہیں نکل سکتے۔ (۶۴)

بڑے بڑے علمائے کرام کا اپنی کتب کی تالیف کا طریقۂ کار بھی تدریجی ہی ہوا کرتا تھا۔ جس طرح امام غزالیؒ نے فقہ شافعی پر اپنی تالیف کو تین درجات میں تقسیم کیا ہے: پہلی کتاب مختصر ہے جس کو وجیز اور دوسری درمیانے درجے کی جس کو وسیط اور تیسری مفصل ہے جس کو مبسوط کہتے ہیں۔ اسی طرح ابن قدامہ نے بھی فقہ حنبلی پر جو کتاب تالیف کی ہے اس کی ترتیب، صعودی اختیار کی ہے۔ یعنی پہلے **العمدہ** ہے پھر **المقنع**، پھر **الکافی** اور آخر میں **المغنی** ہے۔

یہ لوگ ہر مرحلہ کی کتاب کو اس کی ضرورت کے مطابق تالیف کیا کرتے تھے، کیوں کہ مبتدی (Beginner) نہ متوسط ہو سکتا ہے نہ منتہی لہٰذا اس کو اس کی ذہنی سطح کے مطابق ہی تعلیمی غذا دی جانی چاہیے۔

اسی طرح یہ چیز بھی ضروری ہے کہ عمر کے مراحل کا لحاظ رکھا جائے۔ ایک بچے کو وہ چیز نہ سکھائی جائے جو ایک لڑکے اور جوان کو سکھائی جاتی ہے۔

آج ماہرینِ تربیت کتابوں کی تالیف اور طریق کار وضع کرنے میں اسی چیز پر زور دے رہے ہیں۔

۹- انفرادی فرق کو ملحوظ رکھنا

تعلیم کے ارکان، مبادیات اور آداب میں سے ایک چیز لوگوں کے درمیان پائے جانے والے انفرادی، ماحولی اور حالات کے اختلافات کا خیال رکھنا بھی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کے لیے جو کچھ بہتر ہے وہ دوسرے کے لیے بھی بہتر ہو۔ ایک ماحول میں جو چیز مناسب ہو سکتی ہو وہ دوسرے ماحول میں بھی مناسب ہو۔ کسی ایک گروہ یا نسل کے لیے جو کچھ مناسب ہو سکتا ہے ضروری نہیں کہ دیگر کے لیے بھی وہ اسی طرح مؤثر ہو۔ اسی طرح جو چیز ایک زمانے اور

۶۴- فتح الباری ۱/۱۷۱

وقت میں مناسب ہو سکتی ہے وہ دوسرے وقت میں بھی مناسب ہو۔

کامیاب استاد وہی ہو سکتا ہے جو ہر انسان کو خواہ وہ ایک ہو یا ایک سے زیادہ، علم کی اتنی ہی مقدار سکھاتا ہے جو اس کے لیے سیکھنا ممکن ہو اور ایسی تعلیم دیتا ہے جو اس کے شایانِ شان یا لائق ہو اور تعلیم دینے کا یہ عمل وہ ایسے وقت میں انجام دیتا ہے جب متعلّم استفادہ کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

انسانیت کے اولین معلّم اس نظریاتی اور عملی پہلو کا بہترین خیال رکھنے والے تھے۔ لوگوں کے اس فرق کا عملی طور پر لحاظ رکھنے کا یہ نبوی عمل کئی صورتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- مختلف اشخاص کے لیے آپؐ کی مختلف وصیتیں

۲- سائلین کے مختلف ہونے کے باعث ایک ہی سوال کے مختلف جوابات

۳- اشخاص کے مختلف ہونے کے ساتھ آپؐ کے مؤقف اور سلوک کا مختلف ہونا

۴- مختلف لوگوں کی صلاحیت و طاقت کے مطابق انھیں حکم دینا اور ان پر ذمہ داری ڈالنا

۵- ایک موقع پر ایک آدمی کا نقطۂ نظر مان لینا اور اس کے کام کو جائز قرار دینا مگر دوسرے موقع پر ایسے ہی کسی دوسرے شخص سے اس طرح کا موقف اور کام قبول نہ کرنا۔

❏ مذکورہ صورتوں میں سے پہلی صورت میں ہم متعدد لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ نبی اکرمؐ سے کسی نصیحت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ بعض کوئی خاص نصیحت چاہتے ہیں اور بعض عام کا ہی مطالبہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپؐ ایسی نصیحت فرمائیں جو ان کو جنت سے قریب اور جہنم سے دور کر دے۔ یا ایسی ہی جامع عبارات یا جملوں کا مطالبہ کرتے تو آپؐ ان لوگوں میں سے ہر کسی کو مختلف نصیحتیں کرتے۔ کسی سے آپؐ فرماتے ہیں:

تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا، وَ تُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِي الزَّكٰوةَ وَتَصِلَ الرَّحِمَ.

”یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو تو اس میں کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رشتہ داری کو جوڑ کر رکھو۔“

کسی سے آپؐ فرماتے ہیں:

اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ وَ اَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَ خَالِقِ النَّاسَ

بِخُلُقٍ حَسَنٍ.

"جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو، برائی ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کرنے کی کوشش کرو نیکی اس برائی کو مٹا دے گی اور لوگوں سے بہترین اخلاق کے ساتھ پیش آو۔"

کسی سے آپؐ فرماتے ہیں: قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ. "کہو میں ایمان لے آیا اللہ پر پھر اس پر استقامت اختیار کرو۔"

کسی سے آپؐ صرف اتنا ہی فرماتے ہیں: لَا تَغْضَبْ "غصہ نہ کیا کرو۔"

اس طرح آپؐ نصیحت کا مطالبہ کرنے والے کے حالات و ضروریات کی رعایت رکھتے تھے اور اس کو وہ چیز فراہم کرتے جس کی اس کو اشد ضرورت ہوتی۔ اس طرح کے سائلین کے ساتھ آپؐ کا سلوک تو ایک مریض کے ساتھ ڈاکٹر کے سلوک جیسا ہوتا تھا کہ ڈاکٹر ہر مریض کو اس کی بیماری کے مطابق دوا دیتا ہے اور اسی طرح نبی اکرمؐ ہر آدمی کو اس کی ضرورت کے مطابق نصیحت کرتے تھے۔

□ دوسرے نمبر پر ذکر ہونے والی صورت کا جب ہم سیرت پاک میں مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپؐ سے سوال کیا جاتا ہے کہ أَيُّ العَمَلِ أَفْضَلُ؟ "کون سا علم بہترین ہے؟"۔

یا أَيُّ الاِسْلَامِ أَفْضَلُ؟ "کون سا اسلام افضل ہے؟"۔

آپؐ اس کا جو جواب ایک شخص کو دیتے ہیں دوسرے کو وہ جواب نہیں دیتے۔

اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

● عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ: اَيُّ الاَعْمَالِ أَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ فَقَالَ: "اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا" قُلْتُ ثُمَّ اَيٌّ قَالَ "بِرُّ الوَالِدَيْنِ" قُلْتُ ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: "اَلجِهَادُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ"

"عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اللہ کے نزدیک بہترین عمل کون سا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: "نماز کو وقت پر ادا کرنا۔" میں نے پوچھا اس کے بعد (بہترین عمل کونسا ہے؟) آپؐ نے

فرمایا: "والدین کے ساتھ بھلائی کرنا۔" میں نے پوچھا اس کے بعد؟ آپؐ نے فرمایا: "جہاد فی سبیل اللہ۔"

● عَنْ رَجُلٍ مِنْ خَثْعَمَ قَالَ: اَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَ هُوَ فِيْ نَفَرٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ فَقُلْتُ أَنْتَ الَّذِيْ يَزْعُمُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ؟ قَالَ: "نَعَمْ" قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَىُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ؟ قَالَ: "اَلْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ" قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ثُمَّ مَهْ؟ قَالَ: "ثُمَّ صِلَةُ الرَّحِمِ" قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! ثُمَّ مَهْ؟ قَالَ: "ثُمَّ الْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ"......(۶۵)

"خثعم قبیلے کا ایک آدمی روایت کرتا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا تو آپؐ صحابہؓ کی ایک جماعت میں تھے، میں نے پوچھا: کیا آپ ہی وہ شخص ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں!" آدمی کہتا ہے میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! بتائیے کہ اللہ کے نزدیک بہترین عمل کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "اللہ پر ایمان لانا" میں نے پھر پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! اس کے بعد؟ آپؐ نے فرمایا: "اس کے بعد رشتہ داری قائم رکھنا" آدمی کہتا ہے کہ میں نے پھر پوچھا: "یا رسول اللہ ﷺ! اس کے بعد؟ آپؐ نے فرمایا: "نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا۔"

ایک سوال کے مختلف جوابات کی کیا توجیہہ بیان کی جاسکتی ہے، سوائے اس کے کہ سائلین کے حالات کا خیال رکھا گیا ہے، اوران کے انفرادی فرق کی رعایت رکھی گئی ہے۔

جب عورتوں نے جہاد سے متعلق آپؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا:

لٰكِنَّ أَفْضَلَ الْجِهَادِ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ(۶۶)

"(جہاد کی اہمیت اپنی جگہ مگر آپ کے لیے) حج مبرور بہترین جہاد ہے۔"

۶۵- بخاری و مسلم جیسا کہ ترغیب حدیث ۳۵۸۲ بھی ہے۔

۶۶- بخاری

صحیح بخاری میں ہے:

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ؟ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَ یَدِہٖ.

''حضرت ابوموسیٰ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے آپؐ سے سوال کیا: یا رسول اللہ ﷺ! بہترین اسلام کونسا ہے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا: (اس شخص کا اسلام بہترین ہے) جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔''

اسی بارے میں ایک روایت یوں مروی ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ ﷺ اَیُّ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ؟ قَالَ: تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَ تَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ[۶۷]

''حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ بہترین اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ''یہ کہ تم (مسکینوں یتیموں) کو کھانا کھلاؤ اور ہر واقف ناواقف کو سلام کہو۔''

اگرچہ اس دوسرے سوال کے الفاظ مختلف ہیں مگر مفہوم ایک ہی ہے، اب دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دونوں سوالوں کا جواب ایک نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ آپ کا یہ انداز اس لیے ہوتا تھا کہ آپؐ سائلین و سامعین کے مختلف حالات کو مدنظر رکھتے تھے۔ پہلے سوال میں آپؐ نے سوال کرنے والے کے ہاتھ اور زبان سے لوگوں کو پہنچنے والی ایذا کے خدشہ پر توجہ دیتے ہوئے اس شخص کی رہنمائی کر دی کہ وہ ان دونوں چیزوں کے ساتھ کسی کی تکلیف کا باعث بننے سے باز رہے۔ جب کہ دوسرے سوال میں آپ نے ایک ایسے شخص کو دوسروں کو کھانا کھلانے اور سلام کہنے کی ترغیب دلائی جس سے یہ امید تھی کہ وہ اپنے قول و فعل سے دوسروں کو نفع پہنچا سکتا ہے اور اس طرح آپ نے ان دونوں کاموں کی طرف اس کی رہنمائی فرما دی اور اس وقت ان چیزوں کے حاجت مند کو خصوصاً انھی چیزوں پر عمل کرنے پر ابھارا، کیوں کہ یہ وہ وقت تھا جب لوگ فقر و فاقہ کی زندگی گزار رہے تھے۔ لہٰذا اس چیز کی ضرورت تھی کہ ان کو کھانے

۶۷۔ ان دونوں احادیث کا ذکر بخاری کی کتاب الایمان میں ہے۔

کے لیے کچھ مل جائے۔ دوسرا یہ کہ لوگوں کی تالیف قلوب بھی اس عمل کے ذریعے ممکن تھی۔[۶۸]

انفرادی فرق کا لحاظ رکھنے کی سب سے واضح مثال وہ حدیث ہے جو امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں بیان کی ہے، حدیث ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمرِو بنِ الْعَاصِ كُنَّا عِندَ النَّبِيِّ ﷺ فَجَاءَ شَابٌّ فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أُقَبِّلُ وَ أَنَا صَائِمٌ؟ فَقَالَ لَا. فَجَاءَ شَيْخٌ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أُقَبِّلُ وَأَنَا صَائِمٌ؟ قَالَ نَعَمْ! فَنَظَرَ بَعْضُنَا إِلٰى بَعْضٍ! فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَدْ عَلِمْتُ نَظَرَ بَعْضِكُمْ إِلٰى بَعْضٍ. إِنَّ الشَّيْخَ يَمْلِكُ نَفْسَهُ[۶۹]

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ ایک بار ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک نوجوان آیا اور اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں روزہ کی حالت میں بیوی کا بوسہ لے سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں! اسی دوران ایک بوڑھا شخص آ گیا (اس نے بھی یہی سوال پوچھا) کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں روزہ کی حالت میں بیوی کا بوسہ لے سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں لے سکتے ہو! راوی کہتے ہیں (آپؐ کے یہ دو مختلف جواب سن کر) ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تمھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے دیکھ لیا ہے۔ (بات یہ ہے کہ بوڑھے کو بوسہ کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ) بوڑھا اپنے آپ پر قابو رکھ سکتا ہے (جب کہ نوجوان اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا)۔"

یہی وہ چیز ہے جس کو شرعی دلیل کہا جاتا ہے اور علماء نے اسی بنیاد پر یہ کہا ہے کہ حالات کے بدل جانے کے ساتھ فتویٰ بھی بدل سکتا ہے۔

۶۸- الفتح جلد۱/۶۲

۶۹- مسند احمد: حدیث ۷۰۵۴ جلد ۱۲، اس کے باوجود کہ اس میں ابن لھیعہ ہے شیخ احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ شیخ نے اس کو ثقہ کہا ہے اور اس حدیث کا شاہد ابوداؤد میں ابوہریرہؓ سے مروی حدیث کو بیان کیا ہے جو اسی مفہوم میں ہے۔

□ تیسرے نمبر میں جو صورت بیان کی گئی ہے اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ دیہاتوں سے آنے والے بدوؤں سے جو سلوک کرتے ہیں وہ اپنے ان صحابہؓ سے نہیں کرتے جن کی تربیت آغوشِ نبوت میں ہوئی ہے۔ ان دیہاتیوں کی جو خطا معاف کر دیتے ہیں وہی خطا ان صحابہؓ کو معاف نہیں کرتے۔ مسلمانانِ فتح مکہ اور زعمائے قبائل کی جو تالیف قلوب کرتے ہیں وہ مہاجرین و انصار کے ساتھ نہیں کرتے۔ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ ان کی طبیعت اور مرتبہ کے مطابق سلوک کرتے تھے۔ جب حضرت عثمانِ غنیؓ آپؐ کے پاس آتے تو آپؐ رانوں اور پنڈلیوں کو ڈھانک لیتے اور اپنے کپڑے سنبھال لیتے لیکن ابوبکر و عمر کے ساتھ ایسا نہیں کرتے تھے۔ دراصل آپؐ نے عثمانؓ کی حیاداری کے باعث ایسا کیا چونکہ آپؐ حضرت عثمانؓ کے بارے میں فرماتے ہیں:

أَلَا أَسْتَحْيِي مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحْيِي مِنْهُ الْمَلٰئِكَةُ

"کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔"

حضرت عائشہؓ نے آپؐ کا یہ عمل دیکھ کر پوچھا:

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا لِي لَمْ أَرَكَ فَزِعْتَ لِأَبِي بَكْرٍ وَ عُمَرَ كَمَا فَزِعْتَ لِعُثْمَانَ؟ قَالَ اِنَّ عُثْمَانَ رَجُلٌ حَيِيٌّ وَ اِنِّيْ خَشِيْتُ اِنْ أَذِنْتُ لَهٗ عَلٰى تِلْكَ الْحَالِ أَلَّا يَبْلُغَ اِلَيَّ فِي حَاجَتِهٖ(۷۰)

"اے اللہ کے رسولؐ! میں یہ کیا دیکھتی ہوں کہ آپؐ ابوبکر و عمر کو دیکھ کر اس طرح نہیں سہمے جس طرح عثمان کو دیکھ کر سہم گئے، آپؐ نے جواب دیا: عثمان حیادار آدمی ہیں اور مجھے یہ خدشہ ہے کہ اگر میں اپنی اسی حالت میں عثمان کو اندر آنے کی اجازت دے دیتا تو وہ جس کام کے لیے میرے پاس آئے ہیں نہ آتے۔"

جب کسی قوم کا کوئی اچھا معزز آدمی آپؐ کے پاس آتا تو آپؐ اس کی عزت کرتے اور جب کوئی بے وقوف و برا آدمی آپؐ سے ملتا تو آپؐ اس کو صرف خندہ پیشانی سے ملتے اور ایسی گفتگو کرتے جس میں کوئی مداہنت ہوتی نہ بے جا تعریف و توصیف۔ آپؐ یہ رویہ اس لیے اپناتے تاکہ اس کو اپنے قریب بھی کیا جائے اور اس کی شرارت سے بھی محفوظ رہا جا سکے۔

۷۰- مسلم نے سعید بن العاص سے روایت کیا ہے اور عائشہؓ و عثمانؓ نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ حدیث ۳۴۰۲

رسول اکرمؐ نے حضرت معاذؓ سے ان لوگوں کے بارے میں بشارتیں بیان کیں جن کو عقیدۂ توحید پر موت آجائے۔ لیکن اس ڈر سے کہ لوگ اسی پر قناعت کر کے نہ بیٹھ جائیں، آپؐ نے معاذؓ کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ عام لوگوں کو یہ بشارت سنا دیں۔[۷۱]

□ چوتھے نمبر پر بیان کی گئی صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ہر شخص پر اسی قدر پابندی عاید کرتے ہیں جس کی اس کے اندر صلاحیت ہے، جو اس کے لائق اور حسب حال ہے۔ ہجرت اور غارِ حراء میں چھپنے جیسے واقعات میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ متعدد افراد کو متعدد مہمیں سپرد کرتے ہیں۔ ہر کسی کو وہ کام کرنا ہوتا ہے جو اس کے لیے مناسب ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کو سواریاں تیار کرنے کے بعد ساتھ چلنے کے لیے بھی پابند کیا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کو ہر قسم کے خطرہ کے باوجود آپؐ گھر پر رات گزارنے کی ڈیوٹی ملتی ہے۔ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر کو کھانا پہنچانے اور دیگر خبروں کو رفقائے غار تک پہنچانے کی ذمہ داری ملتی ہے جو ان کے لیے مناسب ہے۔ عبداللہ بن ابوبکر اور عامر بن فہیرہ کا بھی اپنا اپنا کردار ہے جو اس دوران ادا کرتے ہیں۔

اسی طرح آپؐ بعض جنگی لشکروں کی کمان حضرت خالد بن ولیدؓ اور کبھی حضرت عمرو بن العاص کے حوالے کرتے ہیں۔ کبھی شعرائے قریش کی ہجو کا جواب دینے کے لیے حضرت حسان بن ثابت کو میدانِ دفاع میں اتارتے ہیں کہ وہ ایسے شعروں کے اسلحہ سے آپؐ کا دفاع کریں جو اندھیرے میں چلائی گئی تیز دھار تلوار سے بھی زیادہ کاٹ دار ثابت ہوں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر آپؐ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان کو امیر (گورنر) بنا دیں تو آپؐ ان کی حدتِ طبع کے باعث کوئی جواب نہیں دیتے۔

□ پانچویں نمبر میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ بعض دیہاتوں سے فرائض کی ادائیگی میں ہونے والی کمی کو قبول کر لیتے ہیں حتیٰ کہ ایک آدمی کہتا ہے کہ وَاللّٰهِ لَا اَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا وَلَا اَنْقُصُ ''واللہ! میں اس سے کچھ کم کروں گا نہ زیادہ۔'' اس کے باوجود آپ فرماتے ہیں اَفْلَحَ اِنْ صَدَقَ ''اگر یہ سچ کہہ رہا ہے تو فلاح پا گیا۔'' دوسری حدیث میں ہے۔ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى هٰذَا 'جو شخص

۷۱- صحیح بخاری باب مَن خصّ قوماً: دیکھیے فتح الباری جلد ۱/ ۲۳۶

یہ چاہتا ہے کہ وہ کسی جنتی آدمی کو دیکھے تو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔" یہ بات نبی اکرمؐ نے مہاجرین وانصار میں کسی کے لیے بھی نہیں فرمائی۔

ایک مربی حق اور معلم مرشد کا اپنے طلبہ و رفقاء کی تعلیم و تربیت میں یہی طریق کار ہونا چاہیے کہ وہ ان کے حالات، ان کی عام و خاص صلاحیتوں اور ان میں سے ہر کسی کے مخصوص حالات کا خیال رکھے۔ بلکہ ان میں سے ایک ایک کے انفرادی حالات و صلاحیتوں کی رعایت رکھ کر ایسی نہج پر ان کی تربیت کرے جو اُن کے حسب حال ہو۔ بات کرنے کا جو انداز بچوں کے سامنے اختیار کیا جاتا ہے وہ بڑوں کے ساتھ گفتگو کے دوران نہ اپنایا جائے، جو اسلوبِ تکلم لڑکوں کے ساتھ گفتگو کے دوران ہوتا ہے وہ لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے نہ اختیار کیا جائے۔ جو چیز خواص لوگوں کو بتائی یا سکھائی جاتی ہے وہ عوام کو سکھانے یا سمجھانے کی کوشش نہ کی جائے۔ جو کام کند ذہن سے لیا جاتا ہے وہ ایک ذہین آدمی سے نہ لیا جائے۔ جو حکم ایک دیہاتی کو دیا جاتا ہے وہ کسی شہری کو نہ دیا جائے بلکہ ہر متعلم کو اس کی صلاحیت اور ظرف کے مطابق تعلیم دی جائے۔

یہ ناکامی بلکہ گناہ ہوگا اگر استاد ہر وہ چیز جو اس کے پاس ہے ہر کسی کو سمجھانا سکھانا اور بتلانا شروع کر دے اور یہ تمیز قائم ہی نہ کرے کہ کون اسے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کون سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور یہ فرق ہی نہ کرے کہ کون اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور کس کو اس چیز کے سیکھنے سے نقصان ہوگا۔ حدیث رسولؐ میں ہے كَفٰى بِالْمَرْءِ أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ[۷۲] "آدمی کے (کم عقل ہونے) کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر ایسی بات بیان کر دیتا ہو جو اس نے سن رکھی ہے۔"

یہی وہ چیز ہے جس سے اہل علم صحابہؓ نے ڈرایا ہے:

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "لوگوں سے وہی باتیں بیان کرو جو وہ جان سکتے ہوں۔ کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ (تم ایسی بات کہو جو ان کی عقل میں نہ آئے اور ان کے انکار کی وجہ سے) اللہ اور رسولؐ کی تکذیب کا ارتکاب ہو۔"

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: "اگر آپ کسی قوم سے ایسی بات بیان کریں گے جو ان کی عقل میں نہ آ سکتی ہو تو وہ ان میں سے کچھ کو فتنہ میں ڈال دے گی۔"

۷۲۔ مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔

یہ چیز کتمانِ علم نہیں ہے بلکہ علم کو اس کے محل و مقام پر صرف کرنے کا بہترین طریقہ اور اس شخص تک پہنچانے کا بہترین اسلوب ہے جو اس کا اہل و مستحق ہو کیوں کہ:

لِكُلِّ مُقَامٍ مَقَالٌ
وَ لِكُلِّ عِلْمٍ رِجَالٌ

''کہ ہر مقام کے حالات کے مطابق بات کی جاتی ہے اور ہر علم کے حاصل کرنے والے مخصوص ہوتے ہیں نہ کہ ہر آدمی۔''

ایک حکیمانہ مقولہ ہے کہ ''حکمت کی بات کسی نااہل کو نہ بتاؤ اگر ایسا کرو گے تو حکمت پر ظلم کرو گے اور کسی اہل شخص سے حکمت کی بات روک کر نہ رکھو اگر ایسا کرو گے تو اس شخص پر ظلم کرو گے۔''

امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں ذکر کیا ہے:

''یہ استاد کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ وہ طالب علم کے فہم کے مطابق اسے علم سکھائے۔ اس کو ایسی چیزیں نہ بتائے جن تک اس کی عقل نہیں پہنچ سکتی۔ ایسا کرنے سے اس کے اندر حصولِ علم سے نفرت پیدا ہوگی یا اس کا ذہن اس حوالے سے منتشر ہو جائے گا۔ استاد یہ کام سیدِ انسانیت جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ کی اقتدا و پیروی کرتے ہوئے کرے۔ استاد و طالب علم کو کسی حقیقت سے اسی وقت آگاہ کرے جب سمجھے کہ طالب علم کے فہم میں یہ بات آ سکتی ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''یہاں علوم کا ایک سمندر ہے، کاش! ان علوم کو سیکھنے کے متحمل لوگ مل جائیں!'' کسی عالم کے لیے بھی یہ درست نہیں ہے کہ وہ جو کچھ جانتا اور علم رکھتا ہے وہ ہر کسی کے سامنے بیان کرتا پھرے۔ یہ ایسی صورت میں ہے جب طالب علم اس کو سمجھنے کی صلاحیت تو رکھتا ہو لیکن اس سے استفادہ کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ لہٰذا ایسے مسائل جن کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتا ان کا معاملہ تو دور نازک ہے!''

اسی لیے کہا گیا ہے: ہر آدمی کی عقل کے معیار کے مطابق اس کو پیمائش دو اور اس کے فہم کی میزان کے مطابق اس کو وزن دو تا کہ تم بھی اس سے محفوظ رہو اور وہ بھی تم سے استفادہ کر سکے۔ ورنہ معیار کے فرق کی وجہ سے انکار کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کو بے وقوفوں کے ہاتھوں میں دینے سے منع کرتے ہوئے فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ بالکل اسی تنبیہ کا اطلاق علم کی حفاظت پر بھی ہوتا

ہے کہ علم کو اس آدمی سے محفوظ رکھنا جو اس کو خراب کر ڈالے یا نقصان پہنچائے بدرجۂ اولی ضروری ہے اور غیر مستحق کو دینے کا ظلم مستحق سے روکے رکھنے سے چھوٹا ظلم نہیں ہے۔(۷۳)

امام غزالی یہ بھی کہتے ہیں کہ ''کم فہم طالب علم کے مناسب حال یہی ہے کہ معلم اس کو واضح اور جلی باتیں بتائے جو اس کے لائق ہوں اور اس سے یہ نہ کہے کہ اس کی گہرائی میں تو بڑی دقیق چیزیں ہیں جو اسے بتائی نہیں جا رہیں۔ اس طرح کے اسلوب سے جلی باتوں کو سمجھنے میں بھی طالب علم کا ذوق خراب ہوگا اور اس کا دل تشویش سے دوچار ہو جائے گا اور اس کے اندر یہ وہم پیدا کر دے گا کہ تعلیم کے سلسلے میں اس کے ساتھ بخل سے کام لیا جا رہا ہے۔ کیوں کہ ہر ایک کا گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر دقیق علم بھی سیکھ سکتا ہے۔

استاد کے لیے یہ بھی مناسب نہیں کہ وہ دقیق علوم کے حقائق میں عوام کے سامنے طول طویل بحثیں بیان کرتا رہے بلکہ اسے لوگوں کو صرف تعلیم عبادات اور شعبوں میں امانت سے کام لینے کی تعلیم دینی چاہیے جن سے وہ وابستہ ہیں۔ معلم ان کے دلوں میں جنت کا شوق اور جہنم کا خوف پیدا کرے اور اس میں بھی صرف اسی حد تک رہے جس حد تک قرآن نے بیان کیا ہے۔

معلم طالب علم کے سامنے مشتبہ امر کو نہ چھیڑے کیوں کہ مشتبہ امر اس کے دل میں اٹک سکتا ہے اور اس کا حل اس کے سامنے دشوار ہو سکتا ہے جس کے باعث وہ کسی غلط موقف کو اختیار کر کے تباہی سے دوچار ہو سکتا ہے۔(۷۴)

غرض یہ کہ معلم ایک ڈاکٹر ہے جو دل و دماغ کا علاج اسی دوا سے کرتا ہے جو ان کے لیے مناسب ہوتی ہے اور ہر دوا ہر بیماری کے لیے مناسب نہیں ہوتی۔

۱۰- اعتدال اختیار کرنا اور اکتاہٹ پیدا کرنے سے بچنا

تعلیم اور وعظ و نصیحت کے عمل میں وقت، نوع اور طوالت و کثرت میں اعتدال سے کام لینا تعلیم کی مبادیات میں سے ہے۔ تاکہ مخاطب کے اندر اکتاہٹ پیدا نہ ہو جائے۔

۷۳- احیاء علوم الدین ج ۱/ ۵۷، ۵۸

۷۴- احیاء علوم الدین ج ۱/ ۵۸

امام بخاریؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابی وائل سے روایت کیا کہ وہ کہتے ہیں:
حضرت عبداللہ (بن مسعود) لوگوں کو ہر جمعرات کو تذکیر کیا کرتے تھے۔ ایک آدمی نے ان سے کہا: ابوعبدالرحمٰن! کاش آپ روزانہ ہمیں تذکیر کریں۔ (حضرت عبداللہ نے) کہا: مجھے اس سے یہ چیز روکتی ہے کہ میں تمھیں اکتاہٹ کا شکار نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمھیں اس طرح وقفے کے ساتھ تذکیر کرتا ہوں جس طرح نبیؐ ہمارے اکتا جانے کے خوف سے وقفے کے ساتھ ہمیں تذکیر کیا کرتے تھے۔ (۷۵)

امام بخاریؒ ہی حضرت عکرمہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا ہے: لوگوں کو ایک جمعہ کے دوران ایک بار احادیث سناؤ۔ اگر زیادہ کرنا چاہتے ہو تو دو بار کرلو۔ اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہتے ہو تو تین بار کرلو لیکن لوگوں کو قرآن سے اکتا ڈالنے کا کام نہ کرو۔ میں تمھیں کسی ایسی قوم کے پاس نہ دیکھوں کہ وہ اپنی باتوں میں مشغول ہوں اور تم انھیں اپنی بات سناتے رہو، بلکہ تم خاموش رہو۔ جب وہ تمھیں بات کرنے کے لیے کہیں تو انھیں بات سناؤ کیوں کہ اس وقت وہ اس کے خواہش مند ہوں گے۔ (۷۶)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے: دلوں میں رغبت اور چستی بھی ہوتی ہے اور سستی و بے رغبتی بھی۔ تم لوگوں کو اس وقت وعظ و نصیحت کرو جب وہ تمھاری طرف متوجہ ہوں۔ (۷۷)

حضرت حسن بصریؒ کا کہنا ہے: بیان کیا جاتا تھا کہ ''لوگوں کو اس وقت تذکیر کرو جب وہ اپنے چہرے تمھاری طرف متوجہ کرلیں۔ کیوں کہ جب وہ تمھاری طرف دیکھیں گے تو جان لو کہ انھیں اب تمھاری بات سننے کی ضرورت ہے۔ (۷۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح داعی اور واعظ و محدث پر واجب ہے اسی طرح معلّم کے اوپر بھی واجب ہے کہ وہ شاگردوں کی نفسیاتی طاقت کا لحاظ رکھے۔ جو شخص ناپسندیدگی کے

۷۵- بخاری مع فتح الباری: ج۱/۱۷۳
۷۶- جمع الفوائد: ج۱ حدیث ۲۳۵
۷۷- سنن الدارمی: ج۱/۹۸ باب من کرہ ان یمل الناس
۷۸- ایضاً

ساتھ کوئی بات سن رہا ہو یا سیکھ رہا ہو تو وہ اس چیز سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ دراصل وہ کانوں سے بات کو سن تو لیتا ہے لیکن دل میں محفوظ نہیں کرتا۔ جس طرح انسان کی بدنی طاقت محدود ہے اور اس کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اس کے اوپر ایسا حاوی بوجھ نہیں ڈالا جاتا جس کو اٹھانے کی اس کے اندر طاقت نہیں، اسی طرح نفسیاتی طاقت کا معاملہ ہے۔

منہج تعلیم کا وضع ہونا، کتب نصاب کا لکھا جانا اور تعلیم کے امور طے ہونا سب کا سب اسی اساس پر ہونا ضروری ہے۔ تاکہ طالب علم حصول علم کے لیے آئیں تو ان کے اندر ذوق وشوق اور رغبت ونشاط ہو۔

تعلیم کے بہترین طریقوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ معلّم اپنے درس میں کوئی لطیفے، اشعار اور چٹکلے بھی شامل کر لے تاکہ دل ودماغ اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔ نبی اکرمؐ بھی مزاح کرتے تھے مگر آپؐ تو اس میں بھی حق بات ہی کرتے تھے۔ آپؐ کے متنوع شیریں مزاح روایت کیے گئے ہیں جو آپؐ مانوس دلوں سے کرتے تھے لیکن ان میں شدت اور اسراف نہیں ہوتا تھا۔

حضرت علیؓ کا قول ہے: ان دلوں کو جمع کرو اور ان کو حکیمانہ لطیفے سناؤ، یہ بھی بدنوں کی مانند اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حضرت علیؓ ہی کا کہنا ہے: دلوں کو وقفے وقفے سے خوش کرتے رہو کیوں کہ دل جب اکتا جائیں تو یہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

ابو خالد الوالی نے کہا ہے: ہم نبیؐ کے صحابہؓ کے پاس بیٹھے ہوتے تو وہ اشعار گاتے اور دورِ جاہلیت کی اپنی یادیں تازہ کرتے۔

عہد تابعین میں سات فقہائے مدینہ میں ایک فقیہ قاسم بن محمدؒ سے جب لوگ مسلسل سوالات کرتے تو وہ کہتے: اہل عرب اور عام لوگوں، سب کا بات چیت میں حصہ ہے۔ لہٰذا ایک ہی چیز کی ہمارے اوپر بھرمار نہ کرو۔

ابن شہاب زہری لوگوں کو خطاب کرتے، پھر کہتے: اب اشعار سناؤ اپنی باتیں سناؤ۔ کان اور دل بھی، ایک ہی بات سن سن کر اکتا جاتے ہیں۔

دلوں کو آسودہ اور تازہ کرنے کے اس عمل میں دو فائدے ہیں:

۱- روزانہ کی تکرار اور تسلسل سے دلوں میں پیدا ہونے والی اکتاہٹ اور بدن کو لاحق ہونے والی تھکاوٹ اور بوریت کا ازالہ ہو جاتا ہے اور گزشتہ سطور میں حضرت علیؓ کے حوالے سے اسی چیز کا ذکر ہوا ہے۔ شاعر نے اس بارے میں کہا ہے:

وَالنَّفْسُ تَسْأَمُ اِنْ تَطَاوَلَ جِدُّهَا

فَاكْشِفْ سَآمَةَ جِدِّهَا بِمَزَاحٍ

"اگر زیادہ عرصہ دلوں کو سنجیدہ رکھا جائے تو وہ اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کی سنجیدگی کو مزاح کے ساتھ توڑتے رہو۔"

۲- دل دوبارہ سنجیدگی سے کام کرنے اور تحقیق و جستجو کی مشقت اٹھانے کے لیے تازہ ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے اسی بارے میں فرمایا ہے: میں کبھی کبھی اپنا دل کسی بے فائدہ شے سے لگاتا ہوں تاکہ دل حق کی طرف مائل ہونے میں اس سے طاقت حاصل کر لے۔

لیکن مزاح سے فائدہ اٹھانے میں دو باتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے:

۱- اس مزاح اور لطیفہ گوئی میں ایسی شدت اور حد سے تجاوز نہ ہو جو علم اور اہل علم کی مجالس کے شایانِ شان نہیں ہوتی۔ کیوں کہ یہ جگت بازوں اور بھانڈوں کا تھیٹر نہیں ہے۔

۲- یہ مزاح مناسب مقدار میں ہو اور سنجیدگی ہی اس کی اصل اور قاعدہ ہو۔ مزاح تو دراصل ایک استثناء ہے۔ کوئی بھی چیز جب اپنی حد سے تجاوز کرتی ہے تو اپنی ضد میں بدل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عبادت میں بھی اسی لیے غلو کو ناپسند کیا گیا ہے۔ تو مباح اور بے فائدہ باتوں میں کثرت کیسے درست ہو سکتی ہے؟

حضرت علیؓ کا قول ہے: گفتگو میں اتنی مقدار میں مزاح شامل کرو جس مقدار میں نمک کھانے میں شامل کیا جاتا ہے۔

۱۱- عملی مواقع کو تربیت و توجیہہ کے لیے اہم جاننا

سنت نبویؐ نے جن تربیتی مبادیات کو ہمارے لیے ورثہ میں چھوڑا ہے ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ان واقعات کے مواقع اور عملی تصرفات کو اہم جاننا چاہیے جو تربیت و تعلیم کا مناسب

موقع ہوں۔ ان مواقع پر مخصوص تربیتی انداز سے کام لینا چاہیے تاکہ طالب علم ان مواقع سے ایسا مثبت درس اخذ کریں کہ اس کو بھلا نہ سکیں۔

یہ کام تعلیم اور درس کو سامنے نظر آنے والے واقعہ سے مربوط کرنے اور اس کا ان حالات اور کیفیات کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے ہوسکتا ہے جن حالات میں سے لوگ گزر رہے ہوں۔ یہی موقع ہوتا ہے جب تعلیم اور تدریس کے نقوش ذہنوں میں راسخ اور دلوں میں ثبت ہو جاتے ہیں۔ اور کسی طول و تکرار سے کام لینے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

رسول اللہ ﷺ اس طرح کے مواقع کو تربیت و تعلیم اور عقائد کی تصحیح و تنقیح کے لیے استعمال کیے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ چونکہ اس طرح کے مواقع لوگوں کی زندگی میں قدرتی اور اتفاقی طور پر آجاتے لہٰذا آپؐ ان مواقع کو ایسے بلیغ درس اور مؤثر وعظ و نصیحت کا موقع بنائے بغیر نہیں چھوڑتے تھے جس سے آنکھیں بہہ نہ پڑتی ہوں اور دل پگھل نہ جاتے ہوں۔

ہم میں سے کون ہے جو اس اہم اور مشہور دن سے واقف نہ ہو جب قریش نے اس مخزومی عورت کے مسئلے کو اہم بنا لیا تھا جس نے چوری کا ارتکاب کیا تھا۔ قریش پر یہ گراں گزر رہا تھا کہ اس پر ہاتھ کاٹنے کی اللہ کی وہ حد جاری و نافذ ہو جو اُس نے اپنی کتاب قرآنِ مجید میں چور مرد اور عورت کے لیے مقرر کی ہے۔ تاکہ انھیں ان کے کیے کی سزا مل سکے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عبرت بن جائے!

قریش نے رسولِ خدا کے محبوب ابن محبوب جناب اسامہ بن زید کا سہارا لیا کہ آپؐ اس اہم مسئلہ میں ان کی سفارش کریں کہ عورت کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے اس کو جرمانہ کر دیا جائے یا کوئی اور سزا دے دی جائے۔

دراصل قریش اس موقع پر اس بات کو بھول گئے تھے کہ رحم و کرم اور چیز ہوتی ہے اور اللہ کی حد کا نفاذ ایک دوسری چیز! لہٰذا ایک ایسا بنیادی درس ناگزیر تھا جو سزاؤں کے نفاذ میں مساوات کے مفہوم کو ایک ثابت شدہ حقیقت بنا دے اور لوگوں کے درمیان اشرافیہ اور عامہ کے طبقاتی فرق کے باطل تصورات کو مٹا کے رکھ دے اور پوری قوت کے ساتھ یہ اعلان کرے کہ اللہ کی شریعت سب پر حکمران ہے اور سب کے اوپر فیصلوں کا نفاذ کرتی ہے اور اللہ کا کلمہ ہی بلند ہے

اس کے علاوہ ہر کلمہ ہیچ ہے۔ پھر اُسی وقت اور اسی جگہ تربیتی درس شروع ہوتا ہے جسے کان سماعت کرتے، دماغ سمجھتے اور دل ازبر کر لیتے ہیں کہ:

أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ يَا أُسَامَةُ؟ إِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الحَدَّ، وَ أَيْمُ اللّٰهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا!!

''اسامہ کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد [کے نفاذ کو روکنے] میں سفارش کر رہے ہو؟ تم سے پہلے لوگ اسی لیے تباہ ہوئے کہ جب ان میں سے کوئی ''معزز'' چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور چوری کا مرتکب ہوتا تو وہ اس کے اوپر حد جاری کر دیتے۔ اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا!!۔''

اسی طرح اس موقع کو بھی بھلایا نہیں جا سکتا جب رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ابراہیم کی وفات ہوئی اور اتفاق سے اسی روز سورج بھی گرہن زدہ ہو گیا۔ یہ ایسا موقع تھا جب کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ سورج اللہ کے نبیؐ کے بیٹے کی وفات پر گرہن زدہ ہوا ہے لہٰذا کہنے والوں نے کہا۔ دراصل جاہلیت میں اس طرح کا عقیدہ رائج تھا کہ سورج اور چاند کا گرہن زدہ ہونا کسی عظیم شخصیت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اگر ان لوگوں میں سے ہوتے جو اپنی ذات اور خاندان کے لیے دجل و فریب اور مبالغہ آرائی سے مقام بنانے کی کوششیں کرتے ہیں تو آپؐ اس واقعہ پر خاموش رہتے جو اتفاق سے لوگوں کے ہاں معروف اور رائج تصور کے موافق ہو گیا تھا۔ مگر آپؐ نے اس موقع کو غنیمت جانا کہ ایسے مفاہیم و معانی کی تصحیح، خرافات کی تردید اور فائدہ مند عملی حقیقت کی وضاحت فرما دی۔ آپؐ نے پوری ایمانی کیفیت اور مومنانہ وضاحت کے ساتھ فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ، لَا تَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَ لَا لِحَيَاتِهِ.

''لوگو! سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، یہ کسی کی موت اور زندگی کی وجہ سے گرہن زدہ نہیں ہوتیں!!۔''

اسی طرح ایک روز مضر قبیلے کے کچھ فقراء نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فقر و فاقہ کے آثار ان پر واضح دکھائی دے رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو آپؐ کو صدمہ ہوا۔ پھر آپؐ گھر میں داخل ہوئے پھر باہر آئے اور حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا۔ انھوں نے اذان دی۔ آپؐ نے نماز پڑھائی پھر لوگوں کو خطاب فرماتے ہوئے ان فقراء پر صدقہ کرنے کے لیے ابھارا کہ صدقہ لازمی کیا جائے خواہ کھجور کا آدھا حصہ ہی کیوں نہ ہو۔

اس موقع پر لوگوں کے فوراً انفاق کا مظاہرہ نہ کرنے کے باعث انصار کا ایک آدمی یہ فضیلت حاصل کرنے میں سبقت لے گیا۔ وہ آدمی ایک تھیلی لایا جو بمشکل ایک مٹھی کے برابر تھی یا اس سے بھی کم تھی اور یہ اچھا آغاز اور حسین نمونہ تھا۔ حدیث کے راوی حضرت جریرؓ کا کہنا ہے: پھر اس کے بعد لوگوں نے اس قدر صدقات دیے کہ میں نے دیکھا کہ اناج اور کپڑوں کے دو ڈھیر لگ گئے اور رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا کہ سونے سے لکھے صحیفے کی مانند چمک رہا تھا۔

اور یہ اس شخص کی حوصلہ افزائی کا بہترین اور مناسب موقع تھا جو کسی اچھے کام میں پہل کرے تو لوگ اس کی پیروی کریں، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَ أَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقَصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ، وَ مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً، كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا و وِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقَصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ[۷۹]

''جس نے اسلام میں کسی اچھے کام میں پہل کی اسے اس عمل کا بھی اجر ملے گا، اور اس پر کسی اور عمل کرنے والے کا اجر بھی لیکن ان میں سے کسی کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس نے اسلام میں کسی برے کام میں پہل کی اسے اس برائی کا گناہ بھی ہوگا اور ان لوگوں کی برائی کا بھی

۷۹۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (۱۰۱۷) اور ابن ماجہ اور ترمذی نے مختصراً روایت کیا ہے۔ ترغیب ۹۴

جنھوں نے اس کے بعد یہ برائی کی لیکن ان میں سے کسی کے گناہ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔"

علم کا زندگی کے ساتھ اور درس کا واقعہ کے ساتھ اسی طرح ربط و تعلق ہوتا ہے۔ اور معلّم زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے دور رہ کر محض کتابوں کے ساتھ ہی زندگی نہیں گزارتا بلکہ اپنے عمل تعلیم و تدریس کو ان واقعات سے مؤثر بناتا اور انھیں تعلیم و تربیت کے اہم اور مناسب مواقع سمجھتا ہے۔

۱۲۔ معاون ذرائع کو استعمال کرنا

رسولِ معلّم ﷺ کی سنت مطہرہ میں اصل تربیتی اُصولوں میں یہ اُصول بڑا اہم ہے کہ آپؐ ہر دستیاب سمعی و بصری ذریعے کو استعمال میں لاتے تھے اور اس سے مطلوبہ حقائق کی وضاحت میں کام لیتے تھے۔

یہ بات تو معلوم شدہ ہے کہ اس وقت کا ماحول کوئی ایسے ذرائع اور معاونات کی فراہمی و دستیابی میں مددگار نہیں تھا اور خود رسولِ اکرم ﷺ بنیادی طور پر اُمّی [ناخواندہ] تھے آپؐ پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے لیکن یہاں ہمیں جو چیز اہم دکھائی دیتی ہے وہ آپؐ کا پہلے تو ایک فکر اور تصور پیدا کرنا ہے پھر اس کو دستیاب حدود پر منطبق کرنا ہے۔

ہمارے اس موقف کی تائید میں بعض واضح مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً

● حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ:

خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ، خَطًّا بِیَدِہٖ، ثُمَّ قَالَ: ھٰذَا سَبِیْلُ اللّٰہِ مُسْتَقِیْمًا وَخَطَّ عَنْ یَّمِیْنِہٖ وَ شِمَالِہٖ ثُمَّ قَالَ: ھٰذِہِ السُّبُلُ لَیْسَ مِنْھَا سَبِیْلٌ اِلَّا عَلَیْہِ شَیْطَانٌ یَدْعُو اِلَیْہِ. ثُمَّ قَرَأَ: وَأَنَّ ھٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ [الانعام:۱۵۳][۸۰]

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے اپنے دست مبارک سے ایک لکیر

۸۰۔ مسند احمد، رقم ۴۴۳۳

کھینچی اور فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ ہے۔ پھر آپؐ نے اس لکیر کے دائیں اور بائیں لکیریں کھینچیں اور فرمایا: ان تمام راستوں پر شیطان موجود ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے. پھر آپ ؐ نے یہ آیت وَ اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ. [الانعام:۱۵۳] تلاوت فرمائی۔ ''یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اِسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں گے۔''

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے سورۂ انعام میں مذکور دس وصیتوں میں سے آخری وصیت کی تفسیر صحابہؓ کے سامنے فرمائی ہے۔ اور آپؐ نے اس میں صرف الفاظ سے تفسیر بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ موجود اور دستیاب معاون ذریعہ یعنی ریت کو استعمال کیا۔ ریت سے بورڈ کا کام لیا اور اس پر ہاتھ سے لکیریں کھینچیں، سیدھی لکیر کی صورت میں آیت میں مذکور اللہ تعالیٰ کی سیدھی راہ کو واضح کیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا ''یہ اللہ تعالیٰ کی سیدھی راہ ہے۔'' پھر وہ دیگر لکیریں کھینچیں جن کے اتباع سے بچنے کی آپ نے تنبیہ کی ہے اور یہ سب لکیریں درمیان کی سیدھی لکیر کے دائیں بائیں ٹیڑھی لکیریں تھیں اور ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ وہ راستے ہیں جن پر شیطان موجود ہے اور وہ اپنی طرف بلاتا ہے۔'' پھر آپؐ اس عملی وضاحت کا اختتام قرآنِ کریم کی آیت پڑھ کر کرتے ہیں، یوں موقع پر موجود افراد کے دل و دماغ میں ایک انمٹ نقش ثبت ہو گیا۔ یہاں رسول اللہ ﷺ نے سننے کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت کو بھی آیت کا مفہوم سمجھانے کے لیے شریک کر لیا۔

● حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ بِالسُّوْقِ، وَ النَّاسُ كَنَفَتَيْهِ، فَمَرَّ بِجَدْيٍ أَسَكَّ مَيِّتٍ، فَتَنَاوَلَهُ بِأُذُنِهِ ثُمَّ قَالَ: أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنَّ هٰذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ؟ فَقَالُوْا: مَا نُحِبُّ أَنَّهُ لَنَا بِشَيْءٍ، وَمَا نَصْنَعُ بِهِ؟ قَالَ: أَتُحِبُّوْنَ أَنَّهُ لَكُمْ؟ قَالُوْا: وَاللّٰهِ لَوْ كَانَ حَيًّا لَكَانَ عَيْبًا فِيْهِ، لِأَنَّهُ أَسَكُّ، فَكَيْفَ وَ هُوَ مَيِّتٌ؟ فَقَالَ: فَوَ اللّٰهِ لَلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ

۸۱ــ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ ترغیب: ۲۶۴۴

عَزَّوَ جَلَّ مِنْ هٰذَا عَلَیْکُمْ [81]

''رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ بازار میں سے گزرے تو بازار کی دونوں اطراف میں لوگ موجود تھے۔ آپؐ کا گزر بکری کے ایک مردہ چھوٹے کانوں والے بچے کے پاس سے ہوا۔ آپؐ نے اس کا کان پکڑ کر فرمایا: تم میں سے کون اسے ایک درہم میں خریدنا پسند کرے گا؟ لوگوں نے کہا: ہم تو اس سے کچھ لینا بھی پسند نہیں کرتے، ہم اسے کیا کریں گے؟ پھر آپؐ نے پوچھا: کیا تم اسے لینا پسند کرتے ہو؟ لوگوں نے کہا: واللہ! اگر یہ زندہ ہوتا تو بھی یہ عیب دار تھا کیوں کہ یہ بُچّا ہے اور اس حالت میں اسے لینا گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا تو اب مردہ کو لینا کیسے گوارا ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: واللہ! دنیا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بے وقعت ہے جتنا یہ تمھارے نزدیک بے وقعت ہے۔''

دیکھیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو جو بات سمجھانا چاہی اس کے لیے اس عجیب و غریب مددگار ذریعے کو کس طرح استعمال کیا۔ یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس کو آپؐ نے نہ خریدا، نہ تیار کیا اور نہ اس کو استعمال کرنے میں کوئی مشقت اٹھانا پڑی۔ یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جسے لوگ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے اور اس کے پاس سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اسے اس دنیا کی قدر و قیمت واضح کرنے کا ذریعہ بنا لیا جس پر لوگ ٹوٹے پڑتے بلکہ مرے جا رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک دنیا کی بے وقعتی اور حقارت واضح کرنے کا یہ ایسا درس ہے جو بکری کے ایک کان کٹے مردہ بچے سے تشبیہ کے باعث ذہن اور یادداشت میں انمٹ نقش ثبت کر گیا۔ آپؐ اس کا کان پکڑ کر پوچھتے ہیں کون ہے جو اس کو ایک درہم میں خرید لے؟ لوگ جواب دیتے ہیں تو آپؐ دوبارہ اُن سے پوچھتے ہیں یہاں تک کہ بالآخر ان کے ذہنوں میں مطلوب حقیقت کو واضح کر کے چھوڑتے ہیں کہ: وَاللّٰهِ! لَلدُّنْیَا أَهْوَنُ عَلَی اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَیْکُمْ''

واللہ! دنیا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ حقیر ہے جتنا تمھارے نزدیک یہ حقیر ہے۔''

اسی طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جن میں آپؐ نے کسی دینی، اخلاقی یا عقلی چیز کی قدر و قیمت کو واضح اور اجاگر کرنے کے لیے معاون وسائل و ذرائع کو استعمال کیا۔

۸۱- اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ ترغیب: ۲۶۴۴

کسی بھی مطلوب اور مقصود معنی و مفہوم کو واضح کرنے اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے مددگار ذرائع میں سے ایک طریقہ محسوس کیا جانے والا وہ اشارہ ہے جو سمجھائی جانے والی چیز کا محسوس چیز کے ساتھ ربط پیدا کر دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ غافل اور خبردار ہر شخص کو بات سمجھانے کے لیے اس اسلوب سے خوب کام لیتے تھے۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

● بخاری کی روایت کے مطابق ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا کہ: التَّقْوٰی هٰهُنَا ''تقویٰ یہاں ہے'' اور ساتھ تین بار اپنے سینے کی طرف اشارہ فرمایا۔ تقویٰ کی حقیقت بیان کرنے کے لیے دل کی طرف یہ اشارہ ان الفاظ سے زیادہ بلیغ تھا۔ اگر یہ کہا جاتا: التَّقْوٰی مَحَلُّهَا الْقَلْبُ [تقویٰ کا مقام دل ہے]۔ جو ان الفاظ پر اکثر لوگ کان نہ دھرتے اور اگر توجہ کرتے بھی تو شاید دل حاضر نہ ہوتے۔

● صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ ''میں مبعوث ہوا ہوں تو میرا اور قیامت کا فاصلہ ان دو جتنا ہے'' ساتھ آپؐ نے اپنی سبابہ اور وسطیٰ انگلیوں میں ذرا فرق رکھ کر اشارہ فرمایا۔

● رسول اللہ ﷺ کا انگلیوں کے اشارہ کے ساتھ اپنی بعثت کو قیامت سے قریب تر بیان کرنے کا اثر محض یہ الفاظ کہہ دینے سے زیادہ تھا کہ بُعِثْتُ قُرْبَ السَّاعَةِ [میں قیامت کے قریب مبعوث ہوا ہوں]

● اسی طرح بخاری میں حضرت سہل بن سعد کی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا، وَ أَشَارَ بِالسَّبَابَةِ وَالْوُسْطٰی وَ فَرَّجَ بَيْنَهُمَا

''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔'' ساتھ آپؐ نے اپنی سبابہ اور وسطیٰ انگلیوں کے درمیان ذرا فاصلہ رکھتے ہوئے اشارہ فرمایا۔

● اسی طرح حضرت معاذ بن جبلؓ سے کی گئی آپؐ کی گفتگو ہے جب آپؐ نے اُن کو بہت سی نصیحتیں فرمائیں اور آخر میں فرمایا: أَلَا أُدُلُّكَ عَلٰی مِلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهِ؟ قَالَ: بَلٰی!

قَالَ: كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا، وَ أَشَارَ اِلٰى لِسَانِهِ[۸۲] ''کیا میں تمھیں اس سارے معاملے کا حکم نہ بتا دوں؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کیوں نہیں، تو آپؐ نے فرمایا: ''اِسے بند رکھو''! اور اپنی زبان کی طرف اشارہ فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کے زبان کی طرف اس اشارہ نے حضرت معاذؓ اور ان تمام لوگوں کے ذہنوں میں جو اس موقع پر موجود تھے زبان کی اہمیت اور اس کی آفات کے بارے میں ایسی آگاہی بخشی کہ پھر وہ اسے فراموش نہ کر سکے۔

حضرت سہل بن سعدؓ کی یہ روایت بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہے کہ:

مَرَّ رَجُلٌ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ لِرَجُلٍ عِنْدَهُ جَالِسٌ: مَا رَأْيُكَ فِي هٰذَا؟ قَالَ: رَجُلٌ مِنْ أَشْرَافِ النَّاسِ، هٰذَا وَاللّٰهِ حَرِيٌّ اِنْ خَطَبَ أَنْ يُنْكَحَ، وَ اِنْ شَفَعَ أَنْ يُشَفَّعَ، فَسَكَتَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ مَرَّ رَجُلٌ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَا رَأْيُكَ فِي هٰذَا، فَقَالَ، يَا رَسُولَ اللّٰهِ هٰذَا رَجُلٌ مِنْ فُقَرَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ هٰذَا حَرِيٌّ اِنْ خَطَبَ أَنْ لَا يُنْكَحَ، وَاِنْ شَفَعَ أَنْ لَا يُشَفَّعَ، وَ اِنْ قَالَ أَنْ لَا يُسْمَعَ لِقَوْلِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "هٰذَا خَيْرٌ مِنْ مِلْءِ الْأَرْضِ مِثْلَ هٰذَا".[۸۳]

''نبیؐ کے پاس سے ایک آدمی گزرا تو آپؐ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا: اس کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: یہ لوگوں کے سردار آدمیوں میں سے ہے واللہ! اسے یہ حیثیت حاصل ہے کہ اگر یہ کسی کو شادی کا پیغام بھیجے تو اس کی شادی ہو جائے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائے۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر خاموش رہے۔ پھر ایک اور آدمی کا وہاں سے گزر ہوا تو آپؐ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا: اس کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ!

۸۲- ترمذی، حدیث حسن صحیح ہے۔ اس کی سند میں بہت زیادہ کلام ہے تاہم یہ اربعین نووی میں بھی شامل ہے۔

۸۳- بخاری و مسلم

یہ مسلمانوں کا ایک فقیر آدمی ہے، اس کی حیثیت یہ ہے کہ اگر کہیں شادی کا پیغام بھیجے تو کوئی شادی کے لیے تیار نہ ہو، اور اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی نہ جائے اور اگر کوئی بات کرے تو اس کی بات سنی ہی نہ جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اُس آدمی جیسے لوگوں سے زمین بھی بھر جائے تو یہ آدمی اُن سے پھر بھی بہتر ہے۔''

اور مذکورہ تمام مثالوں میں معلّم کے اپنے ہی وجود سے اشارے مہیا کیے گئے ہیں۔ یا تو دل کی طرف اشارہ ہے، یا ہاتھوں کی طرف اشارہ ہے، یا زبان کی طرف اشارہ ہے۔

۱۳۔ بہترین انداز اختیار کرنا

طالب علم کے دل و دماغ سے قریب تر اور اس کی سمع و بصر کو اچھا لگنے والا بہترین اور آسان ترین اسلوب اختیار کرنا بھی سنت نبویؐ کے مطابق تعلیم کے اُصول و آداب میں شامل ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ معلّم شاگردوں کو جو کچھ منتقل کرنا چاہتا ہے اس کی وضاحت نہایت اچھے انداز میں ہو سکے اور شاگردوں کے دل و دماغ میں یہ اچھی طرح ثبت ہو جائے۔

جو شخص بھی سنت نبویؐ کا مطالعہ کرتا ہو اور کتب احادیث سے شغفت رکھتا ہو وہ تربیت کے ایسے اسلوب اور معاون ذرائع کے ایسے استعمال دیکھے گا کہ آج تعلیم و تربیت سے وابستہ افراد انھیں اسلام کے ورثے میں ایک عجیب و غریب چیز خیال کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ جمعہ و عیدین کے عام خطبوں میں خطاب کا براہِ راست اسلوب اختیار کرتے تھے اور یہ موقع کی مناسبت سے ہوتا تھا۔ مگر دوسرے مواقع پر خطبے کا صرف براہِ راست اسلوب ہی اختیار نہیں کرتے تھے بلکہ ان تعلیمی عناصر کو بھی استعمال میں لاتے تھے جو خصوصاً نگاہوں کو خطاب پر جما دیتے اور توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔

یہاں صرف آپؐ کے اس خطبہ کا ذکر ہی کافی ہے جو آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یوم النحر [قربانی کے روز] منٰی کے مقام پر اس بہت بڑے اجتماع سے ارشاد فرمایا تھا جسے جزیرۃ العرب کے لوگوں نے اس دور کے سب سے بڑے اجتماع کے طور پر دیکھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس خطبہ میں جب خون، آبرو اور اموال کی حرمت واضح کرنا چاہی تو اس اہم بات کو براہِ راست اسلوب میں بیان نہ فرمایا جیسے بیشتر خطیب اور مقررین اپنے خطابات میں کرتے ہیں۔

آپؐ نے لوگوں کو بات سمجھانے کا آغاز ایک ایسے سوال کے ذریعے کیا جس نے ان کے شوق کو متحرک اور توجہ کو بیدار کر دیا۔

حضرت ابوبکرہؓ بیان کرتے ہیں:

أَنَّهُ قَعَدَ عَلٰى بَعِيرِهِ وَ أَمْسَكَ بِخِطَامِ الْبَعِيرِ ثُمَّ قَالَ: "أَيُّ يَوْمٍ هٰذَا؟". فَسَكَتْنَا، حَتّٰى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ سِوَى اسْمِهِ. فَقَالَ: "أَلَيْسَ يَوْمُ النَّحْرِ؟" قُلْنَا: بَلٰى، قَالَ: "فَأَيُّ شَهْرٍ هٰذَا؟" فَسَكَتْنَا حَتّٰى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ، فَقَالَ: "أَلَيْسَ بِذِي الْحَجَّةِ؟" قُلْنَا: بَلٰى. ثُمَّ سَأَلَهُمْ عَنِ الْبَلَدِ أَيْضًا فَسَكَتُوا ثُمَّ بَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْبَلَدُ الْحَرَامُ ثُمَّ قَالَ: "فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ، وَ أَمْوَالَكُمْ وَ أَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا". (۸۴)

"رسول اللہ ﷺ اپنی اونٹنی پر بیٹھے ہوئے تھے اور اونٹنی کی نکیل کو تھامتے ہوئے فرمایا: "یہ کون سا دن ہے؟" ہم خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم نے سمجھا کہ آپؐ اس کا کوئی اور نام رکھیں گے، پھر آپؐ نے فرمایا: "کیا یہ یوم النحر [قربانی کا روز] نہیں ہے؟" ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں، آپؐ نے فرمایا: "یہ مہینہ کون سا ہے؟" تو ہم خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم نے سمجھا کہ آپؐ اس کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟" ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں، پھر آپؐ نے شہر کے بارے میں استفسار فرمایا تو بھی لوگ خاموش رہے، آپؐ نے یہ بھی واضح فرمایا کہ یہ بلد الحرام

۸۴- مشہور حدیث ہے اسے بخاری و مسلم اور دیگر نے روایت کیا ہے۔ بخاری نے ایک سے زائد مقامات پر اس کو روایت کیا ہے۔ دیکھیے: فتح الباری ج ۱/ ۱۶۸

ہے پھر آپؐ نے فرمایا: تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزتیں اسی طرح حرام ہیں جس طرح یہ دن تمھارے اس مہینے میں، اس شہر میں حرام ہے۔"

امام قرطبیؒ صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں: آپؐ کا تین چیزوں کے بارے میں سوال کرنا اور ہر سوال کے بعد خاموشی اختیار کرنے کا مقصد ان چیزوں کے مفہوم کو ذہن میں تازہ کرنا تھا، تا کہ لوگ مکمل طور پر آپؐ کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس چیز کی عظمت کو اچھی طرح سمجھ لیں جس کے بارے میں آپؐ ان کو بتانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے آپؐ نے ان اشیاء کی حرمت میں مبالغہ اختیار کرتے ہوئے فرمایا: فَإِنَّ دِمَاءَ كُمْ......(۸۵)

اور كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا...... کی تشبیہ بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ دن، یہ مہینہ اور شہر سامعین کے دلوں میں پختہ اور پیوست تھا اور یہ ان کے ہاں خون، اموال اور آبروؤں کے برخلاف کیفیت تھی، کیوں کہ وہ ان چیزوں کو دورِ جاہلیت میں پامال کرتے تھے لہٰذا آپؐ نے واضح فرمایا کہ مسلمان کے خون، مال اور عزت آبرو کی حرمت اس شہر، دن اور مہینے سے بھی زیادہ ہے۔(۸۶)

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا یہ خطبہ عام انداز میں ارشاد نہیں فرمایا اور بیان کا ایسا اسلوب بھی اختیار نہ فرمایا جس سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی یا سستی لاحق ہو جاتی بلکہ آپؐ نے سوالات کے ذریعے عقلوں کو متحرک کر لیا اور مخاطبین کو اپنے ساتھ گفتگو میں یوں شریک کر لیا کہ گردنیں آپؐ کی طرف اُٹھ گئیں، نگاہیں آپؐ کے اوپر جم گئیں اور کان آپؐ کی بات کو سننے پر لگ گئے۔

اس خطبے کے اختتام پر آپؐ ایک بار پھر سامعین کو مخاطب کرتے ہیں اور اپنی امانت ادا کر دینے اور پیغام پہنچا دینے کی بابت انھیں گواہ ٹھہراتے ہوئے پوچھتے ہیں:

أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ "خبردار! کیا میں نے (پیغام) پہنچا دیا؟" تو ہر جانب سے آوازیں بیک وقت بلند ہوتی ہیں۔ نعم ہاں! آپؐ نے پیغام پہنچا دیا! پھر آپؐ فرماتے ہیں: اَللّٰهُمَّ فَاشْهَدْ! اے اللہ گواہ رہنا! ساتھ یہ فرماتے ہیں: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ "تم میں سے یہاں حاضر، ان تک یہ باتیں پہنچا دیں جو یہاں حاضر نہیں ہیں۔"

چونکہ مثالیں بیان کرنا اور تشبیہ سے کام لینا ذہن میں غیر موجود چیز کو محسوس صورت میں

۸۵-۸۶- الفتح الباری ۱/۱۶۸

پیش کرتا ہے اور بعید از گمان چیز کو واضح اور قریب کر کے پیش کرتا ہے اس لیے یہ اسلوب تاثیر کے اعتبار سے کامیاب ترین اسلوب ہے۔

سنت نبویؐ کا مطالعہ کرنے والا ان مثالوں اور تشبیہات سے سیرت النبیؐ کو لبریز پائے گا جو انسانی بلاغت کی چوٹی اور ادبی حسن کی رفعت ہیں اور رسول اللہ ﷺ اس ضمن میں قرآنِ کریم کی تشبیہات اور امثال کی پیروی کرتے تھے۔ صرف امام سیوطی کی الجامع الصغیر میں ایسی ۴۲ مثالیں درج ہیں اور ان میں سے ہر ایک ایسی ہے کہ گویا وہ خود معلّم ہے اور شرح و وضاحت کر رہی ہے۔ صرف چند مثالیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

● مَثَلُ الَّذِیْ یُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَیْرَ وَ یَنْسٰی نَفْسَهٗ، مَثَلُ الْفَتِیْلَةِ، تُضِیْءُ النَّاسَ وَ تُحَرِّقُ نَفْسَهَا(۸۷)

”اس آدمی کی مثال جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے اور اپنے نفس کو بھول جاتا ہے، اس شمع جیسی ہے جو لوگوں کو روشنی مہیا کیے رکھتی ہے اور اپنے آپ کو جلاتی رہتی ہے۔“

● مَثَلُ الْمُؤْمِنِ مَثَلُ النَّحْلَةِ، اِنْ اَكَلَتْ طِیِّبًا وَ اِنْ وَضَعَتْ طِیِّبًا، وَ اِنْ وَقَعَتْ عَلٰی عُوْدٍ لَمْ تُكْسِرْهُ(۸۸)

”مومن کی مثال شہد کی مکھی جیسی ہے کہ وہ اچھی چیز پر بیٹھتی ہے اور اس سے اچھی چیز ہی برآمد ہوتی ہے۔ اور اگر وہ لکڑی پر بیٹھ بھی جائے تو اس کو توڑتی نہیں۔“

● مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ الشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَیْنَ الْغَنَمَیْنِ، تَعِیْرُ اِلٰی هٰذِهٖ مَرَّةً وَ اِلٰی هٰذِهٖ مَرَّةً لَا یَدْرِیْ اَیُّهُمَا تَتْبَعُ(۸۹)

۸۷- احمد نے اسے روایت کیا ہے، بیہقی نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے۔ بیہقی نے کہا ہے: اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں سوائے ابو سبرہ کے اور وہ بھی قابل وثوق ہے۔ الفیض ج ۵/۵۱۴

۸۸- اسے طبرانی اور بزار نے ابی برزہ سے روایت کیا ہے اور ابی برزہ ضعیف ہے۔ طبرانی نے جندب سے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے جیسا کہ منذری نے کہا ہے۔ الفیض ج ۵/۵۱۰

۸۹- احمد نے اسے روایت کیا ہے۔ مسلم نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ الفیض ج ۵/۵۱۵

"منافق کی مثال دو ریوڑوں کے درمیان بچھڑی ہوئی بکری کی مانند ہے۔ کبھی وہ اِدھر بھاگتی ہے اور کبھی اُدھر، اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ کس ریوڑ میں شامل ہو۔"

● مَثَلِي وَ مَثَلُكُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَوْقَدَ نَارًا فَجَعَلَ الْفِرَاشُ وَالْجَنَادِبُ يَقَعْنَ فِيهَا، وَ هُوَ يَذُبُّهُنَّ عَنْهَا، وَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَفَلَّتُونَ مِنْ يَدِي. (۹۰)

"میری اور تمھاری مثال اس آگ جلانے والے جیسی ہے جو آگ جلائے تو پتنگے اور حشرات آ کر اس میں گرنے لگیں اور وہ آدمی ان کو آگ سے بچانے میں کوشاں ہو، میں (بھی) تمھیں کپڑوں سے پکڑ پکڑ کر آگ سے دور کھینچتا ہوں لیکن تم دامن چھڑا چھڑا کر میرے ہاتھ سے نکلے جاتے ہو۔"

اسی طرح صحیحین میں درج وہ مشہور مثالیں بھی اس ضمن میں موجود ہیں جن میں آپؐ نے فرمایا:

○ مَثَلُ الْقَائِمِ عَلَى حُدُوْدِ اللّٰهِ وَالْوَاقِعِ فِيهَا كَمَثَلِ قَوْمٍ اِسْتَهَمُوْا عَلَى سَفِيْنَةٍ، فَأَصَابَ بَعْضُهُمْ أَعْلَاهَا وَبَعْضُهُمْ أَسْفَلَهَا، فَكَانَ الَّذِيْنَ فِيْ أَسْفَلِهَا إِذَا اسْتَقَوْا مِنَ الْمَاءِ مَرُّوْا عَلَى مَنْ فَوْقَهُمْ فَقَالُوا: لَوْ أَنَّا خَرَقْنَا فِيْ نَصِيْبِنَا خَرْقًا وَ لَمْ نُؤْذِ مَنْ فَوْقَنَا، فَإِنْ يَتْرُكُوْهُمْ وَ مَا أَرَادُوا هَلَكُوا جَمِيْعًا، وَ إِنْ أَخَذُوْا عَلَى أَيْدِيْهِمْ نَجَوا و نَجَوا جَمِيْعًا.

"اس شخص کی مثال جو اللہ کی حدود پر قائم ہوا اور اس کی جو ان میں مبتلا ہو گیا ہو ان لوگوں جیسی ہے جنھوں نے ایک کشتی کے حصے بذریعہ قرعہ باہم تقسیم کر لیے تو کچھ لوگوں کے حصے میں اوپر کی منزل آئی اور کچھ کے حصے میں نیچے کی منزل۔ پھر جو لوگ نیچے تھے ان کو جب پانی لینے کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے اوپر والوں کے پاس جاتے۔ ان نیچے والوں نے کہا کہ کاش ہم اپنے حصے میں سوراخ کر لیتے اور پانی لے لیتے اور اوپر والوں کو ان کے ارادے پر

۹- اسے احمد اور مسلم نے جابر سے روایت کیا ہے۔ اور بخاری نے بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ الفیض ج ۵/ ۵۱۸

چھوڑ دیتے ہیں تو سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر ان کے ہاتھ پکڑ لیں گے تو وہ بھی بچ جائیں گے اور دوسرے بھی سب بچ جائیں گے۔''

○ مَثَلِي وَ مَثَلُ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِي، كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى بَيْتًا فَأَحْسَنَهُ وَأَجْمَلَهُ إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فِي زَاوِيَةٍ مِنْ زَوَايَاهُ، فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوفُونَ بِهِ وَيَعْجَبُونَ لَهُ، وَ يَقُولُونَ: هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ؟ فَأَنَا تِلْكَ اللَّبِنَةُ وَ أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ!!

''میری اور مجھ سے قبل کے انبیاء کی مثال اس آدمی جیسی ہے جو ایک مکان بنائے اور اس کو آراستہ پیراستہ کرے مگر ایک کونے میں ایک اینٹ لگانا چھوڑ دے۔ لوگ اس مکان کو دیکھنے کے لیے اس کے اردگرد گھوم رہے ہوں اور اس پر پسندیدگی کا اظہار کر رہے ہوں اور یہ بھی کہہ رہے ہوں کہ یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی...... (انبیاء کی عمارت) میں یہ اینٹ میں ہوں (جو ابھی لگنا باقی تھی) اور میں خاتم النبیین ہوں!!''

اسی طرح کہانی کا انداز بھی دل و دماغ میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اسے اہمیت دی ہے اور رسولوں کی خبریں اور اہل کفر و اہل ایمان کی کشمکش کے واقعات ایسے اسلوب میں بیان کیے ہیں جو دلوں میں ثبت ہو جاتے، شکوک وشبہات کے شکار لوگوں کا شک دور کر دیتے، متعجب و حیران پھرنے والوں کی رہنمائی کرتے اور ہدایت پا جانے والوں کو مزید ہدایت عطا کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی مخصوص معانی اور اُصولوں کی تفہیم اور ذہن نشین کرانے کے لیے کہانی کے بیان سے کام لیا۔ مثلاً انسان کی خطرات سے نجات میں اخلاص کی تاثیر کا بیان، جیسے غار والے تین آدمیوں کا قصہ۔ اسی طرح نعمت کے باقی رہنے میں شکر کی تاثیر اور نعمت کے زوال پذیر ہو جانے میں ناشکری کی تاثیر کا بیان جیسے اندھے، کوڑھی اور کانے کا قصہ۔ اسی طرح کسی بھی چیز پر رحم کرنے کا اچھا انجام نکلنا خواہ وہ چیز حیوان ہی کیوں نہ ہو، جیسے اس آدمی کا قصہ جس نے پیاس کی شدت سے ہانپتے ہوئے ایک کتے کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے صلے میں اسے بخش دیا۔ اسی طرح اور بہت سے قصے احادیث کی کتب میں موجود ہیں جو اس ضمن میں بطورِ حوالہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔

۱۴- سوالات اور بات چیت کے ذریعے دلچسپی پیدا کرنا

بسا اوقات رسول اللہ ﷺ کسی علمی حقیقت کو متعلمین ہی کے منہ سے نکلوانے یا ان کے ذہنوں کو اس حقیقت کو پالینے کے لیے تیار کرنے کی غرض سے استنباطی طریقہ اختیار فرماتے تھے تاکہ اس طرح اُن کے دل اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے راغب اور دماغ اسے جاننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ سامعین کے سامنے سوال رکھنے کا طریقہ ہوتا تھا کہ لوگ اُس سوال کا جواب خود دیں اور اگر نہ جانتے ہوں تو صحیح جواب آپؐ سے سن لیں گے۔

امام بخاریؒ نے اپنی ''صحیح'' میں ''بَابُ طَرْحِ الْإِمَامِ الْمَسْأَلَةَ عَلٰى أَصْحَابِهِ لِيَخْتَبِرَ مَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ. [امام کا اپنے ساتھیوں کی علمی جانچ کے لیے سوال پوچھنے کا باب] ذکر کیا ہے اور اس باب کے تحت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث رکھی ہے:

> أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِنَّ مِنَ الشَّجَرَةِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا، وَإِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ، حَدِّثُونِي: مَا هِيَ؟ قَالَ: فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَوَادِي. قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: فَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ ثُمَّ قَالُوا: حَدِّثْنَا مَا هِيَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: هِيَ النَّخْلَةُ.(۹۱)

> ''نبی کریمؐ نے فرمایا: درختوں میں سے ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں ہیں اور وہ مؤمن کی مانند ہے۔ مجھے بتاؤ کہ وہ درخت کون سا ہے؟ حضرت عبداللہ کہتے ہیں: لوگوں کی توجہ صحراء کے درختوں کی طرف چلی گئی۔ لیکن میرے دل میں آیا کہ یہ کھجور ہے۔ پھر لوگوں نے کہہ دیا: یارسول اللہ ﷺ! بتا دیجیے یہ کون سا درخت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ کھجور ہے!''

دیکھیے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے سامنے اس حقیقت کو سیدھے انداز میں بیان نہیں کیا کہ مسلمان کھجور کی مانند ہوتا ہے۔ بلکہ آپؐ نے لوگوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنا چاہا اور انھیں اپنے اردگرد نگاہ دوڑانے پر متوجہ کیا۔ ان کے اپنے ساتھ بات چیت میں شریک کیا۔ دراصل طالب علم کی حیثیت ایک ریکارڈر کی نہیں ہوتی جو چلتا جاتا ہے خود کچھ نہیں کرتا اور وہ ریکارڈنگ تو کرتا

۹۱- بخاری مع فتح الباری ج ۱/۱۵۲

ہے لیکن سوچتا نہیں۔ طالب علم تو ایک زندہ اور عقل رکھنے والا وجود ہے جو تحقیق بھی کرتا ہے اور سوچتا بھی ہے، گفتگو بھی کرتا ہے اور بحث بھی، غلطی بھی کرتا ہے اور درست کام بھی۔

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں عمرو بن شعیب کی حدیث عن ابیہ عن جدہ کے واسطے سے ذکر کی ہے کہ آپؐ نے [صحابہؓ سے دریافت] فرمایا:

"أَيُّ الخَلْقِ أَعْجَبُ اِلَيْكُمْ اِيْمَانًا؟" قَالُوا: اَلْمَلَائِكَةُ. قَالَ: "وَ مَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ؟!" قَالُوا: فَالنَّبِيُّونَ. قَالَ: "وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَالوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ؟!" قَالُوا: نَحْنُ. قَالَ: وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ وَ أَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ؟!" فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "أَلَا اِنَّ أَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَيَّ اِيْمَانًا لَقَوْمٌ يَأْتُونَ مِنْ بَعْدِكُمْ، وَ يَجِدُوْنَ صُحُفًا فِيْهَا كِتَابٌ يُؤْمِنُونَ بِمَا فِيْهَا". (۹۲)

"رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا: تمھیں ایمان کے اعتبار سے کون سی مخلوق عجیب دکھائی دیتی ہے؟ لوگوں نے کہا فرشتے۔ آپؐ نے فرمایا: ان کے لیے کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں جب کہ وہ اپنے رب کے پاس ہیں؟" لوگوں نے کہا: تو پھر نبیؑ [ایمان کے اعتبار سے زیادہ عجیب مخلوق ہیں] آپؐ نے فرمایا: "اُن کا بھی کیا مسئلہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں جب کہ اُن پر وحی نازل ہوتی ہے؟۔" ہم نے کہا: تو ہم [وہ مخلوق ہیں]۔ آپؐ نے فرمایا: "تمھیں کیا ہے کہ تم ایمان نہ لاؤ جب کہ میں تمھارے درمیان ہوں؟۔" پھر آپؐ نے خود ہی فرمایا: "سنو! میرے نزدیک مخلوق میں ایمان کے اعتبار سے عجیب ترین وہ قوم ہے جو تمھارے بعد آئیں گے، اور ایسے صحیفے پائیں گے جن میں کتاب لکھی ہوگی اور وہ اس پر ایمان لے آئیں گے۔"

۹۲- ابن کثیر نے اسے حسن بن عرفہ کی طرف منسوب کیا ہے اور ابی حاتم سے نقل کیا ہے کہ اس کا راوی مغیرہ بن قیس منکر الحدیث ہے۔ مگر اس کا ایک شاہد ابویعلی ابن مردویہ اور حاکم نے عن عمر مرفوعاً ذکر کیا ہے اور اس میں ایک راوی کے ضعیف ہونے کے باوجود اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ انس بن مالک سے بھی مرفوعاً اس طرح کی روایت ہے۔ [تفسیر ابن کثیر ج۱/۵۲]

رسول اللہ ﷺ صحابہؓ کے سامنے جو کچھ بیان کرنا چاہتے تھے آپؐ نے اسے سوال کر کے، بات چیت کے ذریعے جواب حاصل کرنے کی مفید کوشش کے بعد بیان کیا اور جب آپؐ نے مطلوبہ جواب بیان کیا تو وہاں موجود لوگوں کے دل اس حقیقت کو جاننے کے لیے شوق سے بھر چکے تھے۔

رسول اللہ ﷺ سامعین و حاضرین کی توجہ اچھی طرح اپنی طرف مبذول کرانے اور اپنی بات سنانے کے لیے ان کے دلوں میں شوق پیدا کرنے کے لیے ایک طریقہ یہ بھی اختیار کرتے تھے کہ بعض ایسے الفاظ کے معانی پوچھ لیتے تھے جو سامعین کے نزدیک معروف اور مسلّمہ ہوتے تھے۔ لوگ آپؐ کے سوال کے جواب میں وہی عام اور معروف معنی بیان کرتے جو ان کے ہاں رائج اور مشہور ہوتا۔ جب سامعین یہ جواب دیتے تو رسول اللہ فوراً ان کو ایک نیا معنی اور مفہوم بتاتے۔ یہ معنی اکثر مجازی مفہوم پر مبنی ہوتا تھا۔ لوگ اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے مگر رسول اللہ ﷺ کو تو یہ حق حاصل تھا کہ آپؐ لفظ کا مخصوص معنی بیان فرما سکتے تھے۔

مثلاً ایک روز رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا:

"مَا تَعُدُّوْنَ الصُّرَعَةَ فِيْكُمْ" قَالُوْا: اَلَّذِیْ لَا تَصْرَعُهُ الرِّجَالُ، قَالَ: لَيْسَ ذٰلِكَ، وَلٰكِنَّ الَّذِیْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ(۹۳)

"تم پہلوان کسے کہتے ہو؟" لوگوں نے کہا: جس کو دوسرے آدمی پچھاڑ نہ سکیں۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں [پہلوان وہ نہیں] بلکہ وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھتا ہو!"

اسی طرح ایک بار آپؐ نے فرمایا:

"أَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسُ"؟ قَالُوْا: اَلْمُفْلِسُ فِيْنَا مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهُ وَلَا مَتَاعَ، فَقَالَ: "اَلْمُفْلِسُ مِنْ أُمَّتِیْ مَنْ يَّأْتِیْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ وَ صِيَامٍ وَزَكَاةٍ. وَيَأْتِیْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا، وَقَذَفَ هٰذَا، وَأَكَلَ مَالَ هٰذَا، وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا، وَضَرَبَ هٰذَا، فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُّقْضٰى مَا عَلَيْهِ، أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ

۹۳- اسے مسلم نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔

فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ(۹۴)

''کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟'' لوگوں نے کہا: ہمارے درمیان مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال و متاع نہیں ہوتا۔ آپؐ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ فرد ہے جو قیامت کے روز نماز، روزے اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا۔ لیکن اس حال میں آئے گا کہ اُس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر جھوٹا الزام لگایا ہوگا۔ کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔ لہٰذا اس کی نیکیاں لی جائیں گی اور ہر کسی کو [اس کے حق کے مطابق] ان نیکیوں میں سے حصہ دے دیا جائے گا۔ اگر اس شخص کے اوپر حق کی ادائیگی پوری ہونے سے قبل اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو ان حقداروں کی برائیاں لی جائیں گی اور اس کے ذمے ڈال دی جائیں گی۔ پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنے رفقاء کے سامنے ایک غیر مانوس جملہ رکھا تا کہ وہ اس کا مفہوم بتائیں اور جب جواب آئے اور وہ غلط ہو تو آپؐ اس کی تصحیح فرما دیں اور جو معنی آپؐ بیان کرنا چاہتے ہیں وہ اچھی طرح ان کی سمجھ میں آ جائے۔ اس ضمن میں یہ حدیث بھی بیان کی جا سکتی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اُنْصُرْ أَخَاکَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم!۔''

یہ جملہ عرب جاہلیت میں ایک ضرب المثل کی مانند مشہور اور عام تھا اور اس میں عصبیت کی حمایت اور نصرت کرنے کا اشارہ موجود ہے کہ اپنی قوم کے ہر فرد کا دفاع کیا جائے خواہ وہ حق پر ہوں یا ناحق پر۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ یہ جملہ زبان سے ادا فرمایا تو سننے والے حیرت و تعجب میں مبتلا ہو گئے کہ اسلام تو سراسر عدل کا نظام لایا ہے، اس کا حکم ہے کہ تم ہر صورت عدل سے کام لو خواہ متاثر ہونے والا فریق تم خود ہو یا تمھارے والدین ہوں یا تمھارے قریبی

۹۴- اسے مسلم اور ترمذی وغیرہ نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ ترغیب ۳؍۱۱۲

رشتے دار ہوں۔ اسلام نے تو واشگاف الفاظ میں فرمایا: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى......

اور جب اسلام عصبیت کی ہر شکل اور ہر قسم سے پاک ہے تو اس کا وہ رسول جو اس دینِ حق و ہدایت کو لے کر آیا ہے وہ جاہلیت کے اس کلمے کو کیسے برقرار رکھ سکتا ہے؟

اصحابِؓ رسول نے اسی بنا پر فوراً یہ سوال کر دیا تھا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم اس کے مظلوم ہونے پر تو اس کی مدد کریں گے لیکن جب وہ ظالم ہو تو پھر کیسے اس کی مدد کر سکتے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: تَمْنَعُهُ مِنَ الظُّلْمِ، فَذٰلِكَ نَصْرٌ لَهُ (۹۵)

''تم اس کو ظلم سے باز رکھو گے تو یہ بھی اس کی مدد ہو گی۔''

اور کسی قریبی رشتے دار اور دوست کی نصرت میں عدل کا بنیادی تقاضا بھی یہی ہے۔ اگر اس کو ظلم اور باطل پر مدد فراہم کی جائے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو دنیا میں مصائب کے منہ میں دھکیل دیا گیا اور آخرت میں آگ میں پھینک دیا گیا۔ جب کہ اسے ظلم سے روکنے، منع کرنے اور باز رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے شیطان سے دور رکھا جائے، رحمٰن کے قریب کیا جائے، آتش جہنم سے بچایا جائے اور جنت کے قریب تر کیا جائے۔ اسی بنیاد پر تو یہ حقیقی نصرت کہلاتی ہے۔

اگر یہ بہت بڑا مفہوم تقریری انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تو صحابہؓ کے اندر سوچ بچار اور غور وفکر کی وہ بیداری پیدا نہ ہوتی جس کا مظاہرہ انھوں نے یہ مشہور جملہ سن کر کیا اور اس جملے نے ان کو اس کے ظاہری مفہوم پر تعجب میں مبتلا کر دیا اور وہ اس کو ناپسند کرتے ہوئے اس کے مفہوم کو جاننے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے استفسار کرنے لگے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے وہ جملے بھی اس سلسلے میں بیان کرنا مفید ہیں جو آپؐ ایسی صورت اور انداز میں ادا فرماتے تھے کہ سامعین کی توجہ کو مکمل طور پر اپنی طرف مرکوز کر لیتے تھے۔

مثلاً ایک بار آپؐ نے صحابہؓ کی موجودگی میں فرمایا:

وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ.

''اللہ کی قسم وہ صاحب ایمان نہیں ہو سکتا،

۹۵- اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔

اللہ کی قسم وہ صاحب ایمان نہیں ہو سکتا،

اللہ کی قسم وہ صاحب ایمان نہیں ہو سکتا!"

رسول اللہ ﷺ نے قسم کے صیغے اور تکرار کے ساتھ یہ جملہ ادا فرمایا اور ضمیر بھی غائب استعمال فرمائی جس سے ایک ایسے منفی فعل کی صورت سامنے آ رہی تھی جس کا فاعل معلوم نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ نے جب یہ جملہ تکرار کے ساتھ زبانِ رسالتؐ سے سنا تو دریافت کیا: یا رسول اللہ ﷺ! وہ آدمی تو ناکام و نامراد ہو گیا، لیکن یہ ہے کون؟ پھر آپؐ نے فرمایا:

مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ[۹۶] "وہ شخص جس کا ہمسایہ اس کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہ ہو"

دیکھیے اگر اس جملے کو معمول کے انداز میں بیان کر دیا جاتا تو یقیناً وہ تاثیر پیدا نہ ہوتی جو رسول اللہ ﷺ کے اختیار کیے گئے انداز سے پیدا ہوئی۔

ان ساری باتوں کے ساتھ اہم بات یہ ہے کہ استاد اپنے پیشے پر ایمان رکھتا ہو، علم کی تبلیغ و ترسیل کا شدید متمنی ہو، اپنے شاگردوں کو ترقی کی منزل طے کرانے کا خواہش مند ہو، شاگردوں کو بیٹے اور خود کو ان کے لیے باپ ہونے کا احساس رکھتا ہو۔ شاگردوں کے دلوں میں جو کچھ ہو اس تک پہنچنے کی خواہش رکھتا ہوں اور جو کچھ اپنے دل میں ہو اس کو ان تک پہنچانے کی حرص رکھتا ہو، اپنے مدعا کو ہر ممکن آسان طریقے سے بیان کرتا ہو خواہ بات کتنی ہی واضح اور صاف کیوں نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ تو اس بات کے شدید خواہش مند ہوا کرتے تھے کہ جو کچھ آپؐ کے دل میں ہے اس کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کریں اور اس کا وہی مفہوم سمجھا اور لیا جائے جو آپؐ چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آپؐ سامع کو بات سمجھا کر چھوڑتے تھے۔

مفہوم تک پہنچانے اور بہترین مفہوم پیش کرنے اور موقع کی مناسبت سے بات کرنے میں رسول اللہ ﷺ اسلوب بیان کی جس بلند چوٹی پر فائز تھے اس نے بھی آپؐ کو اس ضمن میں

۹۶- اسے منذری نے الترغیب میں ابی شریح الکعبی کی حدیث سے بخاری کی طرف منسوب کیا ہے، اس پر حافظ ابن حجر نے الفتح میں استدراک کیا ہے کہ بخاری میں یہ حدیث اس صیغے میں نہیں اسے دیکھ لیا جائے اور احمد نے اس کو مسند میں دو مقامات پر روایت کیا ہے، اس میں لَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ نہیں ہے۔

مدد فراہم کر رکھی تھی۔ اسی طرح ادائے بیان کا وہ حسین طریقہ بھی آپؐ کا مددگار تھا جو آپؐ ہر فرد سے اور ہر موقع و مقام پر الگ الگ اختیار فرماتے تھے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں:

''رسول اللہؐ کا کلام، کلامِ فاضل ہوتا تھا، اسے ہر سننے والا سمجھ سکتا تھا۔''(۹۷)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں: ''نبیؐ جب کوئی بات کہتے تو اسے تین بار دہراتے یہاں تک کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جاتا۔''(۹۸)

رسول اللہ ﷺ کے جن اصحابِ کرامؓ نے آپؐ سے تعلیم حاصل کی اور آپؐ کے منبعِ نور سے روشنی پائی وہ بھی اخلاق کی تعلیم دینے، حق کی طرف رہنمائی کرنے، اپنے مقصد تک پہنچنے میں مددگار طریقوں کو اختیار کرنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے اور عقلوں کو جلا بخشنے میں آپؐ ہی کا اسوہ پیش نظر رکھتے اور اسی کا اتباع کرتے تھے۔

اس طرزِ تعلیم کی صرف ایک زندہ تصویر ذیل میں پیش کی جاتی ہے جس نے جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہؓ کی سوچ اور فکر کو نادر بنا دیا تھا، حضرت ابوہریرہؓ بذاتِ خود بیان کرتے ہیں کہ ان کا ایک بار مدینہ کے بازار سے گزر ہوا تو کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا:

''اے اہل مدینہ تمھیں کس چیز نے بے بس کر رکھا ہے؟

لوگوں نے پوچھا: ابوہریرہ آپ نے ہماری کونسی بے بسی دیکھی ہے؟

آپؓ نے کہا: اللہ کے رسولؐ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے اور تم یہاں ہو! کیا تم نہیں جا سکتے اور اپنا حصہ نہیں لے سکتے؟

لوگوں نے کہا: ابوہریرہ یہ تقسیم کس جگہ ہو رہی ہے؟

آپؓ نے کہا: مسجد میں!

لوگ بھاگتے ہوئے نکلے اور مسجد میں پہنچ گئے۔ پھر واپس بازار میں آ گئے۔ حضرت ابوہریرہؓ ابھی بازار میں وہیں کھڑے تھے۔ لوگوں نے کہا: ابوہریرہ ہم مسجد میں گئے اور اندر جا کر

۹۷- ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے، حدیث: ۴۸۳۹

۹۸- بخاری نے اسے روایت کیا ہے۔

دیکھا، ہمیں تو وہاں پر کوئی چیز تقسیم ہوتی دکھائی نہیں دی!

آپؐ نے کہا: کیا تمھیں مسجد میں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا؟ لوگوں نے کہا: کیوں نہیں...... ہم نے کچھ لوگوں کو نماز پڑھتے، کچھ کو قرآن پڑھتے اور کچھ کو حلال و حرام پر مذاکرہ کرتے دیکھا ہے!

آپؐ نے فرمایا: تمھارا بھلا ہو...... یہی اللہ کے رسولؐ کی میراث ہے۔[۹۹]

---oo---

۹۹- طبرانی نے اسے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے دیکھیے ترغیب، حدیث: ۱۳۸، اور ہیثمی نے بھی اسی طرح مجمع الزوائد میں اسے حسن کہا ہے۔ مگر عراقی نے احیاء علوم الدین کی تخریج میں کہا ہے: اس کی اسناد میں جہالت اور انقطاع ہے۔

اثرات وثمرات

یہ رہنما نبوی تعلیمات جو ہم نے علم، حصول علم اور تعلیم کے حوالے سے ایک بہت بڑی تعداد میں پیش کی ہیں [اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے باوجود ہم اس تمام مواد کا احاطہ نہیں کر سکے جو اس ضمن میں کتب کے اندر موجود ہے] یہ محض صفحات پر بکھری روشنائی نہیں ہے بلکہ اسلامی خطوں کی زمین پر اس کے بہترین اثرات ونتائج رونما ہوئے۔اور یہ تعجب وحیرت کی بات نہیں ہے کیوں کہ یہ محض باتیں نہیں ہیں جو صرف کرنے کے لیے ہوتی ہیں بلکہ یہ ایک دین ہے جس پر اعتقاد رکھا جاتا ہے۔ایک طریقہ اور نہج ہے جس پر چلا جاتا ہے، احکام ہیں جن کی اطاعت کی جاتی ہے، تعلیمات ہیں جن کا نفاذ کیا جاتا ہے اور ایک دعوت ہے جس پر لبیک کہا جاتا ہے۔

علم کی طرف اس دعوت، اس کی پذیرائی، اس کے اہل کی قدردانی اور اس کے حصول کی ترغیب وتحریص کے اسلامی زندگی میں واضح اثرات اور عظیم نتائج مرتب ہوئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ ہم صحابۂ کرامؓ کو ہر طرح کے میسر اور دستیاب ذرائع کو استعمال میں لاتے ہوئے سرچشمۂ نبوت سے سیراب ہونے اور زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کے حریص اور متمنی دیکھتے ہیں۔حضرت عمر بن خطابؓ کا بیان ہے کہ: میں اور میرا ایک انصاری ہمسایہ جو مدینہ کے بالائی محلے میں بنی امیہ بن زید کے گھروں کا رہائشی تھا ہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنے کی باری مقرر کر رکھی تھی، ایک روز وہ آپؐ کی خدمت میں ٹھہرتا تھا اور ایک روز مَیں۔جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہوتا تو میں اسے اس روز کی وحی وغیرہ کی خبریں دیتا اور جب وہ آپؐ کی خدمت میں ہوتا تو وہ بھی ایسے ہی کرتا۔[1]

اسی طرح صحابۂ کرامؓ نبیؐ کی زندگی میں اور آپؐ کے بعد ایک دوسرے سے دریافت

۱۔ البخاری، باب التناوب فی العلم

کرتے رہتے تھے اور ایک دوسرے سے سیکھتے رہتے تھے۔ کئی تو لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے، سمندر کا سفر کر کے کچھ لوگوں کے پاس جاتے تھے خواہ انھیں صرف ایک حدیث کے لیے جانا پڑتا، دراصل وہ حدیث کو اس کے اس براہِ راست مصدر سے حاصل کرنے کی تڑپ رکھتے تھے جس نے حدیث نبی کریمؐ سے خود سماعت کی ہو۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کیا کرتے تھے۔

صحابۂ کرامؓ کے بعد تابعینؒ بھی اسی طرح صحابہؓ کے نقش قدم پر چلے۔ امام دارمی نے بسر بن عبداللہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا: اگر مجھے ایک حدیث سننے کے لیے بھی کسی دور دراز شہر کا سفر کرنا پڑتا تو میں کرتا تھا۔ (۲)

ابوالعالیہؒ کہتے ہیں: ہم صحابہؓ کی روایت کردہ احادیث سنتے تھے تو اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے تھے جب تک خود اُن کے پاس جا کر ان سے نہ سن لیتے۔ (۳)

پھر ان کے بعد حدیث وسنت کے علماء کا طریق بھی یہی رہا، یعنی حدیث کی اسناد میں اسلوب اور ذریعوں کو کم سے کم کرنے اور بالائی سند سے حدیث لینے کی خاطر جدوجہد کرنا تاکہ حتی الامکان علم اس کے اولین مصدر یا اس کے قریب ترین مصدر سے حاصل کیا جا سکے۔

ہم نے تعلّم کے آداب کے تحت طلب علم کے سلسلے میں مسلمان علماء کے سفروں اور علم کی جستجو اور تحقیق میں اٹھائی جانے والی سختیوں کا ذکر کیا ہے جو آج تک بطور مثال بیان کی جاتی ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کی مساجد جہاں بھی تھیں وہ علم کا گہوارہ اور تعلیم کے مدارس بن گئی تھیں۔ جو بھی مسجد تیار ہوتی اس میں ایک یا ایک سے زائد حلقے قائم ہو جاتے جن میں طلبائے علم اپنے اساتذہ سے دین، لغت، ادب، تاریخ اور بشریات وغیرہ کے ان تمام موضوعات پر تعلیم حاصل کرتے جو اس وقت لوگوں کے نزدیک دینی ودنیاوی اعتبار سے اہم تھے۔

اس طرح عام مساجد یا جامع مساجد عوامی یونیورسٹیاں بن گئی تھیں جن کے دروازے صبح و شام، گرمی سردی میں چھوٹے بڑے، مرد عورت، آزاد غلام، کالے گورے اور امیر غریب

۲۔ سنن الدارمی ۱/۱۱۴

۳۔ فتح الباری ج ۱/۲۰۲ الحلبی

حصولِ علم کے ہر خواہش مند کے لیے کھلے ہوتے تھے کہ وہ ان حلقوں اور مجلسوں سے استفادہ کر سکتا تھا۔ ان یونیورسٹیوں کی کوئی فیس تھی نہ اخراجات اور نہ کوئی شرائط وضوابط بس حصولِ علم کی رغبت، خواہش اور تعلیم کو عام کرنے کا جذبہ درکار تھا۔

پھر یہی عوامی یونیورسٹیاں آگے چل کر ایسی علمی یونیورسٹیاں بن گئیں جن کے باقاعدہ اساتذہ تھے، طلبہ تھے، صدر تھے، اوقاف تھے اور ایک باقاعدہ نظام تھا، جیسے مراکش کے شہر فاس کی جامعہ قرویین، تیونس کی جامعہ زیتونہ اور مصر کی جامعہ ازہر۔ یہ جامعات پوری دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیاں شمار ہوتی ہیں۔ یہ یونیورسٹیاں اپنی اس اسلامی انفرادیت کی ہمیشہ امین رہیں کہ یہ ادارے ہر کسی کے لیے ہیں، یہاں رنگ ونسل اور طبقہ وگروہ کی کوئی تفریق اور تقسیم نہیں ہے، یہاں کوئی غلام ہو، فقیر ہو یا کمزور کوئی بھی محروم نہیں رہتا۔

۳۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے منہجی تعلیم کے لیے نظامی مدارس کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں سے قبل تاریخ مدرسہ (School) کے اس مفہوم سے آشنا نہیں تھی جو آج لیا جاتا ہے۔ نظامی مدارس اور اسی طرز کے دیگر مدارس مسلمان امراء، سلاطین اور اہل خیر نے مختلف اسلامی ادوار میں قائم کیے۔

۴۔ مختلف علوم کی تدوین وتالیف کی جو وسیع تحریک برپا ہوئی یہ بھی سب سے پہلے حدیث، تفسیر، فقہ، اُصول، آداب، زھد اور عقائد جیسے دینی علوم کی تدوین وتشریح اور حقائق کی وضاحت اور باطل خیالات کی تردید سے شروع ہوئی۔ اس کے ساتھ دوسرے علوم بھی تھے جو ان علوم کے خدمتگار ہیں جیسے لغت، آداب اور تاریخ وغیرہ۔ اسی لیے ان علوم کو معاون ومددگار علوم کا نام دیا گیا ہے کیوں کہ یہ وسائل ہیں اور دینی علوم مقاصد ہیں۔

اس کے بعد اس فکری میل جول کے نتیجے میں کچھ نئے علوم سامنے آئے جن کا آغاز دیگر قوموں کے علمی وادبی ورثے کو ترجمہ کرنے اور مسلمانوں کے مختلف ثقافتوں کی حامل دیگر قوموں سے میل ملاقات سے ہوا۔ پھر فلسفہ، طب، فلکیات، انجینئرنگ، کیمیا، طبیعیات، نباتیات، جغرافیہ، تصوف اور تربیت وغیرہ پر کتب وجود میں آئیں۔ مسلمانوں نے ان قوموں کے علوم سے جو کچھ نقل کیا اسے ازسرِ نو سنوارا، اس میں اضافے کیے اور

انھیں نئے علوم بنا دیا۔ مسلمانوں نے ایسے حقائق بھی دریافت کیے جو غیر معلوم تھے۔ انھوں نے مروجہ خیالات، اوہام اور تصورات کی بھی تصحیح کی۔ انھوں نے یہ سارا کام کتب میں مدون کر دیا جو ایک بہت بڑی ضخامت کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کام میں انھوں نے اپنی عمریں کھپا دیں لیکن افسوس! اس ذخیرے کا بیشتر حصہ ان حادثات اور حملوں میں ضائع اور تلف ہو گیا جو مسلمانوں پر تاتاریوں، صلیبیوں اور انگریزوں کی طرف سے کیے گئے۔ بغداد اور اندلس کی تباہی اسی دور کی نشانیاں ہیں۔

مغرب کے نزدیک عہد وسطیٰ (Middle age) جسے وہ ''تاریک دور'' (Dark age) کا نام دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے حوالے سے وہ روشنی اور تہذیبی وسائنسی نشو وارتقا کا دور ہے۔

ان ادوار میں علم کی تدوین اور نشریات کے لیے واحد ذریعہ عربی زبان تھی۔ اندلس اور صقلیہ کی جامعات ہی دنیا میں علم و تعلیم کو پھیلانے کے مراکز تھے۔ پورے یورپ کے گوشوں سے طالب علم ان یونیورسٹیوں میں آ کر اساتذہ کے سامنے دوزانو بیٹھتے اور علم کی روشنی پاتے۔

علم وعرفان کی دنیا میں مشہور ترین نام مسلمان علماء ہی کے ہیں۔ بلکہ یہی وہ اکیلے نام ہیں جن کے بارے میں اہل علم انسٹی ٹیوٹس، کونسلوں اور دیگر علمی حلقوں میں بحث کرتے ہیں۔ مثلاً ابن رشد، الخوارزمی، ابن الہیثم، ابن حیان، الرازی، ابن سینا، الغزالی، البیرونی، الزھراوی، ابن النفیس وغیرھم۔

مسلمانوں کے سائنسی مراجع ہی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بین الاقوامی مراجع بنے رہے اور یہ صورتِ حال صدیوں پر محیط رہی۔ مثلاً ابن سینا کی القانون، رازی کی الحاوی، ابن رشد کی الکلیات یہ سب علم طب (Medical Science) کی کتب ہیں۔ جبکہ الجبرا اور مقابلہ میں خوارزمی کی کتاب اور بصریات میں ابن الہیثم کی کتب مرجع بنی رہیں۔

یہ مسلمان علماء اور مفکرین ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے ارسطو کی تصوراتی قیاسی منطق پر تنقید کی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مغرب کے فلاسفر ابھی اس منطق سے واقف بھی نہیں ہوئے تھے۔ امام ابن تیمیہؒ نے ارسطو کی منطق کے رد میں دو کتب لکھی ہیں اور

ارسطو کی منطق کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جس سے ایک کند ذہن فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور ذہین کو اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

۵- فقہاء نے اختلافِ مسالک کے باوجود شرعی دلائل کی روشنی میں بہت سے ایسے احکام طے کر دیے جن سے علم، اس کے حصول، اس کی تعلیم، اس کی نشوونما اور تسلسل کو قائم رکھنے کی شریعت اسلامیہ میں قدر و قیمت کی رفعت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان احکام میں سے چند ملاحظہ کیجیے:

ا- خوشحال باپ پر طالب علم کا خرچ واجب ہے، خواہ طالب علم تجارت یا کسی پیشہ اور ذریعہ سے اپنا روزگار کما سکتا ہو۔ کیوں کہ کام میں مشغولیت اسے حصولِ علم کے لیے مطلوب فراغت میسر نہیں آنے دے گی۔ لہٰذا اس کا خرچ اس کے باپ کے ذمے اسی طرح واجب ہے جس طرح اس کے چھوٹے بچوں کا خرچ اس کے ذمے واجب ہوتا ہے۔

ب- حصولِ علم کے لیے یکسو ہو جانے والے طالب علم کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے خواہ وہ کمانے کے قابل ہو، لیکن عبادت کے لیے یکسو ہو جانے والے ایسے آدمی کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں جو کمانے کی طاقت رکھتا ہو۔ حدیث ہے:

لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَ لَا لِذِی مِرَّةٍ سَوِيٍّ

"صدقہ لینا نہ دولت مند کے لیے جائز ہے نہ کمانے کے قابل تندرست آدمی کے لیے۔"

طالب علم اور عبادت گزار کے درمیان فرق یہ ہے کہ عبادت گزار کو عبادت کے لیے بالکل سب کچھ چھوڑ رکھنے اور دیگر مشاغل سے عدم تعلق اختیار کرتے ہوئے یکسو ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ اسلام اس طرح کی رہبانیت وصوفیت اور تجرد کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کے برعکس حصولِ علم کے لیے ایسی یکسوئی اور مشاغل سے عدم تعلق کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اس عمل کو احسن انداز میں ادا کیا جا سکے۔ پھر یہ بھی ہے کہ عبادت صرف عبادت گزار کی اپنی ذات کے لیے ہوتی ہے جب کہ طالب علم کا علم اس کے اپنے لیے بھی ہوتا ہے اور معاشرے کے لیے بھی۔

ج۔ علماء اور طلبہ کی کتب کو ان کی اصلی ضروریات شمار کیا جائے گا لہٰذا ان کتب کی قیمت کو موجب زکوٰۃ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے اس کے علاوہ نصاب کی ضرورت ہوگی۔

چونکہ کتب کو عالم یا طالب علم کی بنیادی ضروریات میں شمار کیا جاتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس مقصد کے لیے عام خرچ سے یا زکوٰۃ کی رقم سے ان کو حصہ بہم پہنچے۔ یہ بھی ایسی ہی صورت ہے جیسے کسی شخص کو مکان، سامان، لباس وغیرہ اور کسی پیشہ ور کو اپنے آلات خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جا سکتی ہے۔ اور ہمارے علماء نے علمی کتب کو حوائج اصلیہ [اصلی ضروریات] اس لیے شمار کیا ہے کہ ان کے نزدیک اصلی حاجت وہ ہے جو انسان کو حقیقی یا مجازی طور پر ہلاکت سے بچا لے اور جہالت ان کے نزدیک ہلاکت ہے یعنی ادبی موت ہے۔ اس لیے انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی اہل علم کے پاس اگر اتنا مال نہ ہو کہ وہ بیت اللہ تک سفر اور وہاں اقامت کر سکے تو وہ فریضۂ حج کی ادائیگی کی خاطر اپنی ضرورت کی کتب کو فروخت نہیں کر سکتا۔ جس طرح کوئی مقروض یا تاوان زدہ شخص اگر اہل علم میں سے ہو تو اس کی کتب قرق یا ضبط سے مستثنیٰ ہوتی ہیں۔

د۔ اسی طرح فقہاء نے زکوٰۃ کے ضمن میں یہ حکم بھی بیان کیا ہے کہ زکوٰۃ کو ایک صوبے (علاقے) سے دوسرے صوبے (علاقے) میں منتقل نہیں کیا جا سکتا مگر مخصوص حالات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی منتقلی جائز ہے مثلاً کسی دوسرے علاقے میں موجود محتاج طالب علم تک پہنچانا مقصود ہو۔

اسی طرح بعض علماء نے طالب علم کو ''فی سبیل اللہ'' میں داخل شمار کیا ہے اور یہ اس اعتبار سے ہے کہ حصول علم جہاد کی ایک قسم ہے اور جہاد ''فی سبیل اللہ'' میں شامل ہے اور ''فی سبیل اللہ'' زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف ہے۔

---○○---

خاتمۂ کتاب

گزشتہ صفحات کے مطالعہ نے بہت سے اہم حقائق ہمارے سامنے واضح کیے ہیں جن میں سے چند نمایاں حسب ذیل ہیں:

۱- سنت محمدیہ امت اسلامیہ کے لیے ابلتا ہوا سرچشمہ اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ اس کی عطا دائمی اور فیض رسانی نئی سے نئی ہے۔ اس کا یہ کمال محض تشریعی [قانونی] پہلو ہی سے نہیں ہے [جیسا کہ ہمیشہ کہا جاتا ہے کہ سنت قانون سازی کا دوسرا مصدر ہے] بلکہ فکر کی رہنمائی کرنے، کردار کو ایک سمت دینے اور انسانی تمدن کو مضبوط بنیادوں اور ستونوں پر تعمیر کرنے کا بھی مصدر ہے۔

اسی لیے سنت میں خرابیاں تلاش کرنے اور شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش محض سنت کو پس پشت ڈالنے کی کوشش نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلانا اور حقیقی اسلامی زندگی کی ٹھوس بنیادوں کو منہدم کرنا ہے جس کا انجام بالآخر خود قرآن کے انکار پر آ کر ہوتا ہے۔ کیوں کہ قرآن کو سنت کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا اس لیے کہ سنت ہی کتاب اللہ کا نظری اور عملی بیان اور توضیح وتشریح ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو یہی ذمہ داری سونپی تھی کہ آپؐ لوگوں کے سامنے اس چیز کی وضاحت وتبیین فرمائیں جو اُن کی طرف اللہ کی جانب سے نازل کی جاتی ہے۔ لہٰذا سنت کی ہر خدمت اور اس کی حقیقت کو نکھارنے سنوارنے کی ہر کوشش بلاشبہ اپنے انجام کے لحاظ سے قرآن، اسلام اور امت اسلامیہ کی خدمت ہے۔

۲- علم قرآن وسنت کی نظر میں نہ دین کا حریف ہے نہ ایمان کی ضد ہے۔ جس طرح دیگر قوموں اور معاشروں کو علم اور دین کے ایک دوسرے کی ضد ہونے کی بنا پر ان کے درمیان

کشمکش اور تصادم کا سامنا کرنا پڑا۔ امت اسلامیہ اپنے دین وعلم کے اعتبار سے ایسی کسی بھی کشمکش سے نا آشنا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ دین ہمارے نزدیک علم ہے اور علم ہمارے نزدیک دین ہے اور علم ہماری تہذیب میں ایمان کا رہنما، عمل کا اِمام اور دنیا وآخرت میں فوز وسعادت کا دروازہ ہے۔ اسی لیے ہمارے علمائے کبار نے کہا ہے کہ شریعت اور حکمت کے درمیان گہرا تعلق ہے اور صحیح منقول صریح معقول کے موافق ومطابق ہوتی ہے۔

۳- اسلام تجرباتی علم پر کوئی قدغن نہیں لگاتا بلکہ اس کا احترام کرتا اور اس کی طرف بلاتا ہے۔ اس کے نشو وارتقا کے لیے بہترین ذہنی وفکری اور قلبی ونفسی فضا تیار کرتا ہے۔ مثلاً اسلام ایسی معروضی سائنسی ذہنیت تشکیل دیتا ہے جو محض وہم وگمان اور خواہشات وتقلید کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے سے انکار کرے۔ اسلام تعلیم کو عام کرنے، لکھنا پڑھنا سیکھنے پر زور دیتا ہے اور ضرورت کے وقت دوسروں کی زبانیں سیکھنے، مستقبل کے امکانات کا سامنا کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے اور اعداد وشمار کے اسلوب کو استعمال کرنے پر ابھارتا ہے۔ اسلام دنیاوی امور میں تجرباتی منطق برقرار رکھتا ہے۔ ہر فن کے ماہرین پر اعتماد کرنے اور نافع علم کے اصحابِ فضل سے استفادے کی ترغیب دیتا ہے۔ کائنات میں جاری اللہ کے قوانین کا احترام کرتا اور اوہام وخرافات اور کہانت وعرافت وغیرہ پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ اسلام کا یہ تمام تر اہتمام عقل کو سوچنے، اہل علم کو تحقیق کرنے اور علم کو نشو ونما پانے اور پھیلنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

۴- اسلام [اگر صرف سنت کی روشنی میں ہی دیکھیں تو بھی] علم اور اخلاق کے درمیان فصل قائم نہیں کرتا۔ اگرچہ علم بذاتِ خود ایک افضل شے ہے تاہم اس کا مقصود ومطلوب اخلاق ہی ہے اور علما تو پوری زندگی کو معارف واخلاق کے ذریعے روشن کیے رکھتے ہیں۔ اسی لیے تو سنت نے علم کی اخلاقیات اور علماء کی جوابدہی کو خصوصی طور پر توجہ کا مرکز بنایا ہے تاکہ امت اسلامیہ کے علما اُن علمائے بنی اسرائیل کی طرح نہ ہو جائیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود اس سے دور رہتے تھے حالانکہ وہ کتاب بھی پڑھتے تھے۔

۵- علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور یہاں فرض علم سے مراد دین کے علم اور دنیا کے علم کی وہ کم سے کم حد ہے جو ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔ دنیاوی علم کی کم سے کم

حد وہ ہے جو اس ناخواندگی کو ختم کر سکے جس نے اسلامی دنیا کے اندر ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور امت مسلمہ کے ماتھے پر کلنک کا نشان بن کر رہ گئی ہے۔ اس ناخواندگی کا خاتمہ واجب ہے۔ مسلمان علماء کو چاہیے کہ وہ اس منکر سے نجات اور خلاصی پانے کو شرعاً واجب ہونے کا اعلان کریں۔ اس مرض نے امت مسلمہ کو تہذیب یافتہ قوموں کے مقابلے میں پسماندہ بنا رکھا ہے اور امت مسلمہ اس وقت تک اپنی ذمہ داری کو پوری کر سکتی ہے نہ اپنے وجود اور منصب قیادت کا ثبوت پیش کر سکتی ہے جب تک اس کا ہر فرد زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہو جائے اور جس چیز کے بغیر کوئی واجب پورا نہ ہوتا ہو وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے۔

۶- اسلام نے [سنت کی فراہم کردہ تفصیلات کی روشنی میں] تعلیم و تعلّم کی بنیادیں اور اساسیات وضع کر دی ہیں۔ اسلام کو اس میدان میں جو سبقت حاصل ہے پورا زمانہ اور اس کے منکرین بھی اس کی ان تربیتی بنیادوں پر فخر کریں تو کم ہے۔ مثلاً: حصولِ علم میں تسلسل یا مہد سے لحد تک حصولِ علم، کسی ایک میں تخصص حاصل کرنا، معلّم کی عزت و توقیر کرنا، طالب علم کے ساتھ نرمی و شفقت کرنا، تعلیم و تدریس میں تدریج کے اُصول کو ملحوظ رکھنا، طلبہ کے انفرادی فرق کا لحاظ رکھنا، غلطی کرنے والے پر توجہ دینا، درست جواب دینے والے کی حوصلہ افزائی کرنا اور معاون تعلیمی وسائل و ذرائع سے کام لینا، وغیرہ وغیرہ۔

۷- یہ توجیہات اور تعلیمات مسلم فرد اور مسلم معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں اپنے نتائج دکھا چکی ہیں۔ ان کے زیر سایہ اس ممتاز مسلم ذہن نے پرورش پائی جس نے علم و ایمان کو یکجا کر دیا۔ وہ ذہن عالم الغیب ذات پر ایمان رکھتا تھا اور اسی کے علم کے ذریعے عالَم الشہادۃ کو تسخیر کرتا تھا۔ اس جدوجہد سے دنیاوی علوم کو اسی طرح فروغ ملا جس طرح دینی علوم کو شہرہ ملا تھا۔ اس دوران علمی بیداری کی ایسی فضا قائم ہوئی کہ پوری دنیا صدیوں اسی فضا میں زانوئے تلمذ تہہ کرتی رہی۔ اس علمی بیداری اور تہذیب نے ایسے آثار چھوڑے ہیں کہ ان میں سے بعض چیزیں آج تک مخفی ہیں اور یہ کسی ایسے آدمی کی منتظر ہیں جو ان کو پردۂ اخفا سے نکال باہر لائے اور اُن پر لگے زنگ کو دھو ڈالے!!

یہی ہمارا دین ہے اور یہی ہمارا علم ہے اور اس اللہ کا شکر ہے جس نے اس کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی اور اگر اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی نہ فرماتا تو ہم از خود رہنمائی نہیں پا سکتے تھے!!

---○○---

مترجم کی دیگر مطبوعات

اربعین امام نووی [امام کی اپنی تشریح کے ساتھ اُردو میں پہلی بار]

اربعینِ نووی ساتویں صدی ہجری کے بلند پایہ عابد و زاہد اور محدث و فقیہہ امام یحییٰ بن شرف نووی کی مرتب کردہ چالیس احادیثِ نبویہ کا مختصر مجموعہ ہے۔ درجنوں اربعین میں امام نووی کی اربعین کو جو قبولِ عام اور شہرتِ دوام حاصل ہوئی وہ ان سے پہلے کسی مرتب کے حصے میں آئی، نہ ان کے بعد کوئی عالم اس شرف کو پا سکا۔

اربعین نووی میں شامل احادیث کی جامعیت و ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ وہ کم و بیش ان تمام مسائل کا احاطہ کرتی ہیں جو ہر مسلمان کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ چالیس احادیث کا یہ مختصر مجموعہ اپنے اندر علم و عرفان اور رشد و ہدایت کا بحرِ بیکراں سموئے ہوئے ہے۔

علمائے کرام نے اربعین کی اہمیت کے پیشِ نظر اپنے اپنے انداز میں اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ یہ اس شرح ترجمہ کیا ہے جو خود امام علیہ الرحمہ کی طرف منسوب ہے۔

اس کتاب کے ترجمے، تہذیب اور اضافات و عنوان بندی کا کام ایک نئے انداز میں کیا گیا ہے۔

۱- حدیث کے متن کو جملوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے تا کہ ترجمہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

۲- ''تفہیم الفاظ'' کے عنوان کے تحت مشکل الفاظ کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

۳- ''شرح الحدیث'' کے زیرِ عنوان حدیث کی تشریح و تفہیم اور وضاحت و تبیین کی گئی ہے۔
یہاں عبارت کو مسلسل رکھنے کے بجائے ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۴- ایک حدیث کے مضمون کی مزید وضاحت یا اس کے کسی ایک پہلو کی وضاحت کرنے والی دوسری احادیث کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے تا کہ مذکورہ حدیث کی مکمل تشریح سامنے آ سکے۔

۵- ''فقہ الحدیث'' کے عنوان سے حدیث سے اخذ ہونے والے اہم مسائل اور نکات درج کیے گئے ہیں۔

۶- اربعین کے متن میں شامل احادیث کی اصطلاحات بھی دی گئی ہیں تاکہ ہر حدیث کے آخر میں آنے والی اصطلاح کا مفہوم سمجھا جاسکے۔

اربعین نووی کے مضامین کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے طلبا، ساجد کے خطبا اور قرآن وحدیث کے مدرسین کے علاوہ عام آدمی بھی اس سے استفادہ کریں۔

صفحات (بڑا سائز): ۴۰۰ قیمت (مجلد): ۴۰۰ روپے بہترین کاغذ، عمدہ طباعت

ناشر: دار التذکیر، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

وشِ صحابہ رضی اللہ عنہم

'نقوشِ صحابہ' اُن پاکیزہ انسانوں کی داستانِ زندگی ہے جو قرآنِ مجید کے اولین مخاطب ۔۔ قرآن نے ان کی زندگیوں کو ہدایت کی شاہراہِ مستقیم پر ڈال دیا تھا اور ان کے اندر ایمان کی ، طاقت اور عزم کی ایسی صلابت بھر دی تھی کہ اس طاقت وصلابت نے اسی دور کے انسانوں یرت سے دوچار نہیں کیا بلکہ آج تک جو بھی انسان ان کی زندگیوں کی رُوداد پڑھتا اور سنتا وہ حیران ہو جاتا ہے۔

جس طرح جناب محمد ﷺ کو تمام انبیا میں ایک امتیاز وانفرادیت حاصل ہے اسی طرح ؛ کے صحابہؓ کو بھی پوری اُمت میں ایک اولیت وفوقیت اور رفعت وعظمت حاصل ہے اور طرح رسول اللہ ﷺ کی سیرت ایمان کو تازہ اور دلوں کو صاف کرنے کا ذریعہ ہے اسی طرح ؛ کے صحابہؓ کی زندگیوں کا تذکرہ بھی ایمان کو جلا بخشنے اور جذبوں کو مہمیز دینے کا باعث ہے۔

صحابۂ کرامؓ کے یہ تذکرے کسی قلمکار کی افسانہ نگاری نہیں بلکہ تاریخ انسانی کی لازوال ت اور انمٹ نقوش ہیں۔ یہ آسمان کے نیچے اور زمین کی پشت پر پیش آنے اور دیکھے سنے ، والے حقیقی واقعات ہیں۔ یہ جوشِ عقیدت میں لکھی گئی سوانح عمری نہیں، یہ دنیا کی آنکھوں امنے مکمل ہونے والی ایک حقیقی تحریک ہے۔ اس تحریک کے سبھی افراد بے مثل ہیں، یہ انسانی تاریخ میں صرف ایک ہی بار منظر پر آئی، اس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے نہ

۵- ''فقہ الحدیث'' کے عنوان سے حدیث سے اخذ ہونے والے اہم مسائل اور نکات درج کیے گئے ہیں۔

۶- اربعین کے متن میں شامل احادیث کی اصطلاحات بھی دی گئی ہیں تاکہ ہر حدیث کے آخر میں آنے والی اصطلاح کا مفہوم سمجھا جا سکے۔

اربعین نووی کے مضامین کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے طلبا، مساجد کے خطبا اور قرآن وحدیث کے مدرسین کے علاوہ عام آدمی بھی اس سے استفادہ کریں۔

صفحات (بڑا سائز): ۴۰۰ قیمت (مجلد): ۴۰۰ روپے بہترین کاغذ۔عمدہ طباعت

ناشر: دار التذکیر، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

نقوشِ صحابہ رضی اللہ عنہم

'نقوشِ صحابہ' اُن پاکیزہ انسانوں کی داستانِ زندگی ہے جو قرآنِ مجید کے اولین مخاطب تھے۔ قرآن نے ان کی زندگیوں کو ہدایت کی شاہراہِ مستقیم پر ڈال دیا تھا اور ان کے اندر ایمان کی ایسی طاقت اور عزم کی ایسی صلابت بھر دی تھی کہ اس طاقت وصلابت نے اسی دور کے انسانوں کو حیرت سے دوچار نہیں کیا بلکہ آج تک جو بھی انسان ان کی زندگیوں کی رُوداد پڑھتا اور سنتا ہے وہ حیران ہو جاتا ہے۔

جس طرح جنابِ محمد ﷺ کو تمام انبیا میں ایک امتیاز وانفرادیت حاصل ہے اسی طرح آپؐ کے صحابہؓ کو بھی پوری اُمت میں ایک اولیت وفوقیت اور رفعت وعظمت حاصل ہے اور جس طرح رسول اللہ ﷺ کی سیرت ایمان کو تازہ اور دلوں کو صاف کرنے کا ذریعہ ہے اسی طرح آپؐ کے صحابہؓ کی زندگیوں کا تذکرہ بھی ایمان کو جلا بخشنے اور جذبوں کو مہمیز دینے کا باعث ہے۔

صحابۂ کرامؓ کے یہ تذکرے کسی قلمکار کی افسانہ نگاری نہیں بلکہ تاریخ انسانی کی لازوال حقیقت اور انمٹ نقوش ہیں۔ یہ آسمان کے نیچے اور زمین کی پشت پر پیش آنے اور دیکھے سنے جانے والے حقیقی واقعات ہیں۔ یہ جوشِ عقیدت میں لکھی گئی سوانح عمری نہیں، یہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے مکمل ہونے والی ایک حقیقی تحریک ہے۔ اس تحریک کے سبھی افراد بے مثل ہیں، یہ تحریک انسانی تاریخ میں صرف ایک ہی بار منظر پر آئی، اس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے نہ

اس کتاب میں ان پاکیزہ زندگیوں کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔

صفحات (بڑا سائز): ۶۰۰ قیمت (مجلد): ۴۰۰ روپے

ناشر: دار التذکیر، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

تذکرۂ تابعینؒ

اس کتاب میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو قبولِ اسلام میں تو سبقت و اولیت کا اعزاز نہ پا سکے، نہ صحبت رسول ﷺ سے فیض یاب ہو سکے البتہ سابقون الاولون اور دوسرے صحابہؓ کی صحبت میں بیٹھے، ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے۔ ان کی سیرت کو اپنایا اور ان کے علم قرآن و فہم سنت سے خوب سیراب ہوئے۔ یہ لوگ اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر یوں چلے کہ ان اساتذہ سے داد پائی۔ ان کی موجودگی میں افتاء و ارشاد کی مسند پر جلوہ آرا ہوئے اور کتاب و سنت کی تشریح کی گراں بار ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔ تاریخ نے اس طبقے کے ان ہدایت یافتگان کو تابعی کا نام دیا ہے۔ مکہ و مدینہ اور بصرہ و شام کے علاوہ دیگر کئی شہر علم و عرفان اور عبادت و ریاضت کی ان بے مثال شمعوں سے جگمگاتے رہے۔

آپ کو اس تذکرہ میں علم کے بحر زخار، کتاب وسنت کے علمبردار، عبادت و ریاضت کے دھنی، فہم و فراست کے غنی، علم و عمل کے مرقعوں، زہد و تقویٰ کے پتلوں، دن کے شہسواروں اور رات کے زندہ داروں کے قابل رشک، روح افزا اور ایمان افروز واقعات پڑھنے کو ملیں گے۔

اُمت مسلمہ کے اُفق کے ان درخشندہ ستاروں کو کن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا جائے۔ یہ تسلیم و رضا کے پیکر، صبر و تحمل کے کوہ گراں، سلطنت علم و فضل کے تاجور، دن کے شہسوار اور رات کے زندہ دار، عبادت کے پیاسے، محراب و منبر کی رونق، علمی حلقوں کی زینت اور قرآن و سنت کے دلدادہ ان نفوس قدسیہ کی خوش نصیبی قرآن نے بھی بیان کی ہے اور خود زبانِ رسالت نے بھی ان کی عظمت کا پھریرا لہرایا ہے۔

صفحات: ۳۴۰ قیمت (مجلد): ۱۵۰ روپے

ناشر: منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور، فون: 5434909

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی [پ: ۹ ستمبر ۱۹۲۶ء، مصر] عالمِ اسلام کے نمایاں علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی علمی وسعتِ نظری اور فقیہانہ و مجتہدانہ اسلوب بیان نے علمی دنیا کو گراں قدر خیالات سے نوازا ہے۔ انھوں نے کم و بیش تمام شعبہ ہائے زندگی پر اظہارِ خیال کیا اور فقہی اختلافات کو اعتدال کے دائرے میں لانے کی کوشش کی۔ انھوں نے سنتِ رسول ﷺ کی روشنی میں بہت اہم موضوعات پر لکھا اور مختصر الفاظ میں موضوع کا حق ادا کیا۔ ''رسول اکرم ﷺ اور تعلیم'' اُن کے اسی اسلوب تحریر کی آئینہ دار ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے قرآن حکیم سے استدلال کو بنیاد نہیں بنایا صرف سنت کو ماخذ بنا کر تعلیم کی اقدار و مبادیات کو واضح کیا ہے۔

علامہ قرضاوی نے ۱۹۵۳ء میں جامعہ ازہر کے کلیہ اصول دین سے بی۔اے اور ۱۹۵۴ء میں تدریس کی سند حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹریٹ کی۔ پھر دعوت و تحریک اور درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ سو سے زاید کتب کے مصنف ہیں۔ انھیں شاہ فیصل ایوارڈ برائے خدماتِ اسلامی، اسلامی بنک برائے معاشی ترقی ایوارڈ، سلطان حسن البلقیہ [شاہ برونائی] ایوارڈ برائے فقہ اسلامی دیے گئے ہیں۔

دار التذکیر
E-mail: info@dar-ut-tazkeer.com
website: dar-ut-tazkeer.com